

عنایت اللہ

# بی آر بی بہتی رہے گی

جنگ ستمبر 1965ء کے پس منظر میں لکھا ہوا ایک شاہکار ناول



مکتبہ داستان



# بی آربی بہتے رہے گی

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ کی ولولہ انگیز کہانی

عنایت اللہ

اسکین بدست محمد طارق اقبال  
برائے  
ون اردو ڈاٹ کام میبرز

علم و فن پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور۔

فون: 7352332، 7232336 فیکس: 7223584

www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com





## جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	.....	بی آر بی بہتی رہے گی
مصنف	.....	عنایت اللہ
ناشر	.....	گل فراز احمد
مطبع	.....	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
سن اشاعت	.....	زائدہ نوید پرنٹرز، لاہور
قیمت	.....	مارچ 2009ء
	.....	170 روپے

☆..... ملنے کے پتے.....☆

علم و عرفان پبلشرز

40۔ اردو بازار، الحمد مارکیٹ، لاہور

فون: 7232336-7352332

سیونٹھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 7223584، موبائل 4125230-0300

حکایت پبلشرز

26۔ پیالہ گراؤنڈ لنک میٹرو روڈ لاہور۔ 7356541-7321896

ایتقہ اور صبا کے نام

## تعارف

شیخ سعدی نے اپنی ایک حکایت میں بیان کیا ہے کہ ایک حمام میں میرے محبوب نے مجھے ایسی مٹی دی جس میں سے خوشبو نکل رہی تھی۔ میں نے مٹی سے پوچھا — ”اے مٹی! تجھ میں یہ خوشبو کہاں سے آگئی؟“ — وہ بولی — ”میں چند روز پھول کی صحبت میں رہی، اس کی خوشبو مجھ میں سما گئی ہے، وگرنہ من ہاں خاکم کہ ہستم یا“

مٹی، مٹی ہی ہے لیکن اس میں جب کسی پھول کی خوشبو سما جاتی ہے تو اس کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ ہم اسے بڑی محبت سے ہاتھوں میں اٹھا لیتے ہیں اور اس کی قدر و منزلت کرتے ہیں — اور پانی، پانی ہی ہے لیکن جو پانی دریا تہذبات میں بہتا ہے وہ اس لحاظ سے قابل احترام ہے کہ اس کے کناروں پر کربلا کے میدان میں امام حسینؑ نے یزید یوں کے ظلم و ستم کے خلاف سینہ سپر ہو کر جنگ لڑی تھی اور اپنا ہوش و حواس اس کے پانی میں شامل کر دیا تھا — اور لاہور کی نہر بی آربی اس اعتبار سے مقدس ہو گئی ہے کہ اس کے دامن کو شہیدانِ پاک کے خونِ ناب نے لالہ زار بنا دیا تھا۔

بی آربی کی نہایت دلچسپ، بصیرت افروز اور جوش آفریں کہانی لکھنے کا شرف عنایت اللہ کے حصے میں آیا ہے۔ کہانی پڑھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ مقدس کام عنایت اللہ ہی خوش اسلوبی سے کر سکتا تھا۔ بی آربی پہلے بھی بتی تھی لیکن چھ ستمبر ۱۹۹۵ء کی سحر طلوع ہوئی تو بی آربی کی ہر لہر پر کروڑوں پاکستانیوں کی عقیدتیں بچھاؤ ہو رہی تھیں۔ بی آربی حرات و بسالت کی علامت بن گئی تھی۔ یہ صرف نہر نہیں تھی بلکہ ایک دلیر سپاہی تھی جس نے پانی کی دیواریں کھڑی کر کے عزیز وطن کی حفاظت کی تھی۔ بی آربی نے غازیانِ پاک کے دوش بدوش ایک مجاہد کا کردار ادا کیا تھا۔ پاک فوج کے جانبازوں اور پاک فضائیہ کے شاہبازوں کے لیے بی آربی مالِ بہن کی مانگ بن گئی تھی جس کی آبرو پر انہوں نے جانیں بچھا کر دیں۔

آج لوگ جب اس نہر کے کنارے جاتے ہیں تو ان کے سر بے اختیار فطرۂ عقیدت سے جھک جاتے ہیں۔ بی آربی کے پلوں سے گزرنے والوں کے قدم خود ہی رک جاتے ہیں اور وہ اس نہر کی آبرو پر شہید ہو جانے والوں کو آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیے بغیر آگے چل ہی نہیں سکتے۔

بی آربی کی روانی کمالِ تمکنت سے غازیوں اور شہیدوں کے گیت گاتی چلی جا رہی ہے۔ عقیدت مندوں کے دل سے فاتحانہ صدا اٹھتی ہے۔ ”بی آربی بہتی رہے گی.... بی آربی بہتی رہے گی۔“

عنایت اللہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے دو مرکزی کردار لے کر اس پوری داستان کو لکھ دیا ہے جس کا تعلق اس نہر سے ہے۔ اس نہر نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا اور جو کچھ کیا وہ مکمل افسانہ ہے۔ ایک بہادر، جرات مند اور وطن پرست قوم کا افسانہ جس کی جہانیاں تفصیلات، منظر اور پس منظر دیکھتے تو یہ افسانہ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔

بہرہ ایک بے کس، بے آسرا اور یتیم لڑکی ہے جس کا اس بھری دنیا میں کوئی غمخوار ہے نہ راز دال۔ وہ سینے میں بے کسی کی گھٹن لیے در در ٹھوکریں کھاتی ہے۔ ہر جگہ دھتکارا جاتی ہے۔ وہ پیار مانگتی ہے مگر ہوس الوداع کا

یہ کتاب ماہنامہ ”حکایت“ کی پیشکش ہے

## آپ بھی ماہنامہ ”حکایت“ پڑھیں

حکایت کا ہر شمارہ مستقل اہمیت کی ایک کتاب ہوتا ہے۔

تازہ ترین ملکی و بین الاقوامی حالات و واقعات  
کا غیر جانبدارانہ تجزیہ اور بے لاگ تبصرہ

مستقل سلسلے

تاریخی ناول ● سنسنی خیز سلسلہ وار ناول ● طب و صحت ● نفسیات ● علمی و ادبی اور تحقیقی مضامین ● طنز و مزاح ● دینی و روحانی مضامین ● طالب علموں کی سرگرمیاں ● اسلامیات ● خواتین کے لیے ● معاشرے کی سچی کہانیاں ● دلوں کو گرہ مادینے والی داستانیں ● آپ کے سر جھکا دینے والی شرمناک وارداتیں ● چار دیواری کے ڈھکے چھپے گوشوں سے ہمارے آپ کے، سب کے گناہوں قصے ● پاک بھارت جنگوں اور کشمیر میں مسلح جدوجہد کی ولولہ انگیز کہانیاں

..... اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہیں!

قیمت فی شمارہ سالانہ اندون ملک = 500/-  
45/- روپے چنندہ بیرونی ممالک = 5000/-

ماہنامہ حکایت خود بھی پڑھیں دوستوں کو بھی پڑھائیں۔

موبائل نمبر: 0321-4616416

e.mail: waqas shahid17@yahoo.com

ماہنامہ ”حکایت“ 26- پٹیالہ گراؤنڈ لنک میٹرو روڈ لاہور۔

فون: 7321898-7356541



اُسے جوانی کی سرستیوں کا پیغام دیتی ہیں۔ اُسے ماں کی محبت نہیں مل سکتی۔ باپ کی شفقت سے بھی وہ محروم ہے۔ یہاں تک کہ وزیر آباد کے ایک گھرانے میں پہنچ جاتی ہے جہاں نوجوان اقبال نے دوسرے ہی روز فلمی مکالموں کی زبان میں اُس پر جن جوانی کے سبھی راز فاش کر دیئے اور اُسے دو روپے دے کر غلاموں میں بٹھکتا چھوڑ گیا۔

اقبال کے ساتھ ہجرہ نے کچھ امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ بٹھکا جوا ایک بے کس انسان جانے کس کس سے امیدیں وابستہ کر کے نکلوں کے سہارے ڈھونڈتا رہتا ہے، مگر وہ بٹھکتا ہی رہتا ہے، ڈوبتا ہے اور ڈوب ڈوب کر ابھرتا ہے۔ ہجرہ اندھیری رات کی مسافر تھی، صبح کی روشنی کا دور دور تک نشان نہ ملتا تھا مگر اُس کا ضمیر اندھیروں کے سمندر میں ڈوب جانے پر تیار نہ تھا چنانچہ اُس کی کمزوری کا احساس شدت اختیار کر کے ایک مسلسل ذہنی کش مکش بن گیا۔ اُس کی بھنگی اور دھتکاری ہوئی ذات میں نفسیاتی جنگ جاری تھی کہ چھ ستمبر کی صبح بھارت کی توپوں اور طیاروں نے پاکستان کو بیدار کر دیا۔

اقبال جس کی ذہنیت فلمی کانوں اور فلمی ماحول کی پروردہ تھی، محض اتفاق سے لیفٹیننٹ کی حیثیت سے محاذ پر جا پہنچا۔ اُس کا لیفٹیننٹ بن جانا اور بھارت کا حملہ دو مختلف واقعات تھے جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ تھا۔ ہجرہ محبت، پیار اور شفقت کی تلاش میں کانٹوں سے اپنے سینے کو زخمی کرتی رہی۔ اُس نے پھول دیکھ کر ہاتھ بڑھایا تو کانٹوں نے لپک کر اسے لہو لہان کر دیا۔ افضال کی صورت میں اُسے سچی محبت کا پھول کھلتا نظر آیا لیکن افضال نہ صرف ہجرہ کے لیے زہر ملا کاٹنا ثابت ہوا بلکہ وہ سارے پاکستان کے لیے مارا آستین نکلا۔ ہجرہ کی روح کو ایک اور دھچکہ لگا۔ اُس کے سینے کی خلفشار طوفان بن گئی۔

وقت گزرتا گیا، منزلیں آتی رہیں اور گردِ راہ بنتی رہیں، یہاں تک کہ وہی اقبال جس کے شرمناک ارادوں نے ہجرہ کی حیات کو بُری طرح مجروح کر دیا تھا اور جسے ہجرہ نے ایک بار بدعادی تھی کہ ”خدا کرے تیری آنکھوں کے ڈھیلے جل جائیں اور تو ٹھوکریں کھاتا پھرے“ بی آر بی کے کنارے اس کے لیے اپنا عزیز ترین ساتھی بنا اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ ان کے سامنے بی آر بی بہرہی تھی مگر اقبال اب بی آر بی کی روانی کو دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ اسی نہر کے کنارے وطن کے دفاع میں لڑتا ہمیشہ کے لیے اندھا ہو چکا تھا اُس نے آنکھوں کا نور پاکستان پر قربان کر دیا تھا۔ ہجرہ اُسے کہہ رہی تھی۔ ”اقبال جی ہمیری آنکھیں بے لوث، تم وہ محاذ تو دیکھ

نہیں سوئی ہوئی نظر آتی ہے۔ پھر بچی طوفان کے تھپیڑوں میں تن تنہا انیس بیس برس کی جواں سال لڑکی بن جاتی ہے طوفان اور تند ہو جاتا ہے۔

مصنّف قدم بہ قدم لڑکی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اُس نے رابر ویا راہنما کا کردار ادا نہیں کیا۔ اُس نے ہجرہ کو پوری آزادی دی اور اُس کی نفسیاتی الجھنوں کے عین مطابق اُسے اپنی راہ چلنے دیا ہے۔ مصنّف اس کے قدرتی پن اور اصلی ہئیت کو بلا مقصد مجروح نہیں ہونے دیتا۔

اس فنی خوبی اور نفسیاتی تجزیے کے ساتھ ساتھ جب مصنّف قاری کو ایک نثر رسیل لہجے محاذ پر لے جاتا ہے تو قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ جنگ کا عینی شاہد ہے یا وہ جنگ کی مکمل فلم دیکھ رہا ہے۔ ڈوئیزوں کے تصادم، بریگیڈوں کی ٹکڑ، کمپنیوں اور پلاٹونوں کی مورچہ بندیاں، بھارت کی جنگی قوت، جالندھر میں انڈین آرکے کے انشلی جس کا ہیڈ کوارٹر، بھارتی جاسوسوں کی ہونک سرگرمیاں، غازیوں کے کارنامے، شہریوں کی قیاباں غرض جنگ کا وہ کون سا گوشہ ہے جس پر غنایت اللہ کی نظر نہیں گئی اور جب ایمونیشن سے لدی ہوئی مال گاڑی راولپنڈی سے محاذ کی طرف روانہ ہوتی ہے اور بھارتی جاسوس وزیر آباد کے قریب اس گاڑی کی راہ میں بارود (ڈائنامیٹ) رکھ دیتے ہیں تو قاری پڑھتے پڑھتے بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔ ”یا خدا! اس گاڑی کو خیریت سے لاہور پہنچا دینا۔ پاکستان کی آبرو کا انحصار اسی گاڑی پر ہے۔“ لیکن پاکستان کی قسمت، اُس رات، بھارت کے جاسوسوں کے ہاتھ میں تھی۔

صوبے دار اکبر علی کا کردار اور بھارت کی ایک حمین عجل جواں سال جاسوسہ کا کردار غنایت اللہ کے فن کا ایک اور کمال ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر قاری کو کئی دھچکے لگتے ہیں لیکن مصنّف پتہ نہیں چلنے دیتا کہ کہانی کا رخ کس طرف ہے۔ غنایت اللہ بیک وقت داستان کو بھی ہے اور ماہر جنگی دفاع نگار بھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ فوجی نقطہ نگاہ سے جس قدر صحیح اور جذباتی لحاظ سے جس قدر دلولہ انگیز دفاع نگاری غنایت اللہ نے کی ہے کوئی نہیں کر سکا۔

غنایت اللہ کی تحریر میں قابل تحسین تسلسل، پُر لطف روانی، جزئیات گیری اور تفصیلات پر مکمل گرفت ہے۔ یہ داستان سنانے میں مصنّف کئی مقامات پر جذباتی ہو سکتا تھا لیکن اس نے ہر جگہ فن اور حقیقت نگاری کی خاطر ماہرانہ ضبط سے کام لیا ہے اور توازن کو چابک دستی سے قائم رکھا ہے۔ اُس نے اپنی تمام تر فن کارانہ صلاحیتوں سے کام لے کر بڑی درد انگیز اور بڑی ہی دلچسپ کہانی لکھی ہے۔ اس کے قلم کا کمال یہ ہے کہ اُس نے اردو ادب میں پہلی بار ایک نہر کو ہیرو کا کردار عطا کیا ہے۔

غنایت اللہ نے بی آر بی کی کہانی لکھی ہے۔ اُس نہر کی جواں لاہور کے قریب ہی نہیں، مغربی پاکستان میں ہی نہیں، پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بہ رہی ہے۔ پاکستان کے ہر قصبے، ہر گاؤں اور ہر گلی میں بہ رہی ہے۔ اس کے سامنے پاکستانیوں کے سر عقیدت سے جھکے جا رہے ہیں۔ بی آر بی بہتی رہے گی۔ انشاء اللہ بہتی رہے گی۔

## پیش لفظ

یہ ناول جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے فوراً بعد لکھا گیا اور اسی عنوان سے چھپا تھا لیکن یہ مکمل کہانی کی تکمیل نہیں تھی۔ اب میں برس بعد یہ ناول اسی عنوان سے پھر پیش کیا جا رہا ہے جس میں وہ واقعات اور کردار بھی شامل کیے گئے ہیں جو تکمیل میں نہیں آئے تھے۔ اس طرح یہ کہانی مکمل ہو گئی ہے۔

”بی آر بی بستی رہے گی ایک بار پھر پیش کرنے کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی گئی ہے کہ جو بچے ستمبر ۶۵ء میں پیدا ہوئے تھے یا اس وقت بہت چھوٹے تھے، وہ اب جوان ہو گئے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو ایک ایک بچے کے باپ بن گئے ہوں گے۔ ان جوانوں تک اپنی تاریخ اور اپنی روایات پہنچانا قومی وقار، استحکام اور پاکستان کی باوقار بقا کے لیے بے حد ضروری ہے۔ دسمبر ۱۹۶۱ء کی جنگ کے متعلق خالی فوجی لالہ لہو پیش کیا جا چکا ہے۔ ”بی آر بی بستی رہے گی“ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے پس منظر میں لکھا ہوا ناول ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بی آر بی بہت مشہور ہوئی تھی بلکہ یہ ہندوستان کی آن اور آبرو کی علامت بن گئی تھی۔ لاہور بکیر کی جنگ اسی نہر کے کنارے لڑی گئی تھی۔ ہمارے جیالے جانبازوں نے اس نہر پر جانیں قربان کر دی تھیں۔

آج کی نسل بی آر بی کے نام سے بھی شاید واقف نہیں ہوگی۔ بی آر بی مخف ہے مہانوالی راوی بیلا نہر کا۔ یہ نہر پاکستانیوں نے اپنی مدد آپ کے اصول پر کھودی تھی۔ کھودنے والوں میں تانگہ بان بھی تھے، پروفیسر بھی، دیہات کے لوگ بھی۔ جوں جوں نہر آگے بڑھتی جاتی تھی، اس علاقے کے لوگ دوڑ دوڑ کر پہنچتے اور نہر کھودتے تھے۔

بی آر بی ہمارے لیے دریائے فرات کی طرح قابل احترام ہے جس کے کناروں پر کمرلا کے میدان میں امام حسینؑ نے یزیدوں کے ظلم و ستم کے خلاف جنگ لڑی اور اپنا خون فرات کے پانی میں شامل کر دیا تھا۔ دسمبر ۱۹۶۱ء کے المیہ یعنی سقوط مشرقی پاکستان کے بعد پاکستان میں یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ ہماری فوج لانے کے قابل ہی نہیں۔ ہمارے دشمن کے ایجنٹوں نے اس غلط تاثر کو ہمارے ذہنوں میں بچھتہ کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈہ کیا کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاک افواج کی شجاعت اور جذبہ حب الوطنی کے جو غیر معمولی مظاہرے مشہور ہوئے تھے وہ محض افسانے تھے۔

یہ بے بنیاد اور تخریبی پروپیگنڈہ پاکستان کے بعض ادیبوں نے تحریری طور پر اور اپنی محفلوں میں تقریریں طور پر بھی کیا۔ ادھر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے پاک بھارت جنگوں کا ذکر ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس طرح دشمن کے پروپیگنڈے نے پورا اثر کیا اور لوگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے جذبے کو بھول گئے۔

ہمیں بے شمار ہیں۔ تھوڑی سی جگہ میں سمجھ نہیں سکتیں۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ملت پاکستان پر انکشاف ہوا تھا کہ ہم میں اسلام کی عسکری روح اور روایت زندہ ہے اور ہم باطل کے چاروں

اسکین بدست محمد طارق اقبال  
برائے  
ون اردو ڈاٹ کام ممبیز





کو۔ یہ ریزہ کر سکتے ہیں۔ ہماری افواج نے جس شجاعت اور شہادت کے اور قوم نے جس اہیاد کے مظاہرے کیے تھے، اسے ہم جذبہ ستمبر کا نام دیتے ہیں۔ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی ہی اہمیت تھی۔ اس جذبے کو زندہ رکھنے کے لیے میں نے یہ ناول لکھا ہے۔ یہ ہے تو ناول لیکن اس کی بنیاد حقیقت پر رکھی گئی ہے۔

۱۹۶۶ء میں ناول لکھا تو میرے بزرگ دوست محترم میرزا ادیب جو ادب کے میدان میں اساتذہ کی فہرست میں آتے ہیں، اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ناول کا تعارف لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اسے سعادت سمجھا۔ میرزا ادیب نے تعارف لکھا جو میں نے ناول میں شامل کیا۔ یہ تعارف اب بھی ناول کے ساتھ ہے۔ یہ ناول پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ اپنی ابھرتی ہوئی نسل اور آنے والی نسلوں کے لیے یہ ناول کس قدر ضروری ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

اقبال کی آنکھوں کے دیتے بچھ گئے ہیں۔ وہ اب کلیوں اور کانٹوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ لیفٹیننٹ اور بوسے بنا سکتا ہے کہ یہ کانٹا اور یہ گلی ہے۔ اس کی پریشانی زندگی کبھی نہ ختم ہونے والی رات بن گئی ہے۔ سیاہ کالی بگپ اندھیری بانجھ رات جس کے لپٹن سے سحر کبھی جنم نہ لے سکے گی۔ اس تیرگی میں اسے ایک نسوانی آواز سنائی دیتی ہے۔ اقبال جی! میری آنکھیں بے لونا! — اور وہ مسکراتا ہے۔

”ماں جاؤ نا اقبال جی! — آواز بار بار سنائی دیتی ہے۔“ ڈاکٹر کہتا ہے کوئی تکلیف نہیں ہوتی.....

بے لونا، اقبال جی! میری آنکھیں! اس آواز میں پیار کا الاؤ دہک رہا ہوتا ہے جو اقبال کی روح کو روشن کر دیتا ہے۔ کبھی تو اس کی ہنسی نکل جاتی ہے اور وہ ہجرہ کو سینے سے لگا لیتا ہے۔

ہجرہ کو کس نے کبھی سینے سے لگا یا تھا؟ اس نے تو اکثر رورو کر خدا سے التجائیں کی تھیں۔ ”یا خدا، مجھے دنیا سے اٹھا لے یا ان تمام مردوں کو اندھا کر دے۔“ اسے جیسے دنیا کے تمام مردوں سے نفرت تھی۔ اسے تو اپنے آپ سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ وہ تو مردوں کی آنکھیں پھوڑ دینے پر ٹٹلی ریتی تھی لیکن اب اقبال کے سینے سے لگ کر اسے وہی سکون اور وہی مسرت محسوس ہوتی تھی جس کے لیے وہ نو دس برس کی عمر سے ترس رہی تھی، مگر اقبال کی اندھی آنکھوں کو دیکھ کر اسے یوں دکھ ہوتا تھا جیسے وہ اس کی بدعا سے اندھا ہو گیا ہو۔

لیفٹیننٹ اقبال کے سینے کی میٹھ میں ہجرہ کو ماں کے سینے کا گداز یاد آ جاتا تھا۔ ماں اسے اسی طرح داری لگی سے سینے سے لگایا کرتی تھی مگر دس برس گزرے ماں کا سینہ برف کا تو وہ بن گیا تھا۔

وہ راولپنڈی کی ایک تنگ بستہ رات کی ہونک وادرات تھی۔ دس گیارہ برس پہلے، اس رات کی تیرگی ٹھٹھ کر کے جم گئی تھی۔ ہجرہ نو دس برس کی بچی تھی۔ راولپنڈی ہولی فمیلی ہسپتال کے قریب ایک بھگی میں ماں کے پاس زمین پر گہری نیند سو رہی تھی۔ تن پر ایک قمیض اور پاجامہ تھا جو اس کی ماں نے اس کے باپ کی پرانی قمیض سے بنایا تھا۔ اس کا باپ پھٹے پرانے کمرے میں لپٹا بستر تھکا رہا تھا۔ ایسے ہی ایک کمرے میں اس کی ماں اپنے

اسکین بکسٹ محمد طارق اقبال  
ون اردو ڈاٹ کام میبرز  
برائے



جاگ اٹھی اور رو پڑی تھی، مگر بچتے دانت اُسے رونے بھی نہ دیتے تھے۔ ماں نے کمر لگا کر کے باجرہ پر ڈال دیا تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان یہی ایک پھنسا ہوا کمر لگا تھا۔ جب موت کے برفانی ہاتھ کمر کو بھی تار تار کرنے لگے تو ماں خود اپنی کچی اور موت کے درمیان آگئی۔ وہ کچی کے اوپر اس طرح لیٹ گئی تھی کہ کچی پر جسم کا وزن بھی نہ پڑے اور اُسے سڑی بھی نہ لگے۔

دوسری صبح جب کونکے اور بجلی سے گرم کیے ہوئے کمروں میں رہنے والے انگیٹھیوں اور بیٹروں کے پاس بیٹھے اخباروں میں ایک سیاسی جماعت کے لیڈر کی تصویر دیکھ رہے تھے جس میں وہ غریبوں میں کمر تقسیم کر رہا تھا تو پاکستان کے دارالحکومت کے سینے پر سر کندوں کی تھر تھر کا پتی ایک جھگی میں باجرہ کی ٹال اور اُس کے باپ کی اٹری ہوئی لاشیں پڑی تھیں اور ننھی مٹی باجرہ دونوں لاشوں کے درمیان بیٹھی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ دونوں سردی سے اکڑ کر مر گئے تھے اور باجرہ ماں کی لاش اور دہرے کمر کے نیچے مرنے سے بچ گئی تھی۔

باجرہ کو اُس کے ماں باپ نے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ مقروضہ کشمیر سے نکالے ہوئے لوگ ہیں باجرہ ابھی ایسی باتیں سمجھنے کے قابل نہیں تھی۔ اُس وقت وہ دودھ پیتی کچی تھی جب اُس کے وطن کی زمین ان پر تنگ ہو گئی تھی۔ کٹا ہوا فکسٹنیر جنت نظیر کو جہنم بنا دیا اور کشمیر کے خون کو کشمیری مسلمانوں کے خون میں ڈل دیا تھا۔ باجرہ کی ایک جوان خالہ اور دو بچے کشمیر میں ہی رہ گئے اور کشمیر کی خاک میں بل کر خاک ہو گئے تھے۔ وہ کشمیر سے بے گھر ہو کر بنگلے تو مرنے تک بے گھر ہی رہے۔ ایک سال سے کشمیر کے ان ہاجرین نے راولپنڈی کے اس میدان میں آکر جھگیوں بنائی تھیں۔ ان لرزتی کاپتی جھگیوں اور مارگلہ کے سر جھکوں کے درمیان کچھ بھی حاصل نہ تھا۔

وہ پاکستان کو اپنا دیس سمجھ کر آئے تھے مگر اپنے دیس میں وہ پردیسی ہو گئے۔ پاکستانی معاشرے میں انہیں اتنی سی اہمیت دی گئی کہ وہ برے کستے مزدور تھے۔ تھوڑے سے میسوں پر بہت زیادہ کام کوا دیتے تھے۔

سردیوں کا موسم آیا تو باجرہ کا باپ ایک روز بڑی دُور سے ان درختوں سے چھوٹے چھوٹے ٹھن کاٹ کر لور گھٹا بنا کر لا رہا تھا جو درخت کسی کی ملکیت نہیں تھے۔ اپنی جھگیوں کے قریب آیا تو پولیس کا ایک آدمی اسے راستے میں بل گیا۔ اُس نے لکڑیوں کا گٹھا دیکھا تو اُسے دو تین کالیاں دے کر پوچھا کہ وہ کھڑیاں کہاں سے لایا ہے؟

”حضور! باجرہ کے باپ نے کہا۔“ بڑی دُور سے کاٹ کر لایا ہوں۔“

”سیدھے تھانے چلو۔“ پولیس والے نے اُسے حکم دیا۔ ”سرکاری درخت کاٹتے پھرتے ہو؟... چومیرے آگے آگے۔ چھ مہینے سزا ملے گی تجھے۔“

وہ لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے پولیس والے کی منت سماجت کرتا گیا لیکن پولیس والے نے اُس کی ایک نہ سنی۔ اُسے تھانے لے جانے کی بجائے اپنے گھر لے گیا اور کہا کہ لکڑیاں اندر بھینک دو بھاگو یہاں سے۔ باجرہ کے باپ نے گٹھا اُس کے گھر میں بھینکا اور چل پڑا پھر دروازے میں رک گیا۔

”حضور! اُس نے پولیس والے سے بیکٹاٹنگ کے لیے میں کہا۔“ چار آنے مزدوری

ہی دے دو۔“

پولیس والے نے اُسے دو آنے اور ایک گالی دے کر کہا۔ ”جاو فح ہو جا۔“ دوسروں کا بوجھ آنے دو آنے پر اٹھانے والے نے اس دھرتی سے اپنا بوجھ اٹھا دیا ساتھ والی جھگیوں والوں نے باجرہ کی ماں اور باپ کی لاشوں کو ان ہی کے بوسیدہ کمروں میں لپیٹ کر قبروں میں اتار دیا اور اوپر ٹھنڈی بے رحم مٹی ڈال دی۔ باجرہ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بچکیاں سینے میں گھٹ گئیں۔ آنسو آنکھوں میں اکٹک گئے، پسلیوں نے دل کو جکڑ لیا اور وہ قبرستان میں مٹی کے دو ڈھیروں کے درمیان بیٹھ گئی تھی۔

جانے کون تھا جو اُسے قبرستان سے اٹھا لایا تھا۔ وہ معصوم سی بھولی بھالی کچی تھی۔ راولپنڈی کی سردی نے اُسے ایک ہی رات میں عورت بنا ڈالا تھا۔ دکھیا ری، غموں کی ماری عورت۔ اُس کے لیے پاپٹھڑ کے مر گیا تھا اور لوگوں نے اس پر مٹی ڈال دی تھی۔ وہ ماں مر گئی تھی جو اُسے ساتھ ساتھ لیے گھر گھر برتن مانجنے جایا کرتی تھی لیکن اُس نے ننھی باجرہ کے ہاتھ کبھی میسلے نہ ہونے دیے تھے ورنہ ان جھگیوں میں رہنے والے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھروں، دکانوں، ہوٹلوں اور سیکریوں میں یاد رکشا پوں میں گاڑیاں صاف کرنے پر دس دس روپے ماہوار اور دو وقت کی روٹی پر نوکر کرا دیا کرتے تھے ان بچوں کی معصومیت دو وقت کی روٹی کے چکر میں الجھ کر دم توڑ جاتی تھی۔ طلوع سحر سے رات دس گیارہ بجے تک محنت مشقت کرتے یہ بچے بچنے میں جوان اور جوانی میں بوڑھے ہو جایا کرتے تھے۔

☆

ماں باپ مر گئے تو چند دنوں بعد جھگیوں والوں نے باجرہ کو بھی ایک گھر میں نوکر کرا دیا۔ جب اسے نوکر رکھنے والوں کو پتہ چلا کہ کچی لاوارث ہے تو تنخواہ کا سوال ہی ختم ہو گیا اور باجرہ دو وقت کی روٹی اور رات باورچی خانے میں دو کمرلوں میں سونے کی عیاشی کی خاطر صبح سے رات گئے تک اتنے بڑے گھرانے کی خدمت کرنے لگی۔ ننھی باجرہ کے سامنے جینے کا یہی مقصد تھا کہ پیٹ بھر روٹی مل جائے اور رات سڑی نہ لگے مگر ماں باپ مر گئے اور اُس سے مشقت کرائی جانے لگی تو اُسے پیارا اور شفقت کی تشنگی کا بھی احساس ہونے لگا۔ یہ احساس زہر آلود تھا۔

اُس کا دل پرانے گھر کے فرش اور فرنیچر کی گرد اور جھوٹے برتنوں کے انبار سے نہ لگ سکا اور دل ماں کے پیارا اور باپ کی شفقت کی جستجو میں بھٹکے لگا۔ اس گھر کے بچے سننے کھلتے اور ناخن کھداتے تھے۔ باجرہ بھی ان ہی جیسی اور ان ہی جتنی کچی تھی۔ ایک روز کام چھوڑ کر ان بچوں سے جا ملی۔ پہلے تو بچوں نے اُسے دھتکارا پھر بچوں کی ماں کو پتہ چلا تو اُس نے ایک بی ڈانٹ میں اُس سے بچپن چھین لیا۔

اُس شام باجرہ اپنے ماں باپ کی قبروں کے درمیان جا بیٹھی اور روتے روتے شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا۔ اگر اُسے بھوک اور سردی نہ لگتی تو شاید مٹی کے ان دو ڈھیروں کے درمیان ہی سو جاتی۔ وہ اٹھی تو اندھیرے سے ڈرنے لگی، پھر اپنے آقاؤں کا خوف اُسے ادھرتوا کرنے لگا۔ اُس نے کہیں اور بھاگ جانا چاہا لیکن کہاں؟ ننھے ننھے ذہن میں دو سوال سانپوں کی طرح پھنکارنے لگے۔ روٹی کون دے گا؟ کمر کون دے گا؟ اُسے اپنی جھگی یاد آئی۔ اُس کے آنسو نکل آئے اور وہ سسکیا لیتی چل پڑی۔

وہ دبے پاؤں باورچی خانے میں داخل ہوئی تو باورچی خانہ ہم کی طرح پھٹا۔ ”کہاں مر



گئی تھی نامراد؟

وہ سہم کر بیٹھے ہٹی پشت اس کے کہ دیکھے یہ کس کی آواز تھی اس کے کال پر زناٹے دار تھپڑا۔  
کمرے میں تارے ٹوٹنے لگے اور چھت سے لٹکتے بلب کی روشنی دھندلا گئی۔

☆

اس غم آلود دھندلے میں چھ سال بیت گئے۔

چھ بڑے ہی لمبے لمبے سال، جیسے وہ تنہا بے رحم صحراؤں کی ریتی چٹانوں کی بھول بھلیوں میں  
چھ برس ٹھیکتی رہی ہو۔ پیار کی پیاس سے دل پر کانٹے لگ آئے جو اس کے سینے کو چھب چھب کر لوہان کرتے رہے۔  
یہ زہری غلش اسے جینے نہیں دیتی تھی اور غلش اسے مرنے بھی نہیں دیتی تھی۔

ان چھ برسوں میں اس نے کیکے بعد دیگرے چار گھروں میں نوکری کی، ایک گھر کے جو رستم سے  
اٹکتا جاتی تو بھاگ کر کسی اور گھر میں جا نوکری کرتی۔ وہ پیار اور شفقت کی جستجو میں دروہ بھٹک رہی تھی۔ اس  
نے ان گھروں میں بچے کھچھے مگر اچھے اچھے اور طرح طرح کے کھانے کھائے اور کسی بھی گھر میں اسے  
سہری نہ لگی مگر وہ اپنے بھوکے ننگے اور جاڑے سے ٹھٹھرنے ہوئے بچپن کو دل سے نہ اتار سکی۔

اس کا دل مسلسل چوہ برس اسی جھوپڑی میں بھاگ جانے کے لیے ترستا رہا جہاں اس کی ماں اسے سینے  
سے لگائے اکڑ کر مر گئی تھی۔

وہ اب جہاں ہو گئی تھی مگر اس کے سینے سے فریادیں نکلتی رہتی تھیں۔ ”مجھے میرا بچپن لوٹا دو۔“

وہ تو جوان ہو گئی مگر دل بچپن سے اوجھلگی سے نہ نکل سکا۔ برتن دھوتے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ  
جاتے تھے اور دوسرے چوتھے روز ایک آدھ پڑج، پیالی یا پلیٹ ٹوٹ جاتی تھی۔ اس چھٹا کے  
کے معاً بعد اسے جانے کیسی کیسی گالیاں سننی پڑتی تھیں اور ایک گھر تو ایسا تھا جہاں دو چار بھتیجے بھی  
پڑ جاتے تھے۔ ٹوٹے برتنوں کی تلخ آوازیں، گالیاں، گھڑکیاں، کوسنے اور تھپڑاؤں کی ذات میں قیامت بپا  
کیے رکھتے تھے اور اسے کسی گھر میں ٹھکنے نہ دیتے تھے۔

اس نے پانچویں گھر میں جلم جانو کوری کی۔ چھٹا گھر کیمبل پور میں ملا اور اب وہ وزیر آباد کے ایک گھرانے  
میں نوکری کر رہی تھی۔

اس کی عمر کا ستر ہواں برس بھی گزر چلا تھا لیکن اسے ذرا بھرا حساس نہ تھا کہ وہ جوان ہو گئی ہے۔  
اس پر بے رحم سا سکوت طاری رہتا تھا۔ ایسی خاموشی جیسے وہ ٹوٹی اور بھری ہو۔ اس نے اب تک  
جتنے گھروں میں نوکری کی تھی وہاں کوئی جوان لڑکا نہ تھا نہ اسے باہر نکلنا پڑتا تھا۔ گھر کے کاسوں ہی میں دن  
گزر جایا کرتا تھا لیکن وزیر آباد کے اس گھر میں ملازم نہ ہوتی تو اس گھر کے جواں سال بیٹے، اقبال، نے  
دوسرے ہی روز فلمی مسکالوں کی زبان میں اس پر جنس و جوانی کے راز فاش کر دیئے۔ ہجرہ نے عمر میں پہلی  
بار اپنے ہاتھ میں دور روپے دیکھے۔

اس نے چھ سال دھن دانوں کی خدمت کی تھی لیکن روٹی، کپڑے اور بستر کے سوا اسے کوئی  
اجرت نہیں ملتی تھی۔ وہ تمام گھرانے ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر ذہنیت ایک سی تھی۔ وہ سب  
ٹوٹے ہوئے برتنوں کے پیسے کاٹ لیا کرتے تھے اور یوں اس کی سینے بھر کی اجرت دو وقت کی روٹی

اور دو کھل رہ جاتی تھی۔ پھر بھی ہاجرہ مطمئن تھی کہ لوگ اسے بھوکا نہیں رکھتے اور رات باہر نہیں نکال دیتے۔  
اس روز وزیر آباد کے اس گھر میں جواں سال اقبال نے باورچی خانے میں اس کے ساتھ ٹسکرا کر  
آوارہ لب دلچے میں باتیں کیں تو ہاجرہ کو پہلی بار علم ہوا کہ وہ جوان ہو گئی ہے۔ اس کے بال بڑے پیارے  
اور گردن لمبوتری ہے، اس کے قد بت میں جاذبیت اور آنکھوں میں جوانی کا خماس ہے اور اسے پہلی بار پتہ  
چلا کہ وہ کشمیرن ہے اور کشمیر کا سارا حسن اس میں سمٹ آیا ہے۔

اقبال نے اس کا ہاتھ تھاما، ہاتھ میں دو روپے دیتے اور باورچی خانے سے نکل گیا۔ ہاجرہ خیالی  
سی میں غسل خانے میں چلی گئی اور آئینے میں اپنے چہرے مہرے کو بڑی غور سے دیکھا۔ اسے یوں لگا  
جیسے وہ کسی انہبی اور خوبصورت لڑکی کو دیکھ رہی ہو۔ اس نے روپے روپے کے دو نوٹ منہ میں بچھینے  
لئے اقبال کی باتیں یاد آنے لگیں:

”ہاجرہ تم نوکرائی نہیں۔ میرے دل کی رانی ہو۔ تم نے اپنی جوانی اور حسن کو روٹی کپڑے پر بیچ ڈالا  
ہے۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو ہاجرہ! مجھے تم سے پیار ہے۔“

نوٹوں کو ہاتھ میں سسلے وہ باورچی خانے میں چلی گئی اور گہری سوتج میں گم ہو گئی۔ اقبال کی باتیں حلیہ رنگ  
کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ ”تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو ہاجرہ! مجھے تم سے پیار ہے۔“

ماں باپ کے مرنے کے بعد یہ پہلا انسان تھا جس کے منہ سے اس نے پیار کے دو بول سُنے  
تھے۔ اب ہاجرہ کی دنیا کی یہ پہلی آوازیں تھیں جنہوں نے اس کی ذات کے چپ چاپ سمندر میں لذت آگئیں  
تلاطم سپا کر دیا تھا۔ وہ نہ تو گرد و پیش کی اچھی بڑی آوازوں سے بیگانہ رہا کرتی تھی۔ اسے سکون سا محسوس  
ہونے لگا۔ ایسا سکون جس کا ذائقہ اس نے جھگی میں چھکا تھا جہاں اس کی ماں اور باپ ٹھٹھ کر مر گئے تھے۔  
اس کے ہونٹوں سے سکون اور مسرت کی آواز نکل گئی اور اس کے دل سے آواز اٹھی۔ ”اقبال بہت پیارا  
آدمی ہے۔“

اس نے منہ میں جھکے ہوئے دو روپے دیکھے تو اسے تلخ سا خیال آیا۔ ”اقبال نے مجھے  
پیار کی قیمت دی ہے۔۔۔۔۔ دو روپے۔۔۔۔۔ دو چوبیس اٹھی اور اپنے آپ سے کہنے لگی۔ ”قیمت؟۔۔۔ پیار کی  
بھلا قیمت ہوتی ہے؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں اقبال کو یہ روپے واپس کر دوں گی۔ میں پیار کی قیمت  
نہیں لوں گی۔“ اس کے جی میں آئی کہ اقبال پھر باورچی خانے میں آئے اور اسی طرح پھر کہے۔ ”ہاجرہ!  
مجھے تم سے پیار ہے۔“ اور میں اسے دو روپے واپس کر دوں۔

☆

وہ دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ ہاجرہ دیند میں بھی بے چین رہی ورنہ وہ تو بے سندھ ہو کر سویا کرتی تھی۔  
صبح جاگی تو اس کے ذہن میں اقبال کا خیال پل رہا تھا۔

ناشتے کے بعد اقبال ہاجرہ کو باورچی خانے میں اکیلا دیکھ کر آگیا۔ ہاجرہ کے ہونٹوں پر ہنسٹم آگیا۔ اقبال نے  
اس کے ہاتھ تھام لیے اور کل دالی باتیں شروع کر دیں لیکن ہاجرہ نے ٹسوس کیا کہ اس کی باتوں میں کل والے  
نوباس نہیں ہے۔ وہ سوتج ہی رہی تھی کہ اقبال کی باتوں سے اسے گھن کیوں آرہی ہے کہ اقبال نے نہایت  
فحش حرکت کر ڈالی۔

ہاجرہ پر سکوت طاری ہو گیا۔



کچھ بچوں کا کچھ تو نقصان ہوا۔ اس روز کے بعد وہ برتن دھوتے اس قدر محتاط ہو گئی جیسے اس گھر کے برتن اس کے اپنے جہیز کے ہوں۔

اقبال کی ماں کا یہ بے شفقت رویہ دیکھ کر وہ اقبال کے خلاف شکایت نہ کرنا چاہتی تھی۔ دُرتی تھی کہ ماں کے دل کو تکلیف ہوگی۔ یہ خدشہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے اس کی بات پر کوئی یقین ہی نہ کرے۔ اپنی اولاد کو کون برا سمجھتا ہے!

اقبال کی چھپر خانی دست درازوں کی صورت اختیار کر گئی اور ہجرہ چپ چاپ برداشت کرتی رہی۔ ایک روز گھر والے کسی کی شادی پر چلے گئے تو ہجرہ گھر میں اکیلی رہ گئی۔ اقبال بھی چلا گیا تھا مگر تھوڑی دیر بعد لوٹ آیا۔ اس نے ہجرہ کو اپنے کمرے میں بلا کر اداکاری کے تمام تر کمالات آزمائے۔ ہجرہ کو سونے کی چوڑیوں، بالیوں اور ریشمی دوپٹے کے لالچ دیئے۔ اسے کھینچ کھینچ کر اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کی لیکن ہجرہ کے آنسو بہ نکلتے۔

"اقبال جی! — ہجرہ دکھیاری اور ہاری ہوئی آواز میں بولی — تم تو مرد ہو۔ کسی بھائیوں والی بہن کو جا چھڑونا بے آسرو لو کرانی کو چھڑنا جو امر دی تو نہیں"

اس کے لب و لہجے میں بے بس اور شکست خوردہ التجا تھی مگر اقبال کا دل پھر تھا، پھر ہی رہا۔ اس نے اداکارانہ آہ لے کر ہجرہ کے دونوں رخساروں کو ہاتھوں میں تھام لیا۔

"یہ چھپر خانی تو نہیں ہاجو! — اس نے ہنستے ہوئے کہا — اسے عشق کہتے ہیں سیر عشق نے اندھا کر دیا ہے"

"خدا کرے تو اندھا ہی ہو جاتے" — ہجرہ نے جل کر کہا — "مجھ نامراد کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے اندھا کرے تیری آنکھوں کے ڈھیلے جل جائیں اور ٹوٹھو کریں کھاتا پھرے"

اس کے آنسو بہ رہے تھے اس نے اقبال کے ہاتھ جھٹک ڈالے اور سکیاں لیتی باہر نکل گئی۔

۲۲

دو سال بعد جب اقبال کی آنکھوں کے ڈھیلے بیدیاں کے محاذ پر بھارتی مارٹر گن کے گولے نے جلا ڈالے اور وہ عمر بھر کے لیے اندھا ہو گیا تو ہجرہ اس کا ہاتھ تھامے بی آربی کے کنارے کھڑی اسے کہہ رہی تھی — "اقبال جی! میری آنکھیں لے لو نا! میں نے ڈاکٹر سے پوچھ لیا ہے۔ کہتا ہے آنکھیں نکالتے اور ڈالتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہوتی"

"مجھے سب کچھ نظر آرہا ہے ہجرہ! — اقبال نے اسے کندھے سے تھام کر قریب کر لیا اور بولا —

"میں تمہاری آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ بیدیاں سیکڑے ہیں۔ میں بی آربی کے کنارے کھڑا نہر کی روانی سن رہا ہوں۔ لگتا ہے جیسے یہ روانی مجھے نظر آرہی ہے۔ کہو تو بتا دوں کہ میں بغیر آنکھوں کے کیا دیکھ رہا ہوں۔۔۔ دایں طرف ٹوٹا ہوا پل ہے جسے برستے گولوں میں سیپرز نے لہو لہان ہو کر ڈانٹا میٹ سے اڑایا تھا۔ اس پل پر ایسٹ بنگال جرنل کے شیروں نے جانیں قربان کر کے پنجاب کی لاج رکھ لی تھی۔ میری آنکھیں سپین ضائع ہوئی تھیں۔۔۔ ضائع نہیں ہوئی تھیں ہجرہ! میری آنکھیں قربان ہو گئی تھیں۔ اس نے ہجرہ کی پیچھے اپنے سینے سے لگا کر کہا — "آج تم یہاں لے آئی ہو تو بی آربی کی روانی کے جلت رنگ نے میری روح کے درپے آنکھوں دیئے

اس نے اقبال کی آنکھوں میں دیکھا تو ان آنکھوں میں اسے نہ باپ کی چمک نظر آئی نہ ماں کی جھلک نہ ان آنکھوں میں اسے پیار کا ہم و نشان ملا۔ وہ کوئی ایسی چالاک اور ہوشیار لڑکی تو نہیں تھی لیکن اقبال کی آنکھوں کی چمک اور سکواہٹ اس قدر تکی تھی کہ ہجرہ کو سمجھنے میں ذرہ بھر دیر نہ لگی کہ اقبال مر رہا اور وہ نوجوان لڑکی۔ اقبال نے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور ہجرہ کی مٹھی میں دے کر اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر زور سے بھینچا۔ ہجرہ تڑپ اٹھی اور اس کے بازوؤں سے نکلنے لگی۔ اقبال کا ہاتھ اس کے سینے پر جا پڑا۔

"میں رندی تو نہیں صاحب جی! — ہجرہ تمنغ سا گھونٹ نکل کے بولی — تم نے پھر اس طرح کیا تو میں بی بی جی سے کہہ دوں گی" — اس نے پانچ کا نوٹ اقبال کی طرف پھینک دیا اور اپنے آزار بند کے ساتھ بندھے ہوئے کل والے دور روپے کھول کر پانچ کے نوٹ کے قریب پھینک دیئے اور باہر نکل گئی۔ اس کے سینے پر منوں دزنی سل آگئی تھی جسے وہ نہیں پھینک دینا چاہتی تھی۔

اقبال اس دھمکی سے ڈر جانے والا نہیں تھا کہ میں "بی بی جی سے کہہ دوں گی"۔ لایبور کے جس کالج میں وہ پڑھتا تھا وہاں ایسی دھمکیاں اسے آتے روز ملا کرتی تھیں۔ بڑی بڑی طرحدار لڑکیوں نے اسے کالج سے نکلوا دینے کی دھمکیاں دی تھیں لیکن چار سال گزر گئے تھے اور اسے کوئی نہ نکلوا سکا تھا۔

اقبال ماں باپ کا اکلوتا مگر بگڑا ہوا بیٹا تھا جو بی۔ اے کے آخری سال میں دوبار فیل ہو چکا تھا۔ اس کا اسے کوئی غم نہ تھا۔ ماں باپ اسے بے دریغ روپیہ پیسہ دیتے جا رہے تھے اور وہ اوباش پن اور عشق بازیوں میں زندگی گزار رہا تھا۔ پڑھنے پڑھانے سے اسے ذرہ بھر دلچسپی نہیں تھی لیکن کالج سے اسے بے پناہ پیار تھا کیونکہ کالج کے نام پر ہی اسے ماں باپ سے منہ مانگے پیسے مل رہے تھے۔ اس نے ہوٹل میں الگ کمرہ لے رکھا تھا جس کے بند کواڑوں کے پیچھے ایک دو لڑکیوں کی دبی دبی چوری چھپے کی ہنسی اکثر سنائی دیتی تھی۔

ان دنوں وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گھر آیا ہوا تھا۔ اسے آئے ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ ہجرہ کو ان کے گھر میں نوکری مل گئی تھی اور وہ ہجرہ کو روپے پیسے اور چرب زبانی کے کمال سے ہوس کے جال میں الجھانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ پہلے دو روپے پھر پانچ روپے اور ایک روز اس نے ہجرہ کو دس روپے دینے کی کوشش کی لیکن ہجرہ نے دل میں نفرت کے طوفان روک کر خاموشی سے یہ دس روپے بھی ٹھکرا دیئے اور پھر وہی دھمکی — "بی بی جی سے کہہ دوں گی"۔

ہجرہ نے یہ دھمکی تو دے دی لیکن وہ بی بی جی سے شکایت کرنے سے بچکچا رہی تھی۔ وہ اس گھر سے بھاگنا بھی نہ چاہتی تھی کیونکہ چھ سات برسوں بعد اسے پہلا گھر ملا تھا جہاں گالیاں دینا تو درکنار اس سے کوئی ہلکی سی ترش کلامی بھی نہ کرتا تھا۔ ایک روز اس سے ایک پلیٹ ٹوٹ گئی تھی تو وہ لرز اٹھی تھی لیکن اسے کسی نے گالی نہ دی نہ تنخواہ میں سے پیسے کاٹ لینے کا رعب دیا۔ اقبال کی ماں نے ٹھہرے ٹھہرے لب و لہجے میں صرف اسی قدر کہا تھا — "ماتے ہاجو! تو نے دوسری پلیٹ بھی توڑ دی۔ ایسی دوسری پلیٹیں تھیں ایک مجھ سے ٹوٹ گئی تھی۔ میرے جہیز سے یہی دو پلیٹیں باقی تھیں۔۔۔ چلو کوئی بات نہیں، بڑا پرانا ڈیزائن تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہجرہ کو کسی کا برتن توڑ کر دکھ ہوا تھا، ورنہ نہ برتن توڑ کر اسے خوشی سی محسوس ہوا کرتی تھی



ہیں۔ لگتا ہے جیسے مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے۔

اور اُس روز، دو برس پہلے، ہاجرہ کو گھر میں اکیلا دیکھ کر اقبال نے اُس کے گال ختم لیے اور ماتھے کا گناہ آلود بوسہ لیا تھا تو ہاجرہ نے جل کر کہا: ”خدا کرے تو اندھا ہو جاتے۔“ اور وہ باورچی خانے میں چلی گئی تھی اور اندر سے جھنجھکی چڑھا کر پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔ بیچارگی کا احساس اُسے ڈنکا دیا تھا اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُس لڑکی کی آبرو کا خدا ہی حافظ ہے جس کا کوئی بھائی نہ ہو۔ پہلے تو وہ صرف بھوک، سڑی اور پیار کی تشنگی کو محسوس کیا کرتی تھی، مگر اقبال نے اُسے بے آبرو کرنے کی کوشش کی تو اُس پر انکشاف ہوا کہ بے آبروئی، بھوک اور سڑی سے زیادہ بے رحم ہے۔

☆

ڈیڑھ ماہ کی چھٹیاں گزار کر اقبال لاہور چلا گیا تو ہاجرہ کو خوشی سی ہوئی۔ اقبال کا لاہور چلے جانا اُس کی زندگی کا پہلا خوش گوار واقعہ تھا اور نہ وہ تو مسرت کے نام ہی سے نا آشنا تھی مگر یہ خوشی دوسرے ہی روز دم توڑ گئی۔ جب اُسے پہلی بار سودا سلف لانے کے لیے بازار جانا پڑا۔ یہ پہلا گھر تھا جہاں اُس پر پانچ سات روپوں کا بھروسہ کیا گیا تھا۔

وہ گلی میں سے گزری تو گلی کی ٹکڑ پر تین چار لڑکے کھڑے تھے۔ وہ ان کے قریب گزری تو اُسے ایک لڑکے کی آواز سنائی دی۔ ”چوہری صاحب کی نوکرانی ہے۔“

”عجب چیز ہے بھئی۔“ دوسرا بولا۔

”اقبال کی چیز ہے نا!۔“ تیسرے نے کہا۔

ہاجرہ نے بڑے غصے سے گھوم کے دیکھا تو ایک لڑکے نے دل پر ہاتھ رکھ کر مجنونانہ ”ہائے“ کہی۔

ہاجرہ کا عتاب اُس کے سینے میں گھٹ گیا اور وہ اندر ہی اندر جلتی بازار چلی گئی۔

وہ عام سی سیلی کیجی، بھدے بھدے نقش و نگار والی لڑکی ہوتی تو کوئی اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا لیکن ہاجرہ کی بدتمیزی کہ اُس کی شکل و صورت میں جاذبیت اور قدت میں دکھائی تھی۔ جب پاکستان کے سڑکوں کو پتہ چلا کہ وہ تنیم نوکرانی ہے تو اُس کی دل کشی اور بڑھ گئی۔ اُس کی بیچارگی نے مردوں کی نگاہ میں اُس کے حسن کو دوبالا کر دیا۔

اسے اب ہر روز ایک دو مرتبہ بازار جانا پڑتا تھا۔ اُسے ہر کوئی گھور گھور کر دیکھتا تھا جس دکاندار کے پاس جاتی تھی وہ بھی اُسے نظر بھر کر دیکھتا تھا۔ بعض آوارہ سے لونڈے دانستہ اُس کی راہ میں آجاتے تھے پھر بک کر یوں ایک طرف ہو جاتے جیسے بے خبری میں اُس کی راہ میں آگئے ہوں۔ کوئی قریب گزرتے کسی سلی گیت کا غش بول گا جاتا اور کبھی کبھی ایک نوجوان سا چھوٹا لڑا سسٹر آن کیے اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا تھا۔ ہر مرد اور ہر لڑکے کی آنکھوں میں ہاجرہ کو اقبال جھانکتا نظر آتا تھا۔ عربانی، فحاشی اور بے حیائی کا ایک سیل تھا جس میں ہاجرہ کی ناؤناؤ دُوب دُوب کر ابھر رہی تھی۔ اُس کے ہونٹ سل گئے اور سہلے ہوئے ہونٹوں نے سینے میں اُلتا ہوا لاوا روک لیا۔

وہ کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکی نہ کسی کا کچھ بگاڑنے کی کوشش ہی کی۔ اُس نے کسی سے شکایت نہ کی نہ خدا سے کلام کیا کیونکہ اس طوفان بدتمیزی کی زد میں آئی ہوئی وہ اکیلی ہی نہیں تھی۔ ایک روز اُس سے چند قدم آگے آگے ایک برقعہ پوش لڑکی جا رہی تھی۔ جب وہ پواڑی کی دکان کے قریب گزری تو ایک لونڈے نے نرم

سے کہا۔ ”اس رُخ منور سے چہن ہی ہٹا دیجئے۔“

ہاجرہ نے سوچا کہ یہ لڑکی کسی کی نوکرانی نہیں۔ یہ ضرور رک کر اس لڑکے کو دو چار سادے کی لیکن لڑکی نے پرواہی نہ کی اور اپنی راہ چلتی گئی۔ ہاجرہ نے بھی سوچا کہ بھونکتے کتوں کے جواب میں انسان بھونکا نہیں کرتے۔ اُسے فلمی گیتوں اور مردوں سے نفرت ہو گئی۔ اُسے کسی نے سمجھایا یا بتایا نہیں تھا کہ ایسے مردوں سے اُسے نفرت ہونی چاہیے۔ اُس کی ذات سے آواز سی اٹھتی تھی کہ ہاجرہ تو بکاؤ مال نہیں۔ بعض اوقات یہ خیال اسے دُوب مارنے لگتا کہ اُس کی آبرو کا رکھوالا کوئی نہیں۔

ہاجرہ گلیوں میں اور سڑکوں پر بھٹکتے ان دبے پتے مرلی مرلی عورت نما نوجوان ہانکوں کو راہ کٹے وڑے سمجھ کر خیا لوں ہی خیا لوں میں ٹھوکریں مارتی چلی گئی لیکن صوبیدار اکبر علی سے تو اُسے بہت ہی نفرت ہو گئی تھی۔ یہ پہلا مرد تھا جسے تنگ آکر ہاجرہ نے بے بسی سنا ڈالی تھیں۔

صوبیدار اکبر علی چند ہی مہینے گزرے پاک فوج سے نیشن پر آیا تھا۔ اُس کی بیوی کبھی کی مرچ تھی۔ دو ہی بیٹیاں تھیں جن کی شادیاں اُس نے نیشن پر آنے ہی کر دی تھیں۔ اُس کا چولہا چوکا ایک ادھیڑ عمر ملازمہ کرتی تھی۔ ایک روز صوبیدار اکبر علی کی نظر ہاجرہ پر پڑ گئی تو وہ بھی عمر کی گئی گزری مندریں پھلانگ کر بیس بائیس برس کا بانکابن گیا۔ اُس نے کسی سے ہاجرہ کے متعلق پوچھا تو اُسے پتہ چلا کہ وہ اقبال کے گھر میں نوکرانی ہے۔ اُس نے ہاجرہ کو راہ میں روک لیا۔

”دیکھو لڑکی!۔“ اُس نے ہاجرہ سے بلا تمہید کہا۔ ”تم کتنی شکل دار ہو اور روٹی کھڑے پر نوکرانی کر رہی ہو میرے گھر آ جاؤ۔ نکاح پڑھا کر گھر کی ماکن بنادو گے۔ لیشیم میں لپیٹ کر رکھوں گا۔“

ہاجرہ نے اس نئی صورت والے مرد کے چہرے مہرے کو دیکھا تو اُس کی پنتیا لیس سپاس سالہ بوڑھی آنکھوں میں اُسے نوجوان اقبال جھانکتا نظر آیا۔ وہ چپ چاپ راہ لگ گئی۔ دوسرے دن پر اُسے غصہ آیا کہ اقبال جھانکتا نظر آیا۔ لیکن اکبر علی کی بات سن کر اُسے رونا آگیا۔ وہ تو اُس کے باپ کی عمر کا آدمی تھا۔

دوسرے روز بازار گئی تو اکبر علی نے پھر اُس کی راہ روک لی۔

”یہ نہ سمجھو کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔“ اکبر علی نے کہا۔ ”پچیس برس فوج کی سڑس کی ہے۔ آؤ نا! اپنا گھر بناؤ۔“ اپنی ایک میٹی کو اُجاڑ کر گھر بناؤ نا!۔ ہاجرہ نے کہا۔ ”اُسی کو لیشیم میں لپیٹ کر پوچھنا کہ تم بوڑھے ہو گئے ہو یا نہیں۔“ اور اکبر علی کو مسکراتا چھوڑ کر آگے چلی گئی۔

اگلے روز اکبر علی پھر اُس کی راہ میں کھڑا تھا۔

”ہاجرہ!۔“ وہ ہاجرہ کو روک کر بولا۔ ”یہ قیامت کی جوانی پر اُسے چولے میں نہ جلاؤ، میرے گھر آ جاؤ۔ خدا کی قسم سسر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔“

ہاجرہ اور اکبر علی میں تیسرے چوتھے روز جھک جھک ہو جاتی۔ وہ اُس کی راہ روکنے سے باز نہ آتا تھا اور ہاجرہ جو منہ میں آتے کہہ کر اپنی راہ لگ جاتی تھی۔ اس دوران اقبال کئی بار ایک دو دنوں کے لیے گھر آیا۔ اُس کا بھرا بھرا جسم اور پُر شباب چہرہ مہرہ دیکھ کر ایک روز ہاجرہ کا دل اُسے یہ کہنے کو ٹپسنے لگا کہ اقبال جی! گلیوں میں مجھے ایسے ایسے لونڈے چھڑتے ہیں جنہیں تم ایک پتھر مار دو تو بے ہوش ہو جائیں۔ میں تمہاری نوکرانی ہوں اقبال جی! تمہارے گھر کی عزت ہوں۔ لیکن اقبال اُسے بھوکے نظروں سے دیکھ کر مسکرایا تو ہاجرہ کا دل سمجھ کے رہ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ اقبال کی مسکراہٹ اور گلیوں کے آوارہ نوجوانوں

ون اردو ڈاٹ کام معینز  
برائے اقبال



کی مسکراہٹ میں کوئی فرق نہیں۔

البتہ جس بجرہ کے سینے میں رک گئیں اور اُس کا دم گھٹنے لگا۔

وہ پیار کی تشنہ تھی مگر تشنگی اب انکار سے بن گئی اور اُس کا انگ انگ جلنے لگا۔ وہ نفرت و حقارت کا حسین پیکر بن گئی۔ پہلے پہل تو اسے رونا آجاتا تھا مگر اب آہ بھی نہیں بھرتی تھی — گریباں نہ خنداں!

☆

ایک روز اقبال کے ایک خط نے گھر میں ماتم کی فضا پیدا کر دی۔ اُس تو کسی نے نہ بہائے لیکن سب کے منہ ٹھک گئے۔ اقبال کی ماں اور دونو بہنیں سر جھجکا کے بیٹھ گئیں اور اُس کا باپ غصے میں بچھا ہوا کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔ بجرہ نے اقبال کی ماں سے پوچھا تو اُسے مختصر سا جواب ملا — "اقبال فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔" اقبال کے باپ کو اپنے اکھوتے اور لاڈ اور پیار سے پالے ہوئے بیٹے کے لیے فوج جی سخت نوکری بالکل پسند نہیں تھی، حالانکہ وہ کمشن کے لیے منتخب ہوا تھا۔ اُسے اس بات پر بھی بہت غصہ آ رہا تھا کہ اقبال اُسے بتائے بغیر ٹریننگ کے لیے چلا گیا تھا۔ اقبال کا فوج کی کمشن کے لیے منتخب ہو جانا محض اتفاقی واقعہ تھا۔ وہ کالج میں کسی بڑے گھرانے

کی لڑکی کے ساتھ بڑا ہی غلیظ مذاق کر بیٹھا تھا۔ لڑکی نے اپنے گھر جاتا ہوا اور اگلے روز لڑکی کا باپ پرنسپل پر آ برسا۔ پرنسپل نے اقبال کو کالج سے نکال دیا اور ہوٹل کا کمرہ فراخالی کرنے کا حکم دے دیا۔ اقبال کو پتہ چلا کہ فوج میں کمشن کے امیدواروں کا انتخاب ہو رہا ہے۔ وہ بھرتی کے دفتر چلا گیا۔ قد بُت اور شکل و صورت اچھی تھی۔ ابتدائی امتحان میں کامیاب ہو گیا۔

وہ کئی روز دوستوں یاروں کے ساتھ لاہور میں ہی گھومتا پھرتا رہا۔ وہیں سے سلیکشن بورڈ کے بلاؤس پر آخری انتخاب کے لیے چلا گیا۔ جسم اور دماغ کا چست اور چالاک تھا۔ وہاں بھی کامیاب ہو گیا اور ٹریننگ کے لیے بھیج دیا گیا۔ اُس نے ملٹری اکیڈمی سے باپ کو خط لکھا کہ وہ فوج میں کمشن کے لیے منتخب ہو گیا ہے اور اب ٹریننگ لے رہا ہے۔

دو سال گزر گئے۔

☆

ان دو برسوں کے دوران بجرہ کی زندگی میں اسی قدر تبدیلی آئی کہ اُس کی آبرورسنڈ لانے والوں میں اقبال نہیں تھا۔ اُس کی ہر صبح گزری ہوتی صبح کی طرح بے کیف اور شام گزری ہوتی شام کی طرح ملول اور رنجیدہ ہوتی تھی اور دن اسی طرح گھر کی جھاڑ پونچھ، برتن دھونے اور بازار کے دو تین پھیروں میں گزرتا تھا جس طرح چھ سات برسوں کا بردن گزرتا رہا تھا۔ ہندوستانی اور پاکستانی فلموں کے سنگے گیت اُس کے گرد زبردستی بھڑوں کی طرح بھنبھناتے رہتے تھے۔

ان دو برسوں کے دوران اُسے اپنے مالکوں کے ریڈیو سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ اقبال کی بہنیں فلمی گانوں کے سوا اور کچھ سننتی ہی نہیں تھیں۔ بجرہ یوں جل اٹتی جیسے گانے والے اُسی پر فقرے چست کمر سے ہوں۔

ان دو برسوں میں بجرہ سترہ سے انیس برس کی ہو گئی تھی اور اُس کے جسم میں چند تبدیلیاں اور زیادہ

نمایاں اور دلکش ہو گئی تھیں۔ رخساروں کی رنگت اور زیادہ جاذبِ نظر اور بالوں کی چمک اور زیادہ کھڑائی تھی مگر اُس نے کبھی دھیان نہ دیا تھا کیونکہ اُسے اپنے جسم کے ساتھ ذرہ بھر دلچسپی نہ تھی۔

ضربیدار اکبر علی مکمل دو برس اُس کی راہ میں کھڑا رہا اور اُسے شادی کے لیے اُکساتا رہا۔ اُس نے بجرہ کو سونے کے زیورات کے لالچ بھی دیتے، سو سو روپوں کے نوٹ بھی دکھائے۔ پھر ایک روز اُکھا کر اُسے اٹھا لے جانے کی دھمکی بھی دی۔

"ہاجو! — ایک روز اکبر علی نے تنگ آکر اُسے کہا — اپنی قیمت خود ہی بتا دو۔"

بجرہ تپتھکتی جسے اپنی قیمت کا کچھ علم نہ تھا۔ اُکرا سے کوئی خواہ جھوٹے پیار سے ہی بلاتا تو وہ بے دام اکاب جاتی۔ اُسے سونے چاندی اور سو کے نوٹوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُسے پیار سے پیارتا اور مڑوں سے نفرت۔

☆

دو سال گزر گئے تو اقبال ٹریننگ ختم کر کے چند دنوں کی چٹی آگیا۔ وہ اب سینکڑوں لٹینٹ تھا۔ بجرہ نے اُس کے چہرے پر ہرے اور ڈیل ڈول میں نمایاں تبدیلی دیکھی۔ اس قدر طویل فوجی ٹریننگ نے اُس کے تن بدن کو چھریا بنا دیا تھا اور چہرے پر لڑکپن کی آوارگی کی جگہ مردوں کی سی پختہ کاری کے تاثرات تھے جو اُس کے مردانہ حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔

دوسری صبح بجرہ بازار سے سودا سلف لے کے گھر کی طرف آرہی تھی کہ اُسے اقبال آتا دکھائی دیا۔ بجرہ کو اقبال کی چال و حال میں دلکش سی مردانہ سنجیدگی نظر آئی۔ اُس کے ذہن سے دو برس پہلے والا آوارہ اقبال نکل گیا۔ بجرہ مسکرا دی جیسے اپنے پھیل چھپے بھائی کو دیکھ لیا ہو۔ اُسے پیار سا خیال آیا کہ اب اقبال کی شادی ہونی چاہیے۔ اُس نے وزیر آباد کی گلیوں میں بارائیں آتی اور ڈولیاں اٹھتی اکثر دیکھی تھیں مگر اُسے بھولے سے بھی کبھی خیال نہ آیا تھا کہ وہ خود بھی اُس عمر کو پہنچ گئی ہے جہاں لڑکیوں کے خوابوں اور تصوروں میں بارائیں آنے لگتی ہیں اور رنگ رنگیے تصورات انہیں دلی کے بچکولے دینے لگتے ہیں مگر بجرہ کے خواب اور تصور ہمیشہ رُکھے پھیکے رہتے تھے۔

اُس روز اقبال کو گلی میں آتے دیکھا تو اُسے اقبال کی شادی کا خیال آگیا اور سوچنے لگی — "کوئی مجھے کہے تو میں اقبال جی کے لیے پری جیسی خوبصورت ڈسٹ ڈھونڈ لاؤں" — جب اقبال اُس کے قریب آیا تو بجرہ مسکرا کر بولی — "سویرے سویرے کہاں چل دیتے اقبال جی؟"

اقبال رُک گیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر اُس نے بجرہ کا ہاتھ تھام لیا اور ہاتھ کو دبا کر بولا — "ہاجو! صرف تین روز کی چٹٹی آیا ہوں۔ اب تو پردیسی ہو گیا ہوں ہاجو! — اُس نے بجرہ پر چمک کر رازداری سے کہا — چلو آج دوپہر کے وقت ایک دوست کے گھر چلے چلیں۔ وہ باہر چلا جائے گا۔ اُس کے گھر میں اور کوئی نہیں ہوگا۔" بجرہ کے سینے میں ہم پھٹا اور اُس کی مسکراہٹ یوں بکھ گئی جیسے کسی نے آندھی میں دیا جلانے کی کوشش کی ہو۔

"تم تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہو — اقبال نے کہا — خدا کی قسم وہاں اور کوئی نہیں ہوگا۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔"

بجرہ کو پھر سا آگیا۔ سنبھلی تو دیکھا کہ اُس کے سامنے وہی وہی دو برس پہلے والا اقبال کھڑا تھا — آوارہ۔



ادبائش، کردار سے عاری اقبال — ہجرہ رو کے ہوئے آنسوؤں کے دھندلکے میں گھر آگئی۔

چھٹیوں کے باقی دو دن اقبال نے ہجرہ پر طرح طرح کے بال پھینکے لیکن وہ صاف بچ نکلتی رہی۔ اقبال کو ذرہ بھر احساس نہ تھا کہ اب وہ کالج کا آوارہ لڑکا نہیں سیکولیفٹینڈ بن گیا ہے اور پاک فوج کی ایک انفنٹری بٹالین میں جا رہا ہے۔ اُس نے تو کالج بدر ہو کر راہ فرار ڈھونڈی تھی۔

ان دو برسوں میں ہجرہ پتھر بن گئی تھی اور اُس کے آنسو خشک ہو گئے تھے لیکن اُس روز وہ باورچی خانے میں بہت روئی۔ اُس نے رو رو کے چاہا کہ اقبال کو باورچی خانے میں بلا کر کہے کہ اقبال جی! میں نے تمہیں کس پیار سے بلایا تھا! تم تو مجھے بہت ہی پیارے لگتے تھے۔ مگر وہ اقبال کا سامنا کرنے کی جرأت نہ کر سکی اور سر گھٹنوں میں دے کر یوں بسک بسک کر رونے لگی جیسے خزاں سے جھڑے ہوئے خشک پتے ایک ایک کر کے اُچڑے ہوئے آگن میں سسک سسک کر تے گر رہے ہوں۔

اُسے تلخ سا خیال آیا — "میرا وجود مردوں کی تفریح کے لیے بنایا گیا ہے۔ لوگوں کو میرا جسم اچھا لگتا ہے میری روح اور میرے پیار سے کسی کو پیار نہیں کسی کے دل میں میرے لیے شفقت نہیں" — اُس نے اپنے پسیدی مال گندی بازوؤں پر نگاہ ڈالی تو اُسے ان سٹول بازوؤں سے گھن آنے لگی جیسے ان کے ساتھ گندی چپکی ہوئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد غسل خانے کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو اُس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اُسے اپنے عضو عضو سے نفرت ہو گئی کیونکہ یہ جسم مردوں کو اچھا لگتا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو دنیا کی جمانی سے بوج کر خیالوں ہی خیالوں میں ڈور پیچھیک دیا جیسے کسی نے اُدھکلی کلی کو ڈالی سے توڑ کر کوڑے کرکٹ کے گندے ڈھیر میں پھینک دیا ہو۔

اقبال اُسے خیالوں کے جہنم میں پھینک کر واپس چلا گیا۔

اقبال کے چلے جانے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ صوبیدار اکبر علی وہیں تھا۔ وزیر آباد کی گلیوں اور بازاروں میں اُسے چھیڑنے والوں کی ٹولیاں وہیں تھیں لیکن ہجرہ برف کا تودہ تھی جس سے سبھی سر پھوڑ رہے تھے۔ کبھی کبھی ہجرہ کے دل سے جلی ہوئی فریاد نکل جاتا کرتی تھی — "خدا تمام مردوں کو اندھا کر دے، نہ مجھے دیکھیں نہ جو اس کریں۔"

☆

ہجرہ کی ہجور زندگی کے دو اور پہینے گزر گئے۔

ایک رات وہ اقبال کے باپ کو چائے دینے ڈرائنگ روم میں گئی۔ ریڈیو سے گانے نشر ہو رہے تھے۔ گانا ادھورا ہی تھا کہ بند ہو گیا اور آواز آئی :

"ایک ضروری اعلان سنئے۔ مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین نے صدائے کشمیر کے نام سے اپنا ریڈیو سیشن قائم کر لیا ہے جس کے پہلے نشریے میں تھوڑی سی دیر ہوئی اعلان کیا گیا ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں حریت پسند کشمیریوں نے مسلح بغاوت کر دی ہے اور گوریلا جنگ شروع کر دی ہے۔ صدائے کشمیر نے خبر نشر کی ہے کہ آج دن کے پچھلے پر مجاہدین آزادی نے ایک پل تباہ کر دیا ہے اور گوریلا دستے جگہ جگہ بھارتی فوج کی چوکیوں پر کامیاب حملے کر رہے ہیں۔"

اقبال کا باپ چونک اٹھا لیکن ہجرہ نہ چونکی نہ اُس نے دھیان دیا کہ ریڈیو کے اس ضروری اعلان

میں کیا ضروری پن ہے، مجاہدین آزادی کون ہیں اور صدائے کشمیر کیا ہے۔ اُس نے چائے کی پیالی تپائی پر رکھی اور باہر نکل آئی۔ اُس کی اپنی محدود اور سڑی ہوئی دنیا ہنگاموں سے بھر پور تھی۔ اُس کی بلا سے باہر پل تباہ ہوتے رہیں اور بھارتی چوکیوں پر حملے ہوتے رہیں۔ وہ خود بغاوت کر دینا چاہتی تھی مگر جانتی نہ تھی کہ کس طرح بغاوت کرے اور کس کس کے خلاف کرے۔ وہاں تو زمانہ ہی دشمن تھا۔

صبح ہوئی تو وہ بازار گئی اُسے جانے کیوں یاد آگیا کہ کل رات مقبوضہ کشمیر میں کچھ ہوا تھا لیکن اُس کے ذہن نے مقبوضہ کشمیر کو فوراً اگل دیا۔ اُسے یہ بھی یاد نہ آیا کہ وہ خود کشمیر کی مٹی کی پیداوار ہے اور آواز جو اُس نے گزشتہ رات ریڈیو سے سنی تھی، وہ اُس کے اپنے وطن کی آواز تھی۔ اُس کا دطن تو یہ گھر تھا جہاں اُسے پیٹ بھر کر روٹی ملتی تھی اور وہ رات بچی چھت کے تنچے سوئی تھی اور جہاں سردی سے اکڑ کر مرنے کا خطرہ نہیں تھا۔

اُس نے سوچنے کی کوشش ہی نہ کی کہ مقبوضہ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو وزیر آباد میں تھی جہاں کچھ بھی نہیں ہوا تھا اور وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اُس روز بھی صوبیدار اکبر علی نے کھنکرا کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اُس روز بھی گلی کی نگر پر ایک لونڈے نے دل پر ہاتھ رکھ کر، ہاتے، کبھی تھی گلیوں اور بازاروں کا ماحول اور مردوں کی نظریں وہی تھیں جو ریڈیو کے اس ضروری اعلان سے پہلے تھیں۔

دنوں پر دن گزرتے چلے گئے۔ ہجرہ اپنی اُجڑی ہوئی دنیا میں تڑپتی تری رہی اور بالکل ہی بے خبر کہ مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین آزادی بھارتی فوج پر بجلیاں بن بن کے لوٹ رہے ہیں اور کئی اہم فوجی چوکیوں کا صفیا کر چکے ہیں۔ ریڈیو پر ہر روز خبریں نشر ہو رہی تھیں کہ کشمیری حریت پسندوں نے بے شمار پل تباہ کر دیے ہیں اور انڈین آرمی کا کوئی کھوئے منزل پر نہیں پہنچتا۔ فوجی گاڑیاں گوریلوں کی نذر ہو جاتی ہیں اور سامان گولے اٹھالے جاتے ہیں۔ ہجرہ کو فلی گانوں کی وجہ سے ریڈیو ہی سے نفرت تھی اس لیے اُس نے تو سنا ہی نہ تھا کہ سری نگر کا فوجی ہیڈ کوارٹر مجاہدین آزادی کے گوریلا حملوں سے لرز رہا تھا۔ مقبوضہ کشمیر کی سڑکوں پر موت کی حکمرانی تھی اور انڈین آرمی محصور ہو کے رہ گئی تھی۔

☆

ایک روز وزیر آباد کے ماحول میں یکایک تبدیلی آگئی۔ ہجرہ باہر نکل تو اُس نے فضا میں کچھ اُسا دیکھا۔ ایسا ہی کچھ لوگوں کے چہروں پر تھا اور اُن کی باتوں میں بھی اضطراب تھا۔ دن کا کچھلا پھر تھا۔ گلی گلی، گھر گھر، سڑکوں، چوکوں اور بازاروں میں عزم و عفتہ سے ہرگز ایک ہی آواز بجولے کی طرح اُٹھ رہی تھی — "ہندوستان لے اٹوان شریف پر گولہ باری کی ہے... ہندوؤں نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے... مسجد شہید ہو گئی ہے... عورتیں اور بچے شہید ہو گئے ہیں... گجرات کے ایک گاؤں پر... گاؤں تباہ ہو گیا ہے۔"

ہجرہ اُن ہی گلیوں سے گزر کر بازار گئی جہاں راہ جاتی لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرنے والے لڑکوں کی طرح گھومنے رہتے تھے۔ وہ آوارہ لونڈے اُس روز بھی گلیوں میں موجود تھے مگر اُس ذرہ چھپنے کے موڈ میں ہی نہیں تھے۔ وہ سرجوڑے کھڑے تھے۔ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ہجرہ قریب سے گزر گئی ہے۔ بازار میں بھی ہجرہ نے لوگوں کے چہروں کے تاثرات بدلے بدلے دیکھے۔ اُن کی باتوں میں یحیاں نمایاں تھا۔ ہجرہ کو یوں لگا جیسے آج مرد آپس میں لڑ پڑیں گے۔



پہلے تو مرد اُسے گھور گھور کر دیکھا کرتے تھے، آج باجرہ مردوں کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی اور کسی سے پوچھنا جانتی تھی کہ آج زمانے کو کیا ہو گیا ہے، وہ اسی قدر محسوس کر رہی تھی کہ زمانے میں کوئی انقلاب آ گیا ہے۔ اُس نے سودا سلف لیا اور واپس چل پڑی۔ راستے میں صوبیدار اکبر علی مل گیا۔ باجرہ نے چاہا کہ اُسی سے پوچھ لے لیکن دل سے تحارت کا طوفان اُٹھ آیا۔ وہ اکبر علی سے مُنہ نہیں لگانا چاہتی تھی۔ وہ قریب آیا تو باجرہ نے مسنہ پھیر لیا۔ اُسے توقع تھی کہ وہ ابھی کوئی بھاس کرے گا لیکن اکبر علی یوں تیز قدم باجرہ کے قریب سے گزر گیا جیسے اُس نے باجرہ کو دیکھا ہی نہ ہو۔

باجرہ کے ذہن میں مغممہ اور اُکھج گیا۔

”بی بی جی! باجرہ نے گھر آکر اقبال کی ماں سے پوچھا ”آج کیا ہو گیا ہے، باہر سب لوگ بڑے غصے میں باتیں کر رہے تھے۔ کہتے ہیں ہندوؤں نے ایک مسجد پر گولے چلا دیے ہیں!“ اقبال کی ماں نے اُسے گجرات کے گاؤں اعوان شریف پر ہندوستانیوں کی گولہ باری کی ساری داستان دے دی اور اُسے بتایا کہ گاؤں میں بہت سے لوگ شہید ہو گئے ہیں۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ مسجد پر بھی گولے گرے ہیں۔

باجرہ نے اپنے آپ میں لرزہ محسوس کیا اور وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ ہانڈی کے لیے پیاز کاٹنے لگی تو اُس نے انگلیوں میں ریشہ محسوس کیا۔ اُس کے ذہن میں یہی ایک بات انک کے چہرہ پر تھی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے بچوں کو مارا ہے اور مسجد شہید کر دی ہے۔ باجرہ نے ہندو کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ اسی قدر جانتی تھی کہ ہندو مسلمان نہیں ہوتے۔ اُس نے نہ کبھی نماز پڑھی تھی نہ اُسے نماز پڑھنی آتی تھی نہ قرآن پڑھ سکتی تھی۔ پہلے مکے کے سواہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی لیکن اُسے یہ احساس ضرور تھا کہ وہ مسلمان ہے ہندو نہیں۔

اُس کی ذات میں ایک مسلمان لڑکی بیدار ہو گئی۔ اُس نے پیاز کاٹتے محسوس کیا کہ جس چھری کو وہ صاف کر کے والی سل پر رکھ کر استعمال کیا کرتی تھی، آج بغیر رگڑے پیاز میں تیزی سے گہری اُتر رہی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھوں میں اجنبی سی قوت محسوس کی۔ سینے کا لرزہ اور دل کا اضطراب بڑھتا چلا گیا سوالوں کا ایک عجم اُس کے ذہن میں بھگامہ بپا کرنے لگا۔ وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر سمجھ نہ پاتی کہ کیا پوچھے، کس طرح پوچھے، اور کس سے پوچھے! انوکھی سی بے قراری تھی جس کے زیر اثر وہ کسی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنا اور باتیں سننا چاہتی تھی۔

وہ اتنی جتنی اور سر کو جھٹک کر اپنے آپ کو ان اجنبیوں سے آزاد کر لینا چاہا سوچا جو مر گئے سو مر گئے، دنیا کے جہنم سے چھوٹے۔ خدا کرے ایک گولہ میرے سر پر بھی آ پھٹے، لیکن جو اجنبی سا بھگامہ اُس کے دل و دماغ میں بپا ہو گیا تھا اس سے وہ چھٹکارا نہ پاسکی۔ اعوان شریف کی شہید عورتوں بچوں اور مسجد کو ذہن سے نکال نہ سکی اور اس احساس کے تابع ہو گئی کہ جو کچھ ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا۔ اس کے ساتھ اُس کا کبھی کوئی تعلق ضرور ہے اور جو پاکستانی ہندوستانیوں کی گولہ باری سے شہید ہو گئے ہیں، وہ اُس کے کچھ نہ کچھ ضرور لگتے تھے اور جو عورتیں شہید ہو گئی ہیں وہ اُس کی ماں کی طرح کی عورتیں تھیں جو سردی سے اکڑ کر مر گئی تھیں۔ اُس نے سوچا کہ جب بھارتی توپوں کے گولے گاؤں کے گھروں میں پھٹے ہوں گے تو ان عورتوں نے اپنے بچوں کو اسی طرح اپنے سینے چھپایا ہوگا جس طرح اُسے ظالم سردی میں ماں نے اپنے جسم سے ڈھالیا تھا۔

اُس کے آنسو نکل آتے۔

اور مسجد! مسجد کا خیال آتے ہی اُس کی چھری پیاز کو کاٹتی اُس کی انگلی میں اُتر گئی۔ اُس کی انگلی سے لال سُرخ خون اُمد آیا اور وہ اپنے خون کو کھینچی باندھ کے دیکھنے لگی۔ اُس نے اپنا خون پی بار دیکھا تھا۔ وہ بہت دیر انگلی سے بہتے خون کو دیکھتی رہی اور انوکھا سا ایک تاثر اُس کے رگ وریشے میں سرایت کرتا چلا گیا پھر یہ اثر رُوح کی گہرائیوں میں اُترنے لگا۔ اس سے پہلے اس کے آنسو بہا کرتے تھے مگر آنسوؤں نے اُسے کبھی سکون نہ دیا تھا۔ آج خون کے چند قطرے بہہ گئے تو اُسے انوکھا سا قرار آ گیا۔ ایسا قرار جس کا ذائقہ اُس نے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔ اُس روز تک وہ رات کو لپٹتی تھی تو اُس کی آنکھ لگ جایا کرتی تھی لیکن اُس رات اُس پر ایسی کیفیت طاری رہی کہ وہ اچھی طرح سو بھی نہ سکی۔

☆

صبح اُس نے جو خبریں سنیں انہوں نے اُس پر بیجانی کیفیت طاری کر دی۔ وہ روزمرہ کے چکر میں بازار گئی۔ اُس روز بھی پھیڑنے والوں نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اُس نے چاہا کہ ان ہی سے پوچھ لے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے اور میں کیا محسوس کر رہی ہوں۔

”اب پاکستان کو دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ اُسے ایک آواز سنائی دی۔ ”جوانی حملہ کر دینا چاہیے۔“

باجرہ نے گھوم کے دیکھا۔ یہ ایک اوباش لونڈے کی عتاب آواز تھی۔

”ہندوؤں کو ہم کھل کے رکھ دیں گے۔ دوسرے نے کہا۔“

”خدا کی قسم ہم محاذوں پر جا کر لڑیں گے۔“ ایک اور خوشی آواز آئی

باجرہ کو پہلے تو شک ہوا جیسے یہ فقرے اُسی پر حسرت کیے جا رہے ہوں لیکن اُس نے بڑے غور سے دیکھا۔ ان لڑکوں کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر ہنسی نہیں تھی۔ اُسے ان کے چہروں پر وقار اور ولولہ نظر آ رہا تھا۔

سب سے انوکھی تبدیلی تو یہ تھی کہ پنواڑی کی دکان پر ریڈیو فلمی گانے نہیں سنا رہا تھا۔ ریڈیو خاموش تھا جیسے زمانہ ہی چپ ہو گیا ہو۔ جالندھر ریڈیو کے فلمی گانوں کا وادیا تو اس شہر کے بنگالوں کا لازمی جز ہوا کرتا تھا۔ یہ ایسا انقلاب تھا جس نے باجرہ کو پریشان کر دیا۔

بازار سے واپس آتے وہ دوسری گلی کی راہ چل پڑی۔ اس گلی سے وہ کبھی کبھی گزرا کرتی تھی۔ آج تو اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وزیر آباد کی ساری گلیوں اور سڑکوں پر گھوم کے دیکھے کہ واقعی زمانہ بدل گیا ہے اور اعوان شریف کے بچوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے سارا وزیر آباد بے تاب ہے!

وہ اس گلی میں گئی تو دیکھا کہ ایک مکان کے دروازے میں ایک اجنبی صورت جو اس آدمی کھڑا تین چار آدمیوں کو باتیں سنا رہا تھا۔ وہ خوب آدمی تھا چہرے کی سپیدی مائل گندمی رنگت پر چھوٹی چھوٹی سیاہ داہی خوب پھب رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر پیار سا تبسم اور آنکھوں میں دہنی سی چمک تھی۔

باجرہ ابھی دُور ہی تھی کہ اُس کے سامنے جو آدمی کھڑے تھے وہ چلے گئے اور وہیں کھڑا رہا۔ باجرہ اُسے بڑی غور سے دیکھ رہی تھی اور وہ آدمی اُسے دیکھ رہا تھا۔ باجرہ کو وہ غلام آدمیوں سے بہت ہی مختلف لگا۔ مرد تو ایک دوسرے سے مختلف ہوا جی کرتے ہیں۔ باجرہ سب آنکھوں میں ایک ہی



جیسا تاثر دیکھا کرتی تھی۔ اس آدمی کی آنکھوں کی چمک میں اسے وفار اور پاکیزگی سی نظر آتی۔ اس کے قریب پہنچی تو کسی غیبی قوت کے زیر اثر اس کے قدم رکنے لگے۔ اس کے ذہن میں سوالوں کے اُبھرتے ہوئے تیج و خم اسے پریشان کیے ہوتے تھے۔

”بھائی جی!“ ہاجرہ نے بے بس ساہو کے اُکھڑی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لوگ طرح طرح کی خبریں سنا رہے ہیں معلوم نہیں.... وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی جیسے اپنی آواز سے چونک اٹھی ہو۔ وہ آدمی اس کی سادگی اور جبینیت کو بھانپ گیا۔

”مہنیں معلوم نہیں بہن!“ اس نے انسیت سے کہا۔ ”ہندوؤں نے ہمارے ملک کے اندر آکر ایک گاؤں پر گولہ باری کی ہے۔ ہجرات کا ایک گاؤں....“ اور اس نے اسے اعوان شریف پر بھارتی گولہ باری کی تفصیلات سنا دیں۔ اس کے لب و لہجے میں بھولیوں کی سی اپنائیت تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اگر ہندو کھل کر حملہ کرتے تو پاکستانی مقابلہ کر۔ لیکن انہوں نے گولہ باری کی اور بھاگ گئے۔ دُکھ تو یہ ہے کہ عورتیں اور بچے مارے گئے ہیں۔ پاکستان کی ت اور بچے کو کوئی مینی آنکھ سے دیکھے تو ہم مروکٹ نہ مریں تو دُوب مرنا چاہتے۔“

ہاجرہ نے پہلی بار ایک مرد دیکھا جس نے عورت کی آبرورکٹ مرنے یا دُوب مرنے کی بات کی تھی۔ وہ ایک ہی جہت میں، خیالوں ہی خیالوں میں اس کی پلہ میں جا گری۔ وہ ایک ثانیے میں ڈری ہوئی کچی بن گئی۔ اس آدمی کے بولنے کے انداز میں کچھ ایسا تاثر تھا جس سے ہاجرہ کو محسوس ہونے لگا کہ اس کا کوئی بھائی ہوتا تو وہ ایسی ہی جو امردوں کی سی باتیں کیا کرتا۔ بے بس اور بے آسرا لڑکی بنوں کے سہارے ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کی محرومیوں اور ذہنی خلفشار نے اسے اس آدمی کا گرویدہ بنا ڈالا۔

”بھائی جی!“ وہ جھجک کے بولی۔ ”تم یہیں رہتے ہو؟“

”میں چند دن ہوئے یہاں آیا ہوں۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”میرا نام افضل ہے۔ میں مذہب کا طالب علم ہوں۔ یہاں ہمارے شہر کے ایک بہت بڑے عالم کی شاگردی کر رہی ہوں۔ یہ دو کمرے کرائے پر مل گئے ہیں۔“ وہ بولتے بولتے چونک اٹھا اور متانت سے کہا۔ ”تم جاؤ لڑکی اگلی میں اتنی دیر رکنی ٹھیک نہیں۔“

☆

وہ چپ چاپ گھر کو چل دی۔ راستے میں اس نے کئی بار گھوم کے دیکھا۔ افضل کا دلکش سراپا اور باتیں طلسم بن کر اسے مسحور کر رہی تھیں۔ گھر میں داخل ہوتی تو طلسم ٹوٹ گیا۔ اقبال کی ماں اور دونوں بہنیں حیران اور ششدر۔ کبھی بھتیجیوں پر مضطرب سی آواز کی تھی۔ ہاجرہ ٹھٹھک گئی اور پوچھ بپھر رہ نہ سکی۔ اقبال کی ماں نے اسے بتایا کہ اقبال لڑائی پر جا رہا ہے۔ اس نے ہاجرہ کو تفصیلاً بتا دیا کہ بھارتی فوجوں نے آزاد کشمیر کی دو فوجی چوکیوں پر قبضہ کر لیا ہے اور سرحدوں پر خطرہ بڑھ گیا ہے۔ کوئی پتہ نہیں کہیں وقت جنگ چھڑ جائے۔ بھائیوں نے پہلے اعوان شریف پر گولہ باری کی پھر پاک فوج کی خاموشی کو دیکھ کر ہماری چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ اقبال نے لکھا ہے کہ پاک فوج کو جوابی کارروائی کرنی پڑے گی۔

ہاجرہ اور اقبال کی بہنوں کو تو جنگ کی ہولناکیوں کا کچھ علم نہ تھا لیکن اقبال کی ماں کو کچھیں جنگ عظیم یاد تھی جس میں وزیر آباد اور گردونواح کے بے شمار جوان جانے کون کون سے دیں میں مائے گئے تھے۔ ہاجرہ سے

بات کرتے اس کی آواز رندھیا گئی۔

”ہاجو!“ ماں نے کہا۔ ”تم بھی دعا کرنا اللہ میرے بچے کو جہاں رکھے خیریت سے رکھے۔“ ہاجرہ اپنے دل کو ایسی دعا کے لیے آمادہ نہ کر سکی۔ اقبال نے اتنا ہی لکھا تھا کہ میں بنگالیوں کی بیٹن کے ساتھ آگے جا رہا ہوں۔ ہندوستان کی جارحانہ کارروائیاں بڑھ گئی ہیں۔ میرے متعلق پریشان نہ ہونا، دعا کرنا۔ ہاجرہ کو اقبال کے لڑائی پر چلے جانے کا ذرہ بھر رنج نہ ہوا، خوشی بھی نہ ہوئی۔ اقبال پہلا مرد تھا جس نے اسے پیار سے بلایا تھا مگر اس پیار میں جو فریب تھا اس نے اس کے دل میں اقبال کے خلاف نفرت بھر دی تھی۔ اس نے اسے پیار کے پردے میں فریب دینے کی کوشش کی تھی۔ اب افضل کو دیکھا تو اقبال کے خلاف نفرت اور شدید ہو گئی۔

☆

ہاجرہ کام کے بغیر کبھی باہر نہیں نکلی تھی لیکن اب وہ باہر نکلنے کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ پچھلے پہر اسے ایک بہانہ مل گیا۔ اس نے اقبال کی ماں سے کہا کہ اُسے آج اپنے گاؤں کی دولڑکیاں مل گئی تھیں وہ ان کے ہاں جانا چاہتی ہے۔

اُسے جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ اسی گلی میں چلی گئی جہاں اسے افضل ملا تھا۔ افضل کا دروازہ کھلا تھا اور وہ سامنے کمرے میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ہاجرہ دروازے کے سامنے رُک گئی۔ اندر جانے سے جھجک رہی تھی۔ افضل نے اسے دیکھ لیا اور مسکرا دیا۔ ہاجرہ کھچی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ افضل نے اُنھ کو دروازہ بند کر دیا۔

”بُرائے مانو تو کہہ دو!“ افضل نے متین سے لہجے میں کہا۔ ”میرے گھر میں کوئی عورت ہوتی، ماں بہن یا بیوی تو ہمارا یہاں آنا مناسب تھا مگر بس اکیلا رہتا ہوں اور لوگوں کے دل بڑے گندے ہیں۔ جو منہ میں آئے کہہ گزرتے ہیں۔ اپنی تو نہیں، مجھے تمہاری عزت کا خیال ہے۔ کبھی نے تمہارے خلاف ذرا سی بات بھی کہہ دی تو میں برداشت نہ کر سکوں گا۔“

ہاجرہ مسکرا دی۔ اس کی زندگی کی یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو مسرت سے لبریز تھی اور جس میں روحانی قرار تھا۔ اُسے ایک مرد مل گیا تھا جسے اس کی عزت کا خیال تھا ورنہ وہاں تو زمانہ ہی اس کی آبرو اور عصمت کا لیڈر تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”میری عزت کا کسی کو خیال نہیں افضل جی!“ اس نے کہا۔ ”مجھے تو ان مردوں نے گلیوں میں روک روک کر نیکی باتیں کہی ہیں۔ اب دو باتیں اور کہہ لیں گے تو میرا کیا بگڑ جائے گا۔ میرے تو نصیب ہی بگڑ گئے ہیں۔“

”تم کہاں رہتی ہو؟“ افضل نے پوچھا۔ ”تمہارے ماں باپ....“

”مر گئے ہیں اور میرا کوئی گھر نہیں۔“ ہاجرہ نے دکھیا ری سی آواز میں کہا۔ ”میں ایک گھر میں نوکرائی ہوں۔“

افضل کے چہرے کا تاثر یکسر بدل گیا۔ اُس نے ہاجرہ کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں رحم، ہمدردی اور اُفس تھا۔ اُس کے منہ سے آہ نکل گئی اور ہاجرہ کے آنسو بہہ نکلے۔

”تم بہت دکھی ہو۔“ افضل نے کہا۔ ”بعض دکھ کہہ لینے سے ہی ہلکے ہو جاتے ہیں۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ، شاید تمہاری دست گیری کر سکوں۔ سب دکھ اللہ کی طرف سے آتے ہیں اور وہی سب کا پاسبان ہے۔“ ہاجرہ سے کس نے کبھی پوچھا تھا کہ تم روکیوں رہی ہو؟ یا تم آداس کیوں ہو؟ آج افضل نے اُس کا درد اپنا درد سمجھ کر پوچھا تو ہاجرہ کا دل پسلیاں توڑنے لگا جیسے کبھی پیڑہ توڑنے کے لیے پھڑپھڑا رہا ہو۔ ہاجرہ نے اٹھا رہے انیس برسوں کی داستان غم سنا ڈالی۔ اُس نے ہچکیاں بھی لیں اور سسکیاں بھی، اور وہ افضل کو سناتی چلی گئی کہ زمانے نے اُسے کیسے کیسے دکھ مارے ہیں۔

افضل ہمہ تن گوش تھا اور سراپا ہمدردی بنا ہوا تھا۔

”میں تو کہتی ہوں کہ یہ تو خدا میری شکل و صورت کو اس طرح بگاڑ دے کہ کوئی مجھے آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھے یا یہ سارے آدمی اندھے ہو جائیں۔“ ہاجرہ نے آنسو پونچھ کے کہا۔ ”جب سے ہندوستانیوں کے حملے کی خبر آئی ہے انہیں آدمیوں کی توجہ مجھ سے ہٹی ہے ورنہ ان گلیوں اور بازاروں میں میرا چلنا پھرنا محال ہو گیا تھا۔“

”اب تمہیں کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھ سکے گا ہاجرہ!۔“ افضل نے مردانہ دہ بے سے کہا۔ ”میں مذہب کا طالب علم ہوں۔ ہمارا مذہب کہتا ہے کہ عورت کی آبروریزی نہ ہو کہ عورت قوم کی آبرورہوتی ہے۔“ ہاجرہ کے سینے کا غبار نکل گیا تھا اور یہ غبار جیسے افضل نے نکل لیا تھا۔ افضل کے انداز میں وہی پیار اور وہی شفقت تھی جو اُس کے ماں باپ اپنے ساتھ لیے، برسوں گزرے قبروں میں جاسوئے تھے آج اُس کی تشنہ حسیں سکون پذیر ہوئیں اور کھویا ہوا پیار مل گیا۔

”افضل جی!۔“ ہاجرہ نے جذبات سے بھرپور لہجے میں التجا کی۔ ”مجھ اپنے گھر نوکر رکھ لو۔ تمہاری ہانڈی روٹی کرتے مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ ننخواہ بھی نہ دینا۔“

”نہ ہاجرہ!۔“ افضل نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”زمانہ بہت بُرا ہے۔ تم جہاں ہو وہیں رہو۔۔۔ انسان انسان کے کام آتا ہے ہاجرہ! میں تمہارے ماں باپ کو قبروں سے نہیں نکال سکتا۔ نہ ناکے دکھ بانٹ سکتا ہوں۔ تمہاری مصیبت کو اپنے سر لے سکتا ہوں۔ مجھے اپنا سمجھنا لیکن مجھے غلط نہ سمجھنا۔ میں خدا کے کلام میں ڈوبا ہوا انسان ہوں۔“

ہاجرہ وہاں سے اٹھنا نہ چاہتی تھی۔ اُسے کسی کا ڈر نہ تھا۔ اُس کا دل بغاوت پر تڑپا ہوا تھا لیکن افضل کے اصرار پر وہ اٹھی اور باہر نکل گئی۔ سینے میں برسوں کا رُکا ہوا غبار نکل گیا تھا۔ اُسے باہر کی دنیا بدلی بدلی نظر آئی لگیں اور مکان ایسے دکھائی دینے لگے جیسے انہیں پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ فضا میں رُوح افزا نکھار تھا اور زمانے میں جیسے کوئی اور انقلاب آگیا تھا۔

وہ گلی سے نکل کر کھٹی سڑک پر گئی تو دیکھا کہ صوبیدار اکبر علی درودی پہنے تانگے میں سوار ہو رہا تھا ہاجرہ کو دیکھ کر تانگے سے اتر آیا اور اُس کی طرف چل پڑا۔ ہاجرہ نے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن اکبر علی نے اسے روک لیا۔

”ہاجرہ!۔“ اکبر علی نے کہا۔ ”میں فوج میں واپس جا رہا ہوں۔ شاید جنگ چھڑ جائے۔ تمہارے سرحدوں پر خطرہ ہے۔“ اُس کا سب دلچسپ ہونا تھا جسے ہاجرہ محسوس نہ کر سکی۔

”تو جانتا!۔“ ہاجرہ نے بے رخی سے کہا۔ ”میں نے کب روکا ہے۔“ اور طنز یہ بولی۔۔۔

”پاکستان کی فوج والوں کو سرحدوں کی رکھوالی کے لیے تم سے بڑھ کر اور کوئی شیر بہادر نظر ہی کہاں آیا ہوگا۔ دن بھر عورتوں سے چھیڑ خانی کرنے والے اعوان شریف کی عورتوں کے خون کا ضرور ہی بدلہ لیں گے۔“ اور وہ مُنہ پھیر کر چل دی۔

”ہاجرہ!۔“ اکبر علی نے کہا۔ ”غلطی قصور بخش دینا۔ معلوم نہیں خدا کو کیا منظور ہے۔“ لیکن ہاجرہ جا چکی تھی۔



دوسرے دن تک ہاجرہ بھول چکی تھی کہ صوبیدار اکبر علی دروی پہننے ہوئے اُسے ملا تھا اور اُسے کچھ کہہ کرتا تھے میں کہیں چلا گیا تھا۔ صرف ایک آدمی تھا جو اُس کے ذہن میں رتج بس گیا تھا۔ وہ افضل تھا۔ ہاجرہ کو تو جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ ایک جوان لڑکی کا ایک جوان آدمی سے ملنا مناسب نہیں۔ اُسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ لوگ جو دو چار دن پہلے تک اُس کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے اور اُسے لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے ہیں وہ اب بھی اُسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ افضل اور ہاجرہ کا کوئی خونی رشتہ نہیں لیکن ہاجرہ اس معاشرے کے معیار اور پیمانے کے مطابق نارمل لڑکی نہیں تھی۔ یہ تو صرف جسم تھا جو زیر آباد کی گلیوں میں چلتا پھرتا تھا یا لینڈنگز اقبال کے گھر نوکری کرتا تھا۔ ہاجرہ کی روح کہیں اور تھی۔ اُس کی نگاہ میں افضل جوان آدمی نہیں تھا نہ وہ خوب رو تھا، ہاجرہ نے اُسے صرف کیشش دیکھی تھی کہ اُس نے ہاجرہ کی عزت کی حفاظت کی بات کی تھی اور اُس نے یہ بات بڑے ہی پیار سے انداز میں کی تھی۔

ہاجرہ پیار کی تلاش میں بھٹکنے والی روح تھی۔ افضل سے ملنے کا کوئی اور بہانہ نہ تھا۔ ہاجرہ نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ سودا سلف لانے کے لیے بازار جانے اور آنے کا راستہ لمبا کر لیا تھا۔ افضل کا کمرہ اس لیے راستے میں آتا تھا۔

افضل کی جگہ کوئی اور آدمی ہوتا اور یوں تنہا رہتا تو لوگ ویسے ہی اُسے شکی نگاہوں سے دیکھتے لیکن افضل مذہب میں ڈوبا ہوا آدمی تھا جس کا زیادہ تر وقت جامع مسجد کے خطیب کی شاگردی میں گزرتا تھا۔ محلے کے اٹھ دس بچے اُس کے کمرے میں سپارے پڑھنے جایا کرتے تھے۔ افضل کا رکھ رکھاؤ اور لوگوں سے ملنے کا انداز اتنا پُر احترام تھا کہ اُس کے اخلاق اور کردار پر کسی کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ فضا میں پاکستان اور بھارت کی پہلی جنگ کی بو اتنی زیادہ پھیل گئی تھی کہ لوگوں نے اب ادھر ادھر دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہی لوگ جو ہاجرہ جیسی لڑکیوں کو کسی اور نظر سے دیکھا کرتے تھے اب انہی لڑکیوں کو وہ اپنی عزت سمجھنے لگے تھے۔ وہ ہنس دہ کی دشمنی کو جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ہندو اچانک ہی یا محض اتفاق سے پاکستانیوں کا دشمن نہیں بن گیا تھا۔ یہ دشمنی بڑی پرانی تھی۔ یہ اُس روز شروع ہوئی تھی جس روز راجہ داہر کے قلعے پر محمد بن قاسم کی

منہیقوں کا پہلا پتھر گرا تھا۔ پھر یہ دشمنی اُس وقت اور پکٹی ہو گئی تھی جب غزنی کے ایک مرد مومن نے ہندوؤں کے بُت توڑ کر بُت خانے اُجاڑا لے تھے اور پھر یہ دشمنی ایک قہر کی صورت اختیار کر گئی تھی جس روز ہندوستانی مسلمانوں نے "لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان" کا نعرہ لگایا تھا۔

ہندو نے پاکستان کو ختم کرنے کے لیے اٹھارہ برس اسلحہ بارود، لڑاکا بمبار طیارے اور جنگی بحری

جہاز اکٹھے کیے تھے۔ اُس نے نواپنے ملک کو بارود خانہ بنا ڈالا تھا اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ ایک ہی جگہ میں پاکستان کو نیست و نابود کر دے گا۔ وہ اس خوش فہمی میں حق بجانب تھا۔ اپنی جنگی طاقت آزمانے اور پاکستانیوں کا ردِ عمل اور موڈ پر کھنسنے کے لیے بھارتیوں نے رن کچھ میں پاکستانیوں کو لٹکایا۔ اُن کی توقعات کے بالکل الٹ پاکستانیوں کی تھوڑی سی فوری نے نہ صرف یہ کہ حملہ وک لیا بلکہ اُس علاقے کے تمام چھوٹے بڑے قلعوں پر پاک فوج کے جیالوں نے قبضہ کر لیا۔ بھارتیوں نے پورا ایک ڈویژن اپنی لاج رکھنے کے لیے جنگ میں جھونک دیا جسے ٹینکوں اور ڈویژن کے پورے توپ خانے کی پشت پناہی حاصل تھی۔ پاک فوج کے صرف ایک بریگیڈ نے دشمن کے پورے ڈویژن کو گھیرے میں لے لیا تب ہندو نے اپنا دوسرا حربہ استعمال کیا۔ اُس نے گھٹنے ٹیک کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس موقع پر پاکستانی حکمرانوں کی ایک کمزوری ابھر کر سامنے آگئی۔ انہوں نے فائر بندی قبول کر لی۔

پاکستان کے اس جانی دشمن نے اپنے ڈویژن کو بال بال بچا کر اعلان کر دیا کہ اب وہ پاکستان کو اپنی مرضی کے میدان جنگ میں لڑائے گا۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ دشمن ہمیں اپنی مرضی کے میدان جنگ میں لٹکا رہا تھا۔

یہ تو جنگی سطح کی باتیں ہیں جنہیں پاکستان کے شہری پوری طرح نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے سینوں میں ۱۹۴۷ء کی خونچکاں داستانیں ایک غبار بن کر بھری ہوئی تھیں۔ وہ اُس دشمن کو کیسے بھول سکتے تھے جس نے صرف مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کی ستر ہزار بیٹیاں اغوا کر لی تھیں اور قتل عام ایسا کیا تھا کہ تلج اور بیس مسلمانوں کے خون کے دریا بن گئے تھے۔ توقع نہیں تھی کہ پاکستانی یوں بارود کی طرح پکسٹ پڑیں گے اور وہ پلک جھپکتے مردانِ خرب جاتیں گے لیکن روایات جو مسلمانوں کے خون میں رچی بسی چلی آ رہی ہیں وہ آتش فشاں پہاڑ میں رُکے ہوئے لاوے کی طرح اُبل آئیں۔ یہی تو ہاجرہ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے اور کیا ہو گیا ہے اُن نوجوانوں کو جو اُسے قدم قدم پر روکتے تھے۔ اس انقلاب کو وہ کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ اب لوگوں کو ذہنی طور پر اتنی ہمت نہیں مل رہی کہ وہ اس پر غور کریں کہ ہاجرہ افضل کے کمرے میں اگر چند منٹ کے لیے جا رہی ہے تو کیوں۔ اگر لوگ غور کرتے تو بھی ہاجرہ کو لوگوں کی پروا نہیں تھی۔

ایک روز وہ پھر افضل کی گلی سے گزری۔ اُس کا دروازہ کھلا تھا اور وہ تین چار بچوں کو سپارے کا سبق دے رہا تھا۔ ہاجرہ کو دیکھ کر افضل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ہاجرہ کھڑی اُسے دیکھتی ہی رہی۔ "آؤ ہاجرہ! — افضل نے پوچھا۔" بیٹھو گی؟

ہاجرہ کے ماتھے پر سکن نمودار ہوئے اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اُس نے گردن کو کچھ ایسا خم دیا جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اس کمرے میں کیوں آگئی ہے۔

"قرآن مجید پڑھتی ہو؟" افضل نے پوچھا۔ ہاجرہ کی مسکراہٹ سمجھ گئی اور اُس کے چہرے پر مایوسی کی ہلکی سی جھلک آگئی۔ اُس نے نہایت آہستہ سے سر کو دایں بائیں ہلایا۔



”تم پڑھاؤ گے؟“ ہاجرہ نے بڑی پیاری سی آواز میں پوچھا اور افضال کا جواب سنے بغیر بولی۔ ”پر مجھے وقت ہی کہاں ملتا ہے۔ یہ تو دوسرے گزرتے تمہارے پاس آجاتی ہوں... افضال جی! سنا ہے ہندوؤں کے ساتھ بڑی زور کی لڑائی ہوگی۔ پھر کیا ہوگا افضال جی؟“

”جو اللہ کو منظور ہوگا۔“ افضال نے جواب دیا۔ ”تم لڑائی سے ڈرتی ہو؟“

”میں اُس دشمن سے نہیں ڈرتی جس نے ہمیں ہمارے وطن سے نکال دیا تھا۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”اگر ہماری فوج دلیری سے لڑے تو پھر میں بہت خوش ہوں گی... لیکن افضال جی! میرے مالکوں کا بیٹا اقبال اور صوبیدار اکبر علی بھی لڑنے کے لیے گئے ہیں۔ یہ لو فرھنگے کیا لڑیں گے؟“

”یہ اللہ کی سر زمین ہے ہاجرہ! افضال نے کہا۔“ اپنے اللہ پر بھروسہ رکھو اور لڑنے والوں کے لیے دعا کرتی رہا کرو... اب جاؤ۔“

ہاجرہ نے اُسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ جانا نہ چاہتی ہو لیکن اُسے جانا تھا۔



دو تین دن گزر گئے۔

ہاجرہ کو اور وزیر آباد کے لوگوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے کمانڈو جانباڑوں نے مقبوضہ کشمیر میں اپنی جانوں پر کھیل کر بھارتی فوج کی یہ حالت کردی تھی کہ تیل، پٹرول، گولہ بارود اور راشن کے ذخیرے تباہ کر دیئے گئے تھے۔ فوجی نقل و حرکت کے لیے کوئی ایک پل بھی سلامت نہیں رہے۔

تھا۔ بھارتی فوج نے پہاڑوں کی بلندیوں پر جو پوٹیس بنا رکھی تھیں وہ بھی تباہ کر دی گئیں۔ مقبوضہ کشمیر میں ہمارے چھاپہ ماروں نے بھارتی فوج کو اُس کی اپنی بارکوں میں قید کر دیا تھا۔ اب بھارت کی اس ہش ٹیٹ اور مضبوط فوج کا رشتہ بھارت سے اس طرح کا ٹٹا تھا کہ اسے کسی قسم کی مدد اور کمک نہ مل سکے۔

وہ مقام اکھنور تھا جس پر قبضہ کر لینے سے بھارت کے لیے کشمیر کا دروازہ بند ہو جاتا تھا۔

پاکستانیوں کو بیدار کرنے کے لیے خدا نے ایک موقع پیدا کیا تھا۔ زندہ اور باوقار قومیں ایسے مواقع خود ہی پیدا کر لیا کرتی ہیں۔ دشمن کو دشمن کہتے چلے جانے سے وہ کمزور نہیں ہو جاتا کرتا۔ دشمن پر نظر رکھی جاتی ہے اور جوں ہی نظر آتا ہے کہ وہ اپنے عزائم کی تکمیل کی تیاریاں کر رہا ہے تو اُس پر یاتو وسیع پیمانے پر حملہ کر دیا جاتا ہے یا جنگی پیمانے پر سرحدی جھڑپیں شروع کر دی جاتی ہیں۔

پاکستان کو تو دشمن نے خود ہی موقع دیا تھا کہ وہ دیکھے کہ اُس کے اندر جذبہ حب الوطنی اور ملی وقار رہ بھی گیا ہے یا نہیں۔ پاکستان کے ایوان حکومت میں یا پاک فوج کی ہائی کمانڈ میں معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے حکمرانوں کو قائل کر لیا کہ دشمن کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ضروری ہو گیا ہے۔ خدا نے حکمرانوں کے دماغ میں سے کرسی کی محبت نکال کر وطن کی محبت ڈال دی اور انہوں نے دشمن کا منہ بند کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ بھارت کے اُس وقت کے وزیر اعظم نے کہا تھا کہ وہ پاکستان کو اپنی پسند کے میدان جنگ میں گھسیٹ کر لڑائے گا لیکن پاکستانیوں نے اُس جگہ وار کر دیا جس کی دشمن کو توقع ہی نہیں تھی۔ یہ تھا چھمب جوڑیاں سیکٹر۔

چھمب جوڑیاں سیکٹر میں بھارت نے جو دفاعی لائن تیار کر رکھی تھی اسے وہ ناقابل تسخیر سمجھتا تھا۔ یہ فرانس کی میگنٹ لائن جیسا مضبوط دفاع تو نہیں تھا لیکن پاک فوج کو نفری کی کمی اور اسلحہ بارود کی کمتری کی

بی آ رہی رہے گی

وجہ سے بھارت کے سیاسی اور فوجی لیڈر بہت کمزور سمجھتے تھے۔ ایسا سمجھنے میں وہ جی بجا نہ تھے۔ وہ اسلحہ بارود کی برتری اور نفری کی افراط کو جنگی قوت کہتے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پاکستانی چھمب جوڑیاں سیکٹر جیسے آہنی دفاع کے ساتھ اُن کو کرائیں گے۔



۳۱ اگست اور یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کی درمیانی رات پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج نے دشمن کی اس مضبوط دفاعی لائن پر حملہ کر دیا۔ دشمن کا یہ دفاع چھوٹی بڑی قلعہ بندیوں اور دو دو تین تین منزلہ سینٹ کے بھجروں کی صورت میں تھا۔ یہ کئی میل دُور تک پھیلا ہوا تھا اور دور تیچھے تک بھی گیا ہوا تھا۔ اس دفاعی لائن کی مختلف پوسٹوں کو آپس میں لمبی خندقوں سے ملا لیا گیا تھا۔ اس سے دشمن کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ اُس کے ٹروپس ایک پوسٹ سے کل کردوسری پوسٹ تک اس طرح جا سکتے تھے کہ حملہ آوروں کو اس نقل و حرکت کا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ بھارت اس قدر مضبوط تھے کہ چھوٹی اور بڑی توپوں کے گولے ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ لیکن پاکستانی اس حملے سے کچھ دن پہلے ہی بھارت کے اس دفاع کا پتہ کچھ بگاڑ چکے تھے۔ پاکستان کی توپ خانہ جمٹیس رات کے اندھیرے میں توپیں دور آگے لے جاتیں اور گولہ بارود کی سحر کی تاریکی میں واپس آجاتی تھیں۔ پاک فوج کی یہ کارروائی غیر معمولی طور پر جرات مندانہ

تھی۔ توپ خانے کے اوپری جان کی بازی لگا کر دُور آگے چلے جاتے تھے اور اپنے توپ خانے کو فائر آرڈر دے کر صبح اور کارگر گولہ بارود کراتے تھے۔

۳۱ اگست ۱۹۶۵ء تک مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی جو ڈیڑھ دو لاکھ فوج تھی اُسے ہمارے کمانڈو جانباڑوں نے بیکار کر دیا تھا۔ ادھر ہمارے توپ خانے نے چھمب جوڑیاں کے دفاع کو بہت خدنگ توڑ پھوڑ ڈالا تھا جب پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج نے حملہ کیا تو بھارتیوں کا دفاع پاکستانیوں کی پیش قدمی کو روکنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ بھارتیوں کا مورال ہی ٹوٹ چھوٹ گیا۔ بھارت کا ایک نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔ اس میں بیٹھ کر لڑنے والے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے سپاہی نے سر سے پاؤں تک زرہ بکتر پہن رکھی ہو۔ بھارت میں صرف ایک گرنیڈ پھٹنے سے یا صرف دو تین گولیاں بھگنے کے اندر جانے سے بھگنے کے اندر والے سپاہی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ بھاگ کر جب بھگنے سے نکلنے میں تو اُن کی ذہنی کیفیت اُس سپاہی جیسی ہوتی ہے جس کی زرہ بکتر اُتار دی گئی ہو۔ زرہ بکتر اُتر جانے کی صورت میں سپاہی کلکریوں سے بھی ڈرتا ہے۔ کھلے میدان میں پیش قدمی کرنے والے حملہ آور پہلے ہی دلیر ہوتے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر موت کو قبول کر کے آتے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں بھجروں سے نکلنے ہوئے سپاہی خوفزدہ ہوتے ہیں۔ اُن میں لڑنے کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ کل بھاگنے یا ہتھیار ڈالنے کے سوا کچھ سوتل ہی نہیں سکتے کچھ ایسے ہوتے ہیں جن میں بھجروں سے نکلنے کی بھی جرات نہیں ہوتی۔ اُن کے بھگنے کے مقبرے بن جاتے ہیں۔

بھجروں کے اس نفسیاتی پہلو کے مظاہرے چھمب جوڑیاں سیکٹر میں دیکھے گئے۔ اس کا مطلب نہیں کہ بھجروں کے دفاع کو توڑنا آسان کام ہے۔ بھجروں کے دفاع پر حملہ کرنا جلتے تنور میں کود جانے کی مانند ہوتا ہے۔ پاکستان کے سرفروش جس طرح اس آتش فزد میں کود گئے تھے اس سے



دشمن پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ اُس کا لڑنے کا دم خم ٹوٹ گیا۔ پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج کا حملہ برق رفتار تھا۔ بھارت کے کمانڈروں کی چیخ و پکار وائرلیس سٹیوں پر صاف سنائی دے رہی تھی۔ اگلے روز یعنی یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کو دشمن نے اپنی سپاہیوں کی فوج کے کوال میں جان ڈالنے اور پاؤں جمانے کے لیے اپنی فضائی طاقت کا یہ مظاہرہ کیا کہ دن کے پچھلے پہر چھ لڑاکا بمبار طیارے ہمارے جانبازوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے بھیج دیتے۔ انہوں نے ہمارے ٹروپس پر راکٹ برساتے اور شین گن فائرنگ بھی شروع کر دی۔ پاک فوج کے ان ٹروپس نے اپنے فضائی بیڑے کو اطلاع دی۔ اتفاق سے پاک فضائیہ کے دو ہوا باز گجرات کی فضا میں کہیں معمول کی پرواز پر تھے۔ انہیں اپنے وائرلیس سسٹم پر آواز سنائی دی۔ ”دشمن کے طیارے ہم پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ جلدی پہنچو“

پاک فضائیہ کے ان دونوں ہوا بازوں نے چھمب سیکٹر کا رخ کر لیا۔ وہ ایسا معرکہ لڑنے جا رہے تھے جس میں اُن کی شکست یقینی تھی کیونکہ بھارت کے طیارے جدید تھے۔ اُن کی رفتار آواز کی رفتار تک پہنچتی تھی اور اُن کی رفتار بھی زیادہ تھی۔ پاک فضائیہ کے ان دو ہوا بازوں کے پاس سیر طیارے تھے جو بھارت کے طیاروں کی نسبت خاصے سست رفتار تھے۔ اُس وقت تک سیر کو قدیم طیارہ کہا جانے لگا تھا لیکن ہمارے ہوا باز اس عقیدے کے ساتھ جا رہے تھے کہ طیارہ نہیں۔ طیارے میں بیٹھا ہوا ہوا باز لڑا کرتا ہے۔ اُن دونوں نے بھارت کے چھ ہوا بازوں کو جالدارا۔ فضا طیاروں کی نشین گنوں سے گرجنے اور گوبخنے لگی۔ چند منٹوں میں معرکہ کا فیصلہ ہو گیا۔ بھارت کے چھ میں سے چار طیارے ہمارے ہوا بازوں کا نشانہ بن گئے۔ اُن کے پرچے چھمب کی فضا میں بکھر گئے۔ دشمن کے باقی دو طیارے بھاگ نکلے۔

پاک فضائیہ کے ان دونوں ہوا بازوں نے اپنی فوج کے مورچوں پر فائنل غوطہ لگا دیا۔ مورچے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے پھٹنے لگے۔ اپنے یہ دو طیارے ایسا کام کرتے تھے جیسے خدا نے پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج کے جانبازوں کے سروں پر اپنا ہاتھ رکھ لیا ہو۔ یہ دونوں ملکوں کے فضائی بیڑوں کا پہلا معرکہ تھا۔ پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے پاک فضائیہ کے لیے جرات کی ایک مثال اور ایک روایت قائم کر دی۔

ہمارے جانبازوں کے حوصلے اور زیادہ مضبوط ہو گئے۔ اُدھر دشمن نے جب دو کے ہاتھوں اپنے چھ طیاروں کا یہ انجام دیکھا تو اُس کے حوصلے میں ڈراسا جو دم خم رو گیا تھا وہ بھی نہ رہا۔

ملت پاکستان کو ابھی تفصیل سے نہیں بتایا گیا تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے اور ہمارے کتنے ہی جانباز پاکستان اور کشمیر کی آن پر جانیں قربان کر چکے ہیں۔ صدائے کشمیر ریڈیو صرف یہ بتاتا تھا کہ کشمیر کے حریت پسندوں نے مقبوضہ کشمیر میں گوریل جنگ شروع کر دی ہے اور وہ بھارت کی فوج کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ پاکستان کے ریڈیو اور اخباروں نے سرکاری ذرائع سے معمولی سی خبریں دیں کہ پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج نے مقبوضہ کشمیر کی فائر بندی لائن پر کچھ چوکیوں پر قبضہ کر لیا ہے لیکن اُس وقت تک چھمب سیکٹر

سے بھاگے ہوئے بھارتی فورسے راستے میں اپنے پندرہ اچھے بھلے ٹینک، تیرہ بالکل صحیح حالت میں توپیں، بے انداز اسلحہ اور ایمونیشن، دیگر جنگی سامان اور لاشوں کے انبار چھوڑ گئے تھے۔

پاکستان کے شہریوں کو ابھی یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ بھارت کی وہ کثیر تعداد فوج جس کی افراط پر اُس کے سیاسی اور فوجی لیڈروں کو ناز تھا اور تیجھے جوڑیاں تک پہنچ چکی ہے۔ جوڑیاں کا دفاع ایک بلندی پر تھا۔ اُس مقام کا نام ٹروٹی ہے۔ یہ دفاع اس لیے ناقابل تسخیر لگتا تھا کہ بلندی پر تھا اور دوسرے اس لیے کہ

وہاں بے انداز ٹینک شین اسلحہ اس طرح پوزیشن میں رکھا ہوا تھا کہ کسی طرف سے بھی اس دفاع پر ٹینک کا میاب حملہ نہیں کر سکتے تھے لیکن پاک فوج اور آزاد کشمیر کے جانبازوں نے اپنے طیاروں کی مدد سے یہ دوسرا مضبوط مورچہ بھی توڑ لیا۔ اب بھارتی بھاگے تو انہوں نے اکھنور جاد مایا۔

اخباروں میں لوگوں سے یہ اپیل کی جاتی تھی کہ کشمیر سے آنے والے مہاجرین کے لیے کپڑوں اور بستروں کی ضرورت ہے۔ آگے سردی کا موسم آ رہا تھا۔ لوگوں نے سنے گئے۔ رضائیاں، سویٹریں اور گرم کپڑے اس طرح جمع کر دیئے کہ ٹرک بھر بھر کر راولپنڈی اور آزاد کشمیر جانے لگے۔ کشمیر سے پناہ گزینوں کا ایک ریلا ۲۸-۱۹۴۷ء میں آیا تھا۔ اس قسم کا ایک اور ریلا اگست ستمبر ۱۹۶۵ء میں آنا شروع ہو گیا۔ ہمارے کمانڈو آپریشن کی سزا مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کو ملی۔ اُن کی بستیوں کی بستیاں جلا دی گئیں۔ اُن کے بچے سنگینوں اور گولیوں سے شہید کیے گئے اور اُن کی بیٹیاں اغوا کر لی گئیں۔ اس کے باوجود جب کشمیری پناہ گزین سرحدوں پر آکر دیکھتے تھے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی فوجیں کشمیر پر حملہ کر رہی ہیں تو وہ اپنے دکھ اور صائب بھول جاتے تھے اور کہتے تھے کہ اب ان کا وطن بھارتی استبداد سے آزاد ہو جائے گا۔ ان میں بعض سرحدوں پر آکر اپنی فوج کے پاس رُک جاتے اور کہتے تھے کہ کشمیر فتح کر دیا اعلان کر دو کہ کشمیر کے ساتھ پاکستان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ پاکستان میں کشمیر زبردستی کشمیر کا غرہ لگتا ہے تو مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کے دو تین گاؤں نذر آتش کر دیئے جاتے ہیں۔

اب تو ایسے لگتا تھا جیسے پاکستانی کشمیر فتح کر کے سی ڈم لیں گے لیکن پاکستان کی سیاست نے فوج کے جذبے پر اس طرح پانی پھیر دیا کہ اُس کیفیت میں جب دشمن صحیح معنوں میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اکھنور میں بھی اُس کے پاؤں نہیں چھیں گے، پاکستان کے بادشاہ نے اپنا ایک منظرِ غورِ نظر جنرل چھمب سیکٹر کی کمانڈ لینے کے لیے صرف اس لیے بھیج دیا کہ اتنی بڑی فتح کا سہرا جو پہلے ہی حاصل کی جا چکی تھی، اس جنرل کے سر بندھے۔ ڈوئین کا چارج لینے دینے میں تیرہ گھنٹے ضائع ہو گئے۔ میدانِ جنگ میں ایک ایک منٹ قیمتی ہوتا ہے۔ تیرہ گھنٹوں میں دشمن نے اکھنور میں اپنا دفاع مضبوط کر لیا اور بے انداز کھمک اکھنور کے دفاع میں مورچہ بند کر دی۔ اس کے علاوہ اُسی رات اپنی بے پناہ جنگی طاقت پاکستان کی سرحد پر لے آیا۔

پانچ ستمبر ۱۹۶۵ء دن کے ایک بجے لاہور کے گھر والے کھانا کھا چکے تھے اور لاہور برتن اٹھا رہی تھی۔ ریڈیو پاکستان سے اعلان ہوا۔ ”ایک ضروری اعلان سنیتے۔“ ضروری اعلان یہ تھا کہ آزاد کشمیر فوج نے پاک فوج کی مدد سے چھمب سیکٹر میں بھارت کے ایک مضبوط فوجی محکمہ جوڑیاں پر قبضہ کر لیا ہے۔



لیٹینٹ اقبال کا باپ چونک اٹھا۔ گھر کی عورتیں اُسے دیکھنے لگیں۔

”اب کیا ہوگا؟“ اقبال کی ماں کے مُنہ سے جیسے کی لگی گئی۔

”جنگ“ اقبال کے باپ نے کہا۔ ”ایسا ہونا ہی تھا۔“

”اللہ نہ کرے“ اقبال کی ماں نے کہا۔ ”میرے اقبال کا کیا بنے گا؟ معلوم نہیں وہ بے کمال۔“

”ابا جان!“ اقبال کی ایک بہن نے کہا۔ ”آپ بھائی جان اقبال کو تار دے دیں کہ امی سخت

بیمار ہیں۔ جلد ہی پہنچو۔ اس طرح انہیں چھٹی مل جائے گی۔“

”ماں ہاں تار دے دو۔“ اقبال کی ماں نے کہا۔ ”بکہ لکھ دو کہ منہاری ماں مر گئی ہے میں نے

سنا ہے کہ اس طرح فوجیوں کو فوراً چھٹی مل جاتی ہے۔ اُسے کھو کر بھی چھٹی لے کر گھر آجائے۔“

اقبال کا باپ اپنی بیوی کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرے مُنہ کی طرف کیا دیکھتے ہو؟“ اقبال کی ماں نے دبدبے سے کہا۔ ”ابھی جاؤ اور تار

دے آؤ۔“

”میں تمہارے مُنہ کی طرف دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم کس ملک کی ماں ہو۔“ باپ

نے کہا۔ ”خدا نے تم سے پاکستان کی وہ قیمت نہیں لی جو سرحد پار سے آنیوالوں سے لی تھی۔ ہزار ہا اقبال شہید

مو گئے تھے۔“

”تو کیا اپنے اکلوتے بیٹے کو شہید کراؤ گے؟“ ماں نے طنز بھرے غصے سے پوچھا۔

”نہ بگم صاحبہ!“ اقبال کے باپ نے کہا۔ ”اُسے گھر لاکر منہاری گود میں لٹا دوں گا۔“

”ابا جان!“ اقبال کی چھوٹی بہن نے کہا۔ ”فوج سے ایک آدمی کم ہو گیا تو کیا فرق پڑ جائے گا؟“

”دوسرے ملکوں کے ساتھ لڑائی لڑنے سے حاصل ہی کیا ہوتا ہے؟“ دوسری بہن نے کہا۔

”خواہ مخواہ اتنے جوان آدمی مارے جاتے ہیں۔“

”تم دونوں میری بیٹیاں ہو۔“ اقبال کے باپ نے کہا۔ ”مجھے ایسی بات کہنی تو نہیں چاہیے لیکن

نہ کہنے سے تم کچھ سمجھو گی بھی نہیں.... اگر قوم کے جوان اپنی جان اور خون کی قربانی نہ دیں تو تم دونوں اور تم

جیسی ہماری لاکھوں بیٹیاں دشمن کی عیاشی کا ذریعہ بن جائیں۔ اگر بہن اس طرح سوچتی کہ اُس کا بھائی فوج

میں نہ ہو تو کیا فرق پڑ جائے گا تو آج نقشے پر پاکستان کا نام و نشان نہ ہوتا.... زمانہ ایسا بدلا ہے کہ لوگوں

کی سوچیں ہی بدل گئی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کا بچہ اپنے ملک اور اپنے مذہب پر قربان ہونے کے

لیے پیدا ہوتا ہے۔ اقبال اگر شہید ہو گیا تو میرے لئے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی۔“

”تمہارے مُنہ میں خاک۔“ اقبال کی ماں بولی۔ ”شہید ہوں میرے بیٹے کے دشمن۔“

”تمہارے لئے تو میں ایک ہی دعا کرتا ہوں۔“ اقبال کے باپ نے کہا۔ ”خدا کرے اس گھر پر

انڈیا کا ایک بم گرے اور صرف تم زندہ رہو۔ پھر تم سمجھ جاؤ گی کہ مائیں اپنے بیٹوں کو کیوں شہید کراتی ہیں۔“

یہ کہہ کر باپ باہر نکل گیا۔

ہجرہ اُن سب کی باتیں سن رہی تھی اور اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اقبال کے کردار سے اچھی طرح

واقف تھی۔ دل ہی دل میں اُس نے دعا کی کہ ایک گولی اقبال کے سینے سے بھی پار ہو جائے۔ اس دھڑکنے سے

ایک گنا ہلکا رہا۔ بوجھ تو کم ہو جائے گا۔ اُسے خیال آ رہا تھا کہ اس قسم کی ماں کا بیٹا ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ

اقبال کو شہادت کے رتبے کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔



ہجرہ اس گھر کے کسی فرد سے پوچھنا چاہتی تھی کہ ریڈیو نے یہ جو ضروری اعلان کیا ہے یہ کیا تھا اور

اس میں کیا ضروری پن تھا لیکن اس اعلان نے گھر میں ماتم کی سی فضا پیدا کر دی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کچھ پوچھنا

چاہتی تھی۔ ایسے میں اُسے افضال کا خیال آ گیا لیکن فوری طور پر افضال کے پاس جانے کا کوئی بہانہ نہیں

تھا۔ یہ بہانہ اُسے شام سے کچھ دیر پہلے مل گیا۔ اُسے بازار سے کچھ لانا تھا۔ وہ حسب معمول افضال کی گلی

میں چلی گئی۔ اب تو لوگوں کے انداز بالکل ہی بدل گئے تھے۔ لوگوں کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی۔ ایک گلی میں اُسے

پانچ چھ آدمی کھڑے نظر آئے جن میں دو نوجوان تھے۔ وہ پاکستان اور ہندوستان کی لڑائی کی باتیں کر رہے

تھے۔ ہجرہ اُن کے قریب سے گزری۔ کسی نے اُسے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ہجرہ افضال کے کمرے میں جا پہنچی

افضال اُسے اکیلا مل گیا۔ اُس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

”افضال جی!“ ہجرہ نے اُس سے پوچھا۔ ”آپ نے بھی دوپہر کو ریڈیو کا اعلان سنا ہوگا۔“

”سنا تھا ہجرہ!“ افضال نے کہا۔

”کیا اعلان تھا؟“ ہجرہ نے پوچھا۔

”معلوم ہوتا ہے تم میری باتیں بھول گئی ہو۔“ افضال نے کہا۔

”میں کچھ بھی نہیں بھولی۔“ ہجرہ نے کہا۔ ”لیکن آج ریڈیو نے نئے نام لے رہا تھا۔“

”چھب اور جوڑیاں!“ افضال نے کہا۔ ”میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔“

اپنے پاس بٹھا کر افضال نے اُسے بتانا شروع کر دیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ بہت سی باتیں تو وہ اُسے

پہلے ہی بتا چکا تھا۔

”اب تمہارا کشمیر آزاد ہو جائے گا۔“ افضال نے کہا۔

”تو کیا میں واپس اپنے وطن چلی جاؤں گی؟“ ہجرہ نے بچوں کے سے اشتیاق سے پوچھا۔ ”اور یہ

جو ہزاروں کشمیری یہاں ٹھہر گئے اور احاطوں میں پڑے ہیں کیا یہ بھی اپنے وطن کو چلے جائیں گے؟“

”ہاں ہجرہ!“ افضال نے کہا۔ ”تم جانا چاہو گی تو چلی جانا۔ وہ تمہارا اپنا وطن ہوگا۔“

”افضال جی!“ ہجرہ نے افضال کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پوچھا۔ ”تم بھی میرے

ساتھ چلو گے؟“

”کمو گی تو چلا چلوں گا۔“ افضال نے جواب دیا اور اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

ہجرہ اپنے آپ کو قوم کا اہم فرد سمجھنے لگی۔ اُس کے دل میں پاکستان اور کشمیر کا پیار پیدا ہو گیا اور افضال

پاکستانی خودداری کی بڑی پیاری علامت بن گیا۔ اُس کی نظریں افضال کے چہرے پر جم گئیں۔ اُس پر خود پسندی

کی ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ اُسے اپنے آپ پر اختیار نہ رہا۔ اُس کا سر اپنے آپ ہی افضال کے کندھے

پر چلا گیا۔ افضال کی انگلیاں ہجرہ کے ریشم جیسے بالوں میں رینگنے لگیں۔ ہجرہ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ یہ مرد

کے جسم کے پہلے لمس کا اثر تھا یا اُس پیار اور اہمیت کا اثر تھا جو اُسے افضال نے دی تھی کہ ہجرہ مدھوش سی

ہو گئی۔ اُس کی انگلیاں افضال کے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں الجھ گئیں۔



”پاکستان“ کسی بچے نے چلا کر کہا اور دس بارہ بچوں نے نعرہ لگایا۔ ”زندہ باد“ — ہجرہ ہدک کر  
افضل سے پرے ہٹ گئی۔ اُس کا دل اتنی زور سے تڑپنے لگا جیسے پلایا توڑ کر باہر آجائے گا۔ ہجرہ  
کی وارفتگی اور خود سپردگی ایسے خوف کی صورت اختیار کر گئی جیسے وہ چوری کرتے پڑا گئی ہو۔ افضل کے  
ہونٹوں پر کراہٹ تھی۔

”تم ناراض تو نہیں ہوتے افضل جی!“

”نہیں ہجرہ!“ — افضل نے کہا۔ ”ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں لیکن ہجرہ! میرے پاس اتنی  
زیادہ نہ آیا کرو۔“

”کہتی تو میں بھی یہی ہوں“ — ہجرہ نے کہا۔ ”لیکن اپنے آپ کو آنے سے روک نہیں سکتی۔“

شام کو جب ہجرہ گھر والوں کو کھانا کھلانے کے لئے ڈونگوں میں سالن ڈال رہی تھی تو اُس کے جی میں  
آئی کہ ایک پیٹ سالن افضل کو بھی دے آتے لیکن کیسے؟ گھر والوں کو کیا بتاتے گی کہ سالن کسے دینے  
جاری ہے؟ وہ افضل کے لیے چوری چھپے کھانا لے جاسکتی تھی لیکن اُس کا دل چوری پر آمادہ نہ ہوا۔ اُس  
کی اپنی بھوک جیسے مری گئی تھی۔ رات اُسے نیند بھی نہ آتی۔ ذرا سی دیر کے لیے آنکھ لگی تو خواب میں بھی اُس  
نے افضل کو دیکھا۔ آنکھ کھلی تو افضل کو ہی بچوں میں چھپا دیکھا۔ رات کا آفری پہر تھا جب اُس کی آنکھ لگ گئی۔  
جب ہجرہ کی آنکھ لگی اُس وقت رات گزر چکی تھی بحر کی تاریکی ابھی گہری تھی — ادھر ہجرہ کی آنکھ  
لگی ادھر لاہور کے سرحدی دیہات کے لوگ انڈین آرمی کے ”جے کاروں“ اور چھوٹے ہتھیاروں کے غار  
سے ہڑا کر جاگ اُٹھے۔ انڈین آرمی کے سُرے جو پاکستان کو فتح کرنے آتے تھے سرحد کے ہتے دیہاتیوں  
کے گھروں میں گھس کر ۹۴ اکی یاد تازہ کرنے لگے۔ انہوں نے مردوں کو الگ اور عورتوں کو الگ کر لیا۔ ان  
ہتے اور معصوم دیہاتیوں پر انڈین آرمی کے افسروں اور جوانوں نے ہر وہ ظلم کیا جو ان کے دماغ میں آیا یہی  
ہندو کی خصلت ہے جنگجو قوم ہتھوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتیں لیکن ہندوؤں کے دلوں میں پاکستانیوں کی  
اس قدر نفرت بھری ہوتی ہے کہ وہ سلمان کے دودھ پیتے بچے کو بھی قتل کر کے فخر اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔  
بھارت نے بے پناہ جنگی قوت سے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا کشمیر کو بچانے کے لیے بھارتیوں کے  
پاس یہی ایک حربہ تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیتے۔ وہ انہوں نے کر دیا۔ دشمن کا حملہ چونکہ اچانک تھا اور اُس کی  
نفری اور جنگی قوت پاک فوج کی نسبت پانچ گنا سے زیادہ تھی اس لیے پہلے بے میں ہمارے کئی افسر اور جوان شہید  
ہو گئے۔ سب سے زیادہ نقصان ریخڑ کا ہوا جن کے پاس صرف رائفلیں اور لائٹ مشین گنیں تھیں۔ دشمن کی لیغا  
بڑھتی آ رہی تھی — اور وزیر آباد کا شہر گہری نیند سو یا ہوا تھا۔

یہ چھ مئی ۱۹۶۵ء کی صبح تھی۔ ہجرہ علی الصبح اُٹھی۔ اُس کے چہرے پر شرب بھاری کا اثر صاف نظر آ رہا  
تھا۔ وہ ناشتے کا سامان لینے کے لیے بازار چلی گئی۔ گلیوں میں آتے جاتے لوگوں کو ابھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ بھارت  
نے پوری طاقت سے لاہور پر حملہ کر دیا ہے۔ دو جیٹ طیارے گرجدار زماٹے سے وزیر آباد کے اوپر سے  
گزر گئے۔ ہجرہ نے طیارے تو کئی بار وزیر آباد کے اوپر سے گزرتے دیکھے تھے لیکن اُن کی آواز اس قدر

بھیاںک نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دُور سے دو دھماکے سنائی دیتے۔

”جمازوں نے کہیں بم گراتے ہیں“ — کسی کی بلند آواز سنائی دی — ”یہ ہندوستان کے جہاز تھے۔“

شہریوں کے لیے ہوائی جہاز ہوائی جہاز تھا، وہ اپنے اور پرانے ہوائی جہاز کو پہچان نہیں سکتے تھے۔  
دو اور طیارے زماٹے سے گزر گئے۔ وزیر آباد کے لوگ نہ پہلے طیاروں کو پہچان سکے نہ بعد میں گزر جانے والے  
طیاروں کو۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وزیر آباد سے پانچ ہی میل دُور دھونگل ریلوے سٹیشن پر جو مسافر گاڑی  
رُکی کھڑی تھی، انڈین ایئر فورس کے یہ طیارے اس مسافر گاڑی پر راکٹ اور شین گن فائرنگ کر گئے ہیں۔ اس  
ہوائی حملے میں کئی مسافر زخمی اور چار شہید ہو گئے تھے شہید ہونے والوں میں ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔

انہی دو طیاروں نے یا بعد میں آنے والے دو طیاروں نے دھونگل کے قریب دو اور چھوٹے چھوٹے  
ریلوے سٹیشنوں — گنگھڑ اور راہوالی — پر کھڑی ریل گاڑیوں پر راکٹ اور بم برسائے۔ پاک فضائیہ کے دو ہوا باز  
قریب کہیں اُڑ رہے تھے۔ انہیں پیغام ملا کہ دشمن کے طیارے ریلوے سٹیشنوں پر حملے کر رہے ہیں پاک فضائیہ  
کے دونوں ہوا باز وزیر آباد کی فضا میں پہنچ گئے اور انہیں دشمن کے طیارے نظر آ گئے۔ پاکستانی ہوا باز ان پر  
جھپٹ پڑے۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے دشمن کے ایک طیارے کو مار گرایا اور ہتے مسافروں کے خون کا  
انتقام لے لیا۔ دشمن کے باقی تین طیارے بکھر کر اُس دیس کو بھاگ نکلے جس دیس میں گنگا بہتی ہے۔

وزیر آباد کے لوگوں کو کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ ایک ہولناک جنگ ایک ہی اُڑان میں اُن کے دروازے  
تک پہنچ گئی ہے۔ دھونگل، گنگھڑ اور راہوالی کی طرف سے آنے والی بسوں کے مسافروں نے ریلوے سٹیشنوں  
پر انڈین ایئر فورس کے طیاروں کے حملے کی خبر وزیر آباد پہنچائی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر وزیر آباد کے گھر  
گھر میں پہنچ گئی۔ وزیر آباد کے ماحول میں حیاں کا طوفان آ گیا۔ ہر کسی پر غصے اور انتقام کی ایسی کیفیت طاری  
ہو گئی جیسے ہر کسی کا کوئی قریبی عزیز قتل ہو گیا ہو۔ کئی لوگ دوڑتے ہوئے بسوں پر جا چڑھے اور ان تینوں ریلوے  
سٹیشنوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ نوجوان لڑکے اور طلبہ سائیکلوں پر ہی ان سٹیشنوں کی طرف یوں چل پڑے جیسے یہ  
سائیکل ریس ہو۔ وزیر آباد کا ہر شہری بھک سے اُڑ جانے والا بارود بن گیا تھا۔

”کافروں نے ہمارے گھر بس آ کر بم گراتے ہیں۔“

”ہندو کی یہ مجال!“

بچل کر رکھ دیں گے۔“

”شہیدوں کے خون کے ایک ایک قطرے کا انتقام لیں گے۔“

اور ایسی ہی کئی غلیظ اور سخت جوشی آوازیں نعرے بن کر وزیر آباد کی گلیوں سے اُٹھ اُٹھ کر اُس فضا کو  
مزعش کر رہی تھیں جس میں سے تھوڑی دیر پہلے بھارت کے چار لڑاکا بمبار طیارے گزر گئے تھے۔ یہ احساس  
انہیں دیوانہ بناتے جا رہا تھا کہ انہیں طن کی آن پرکٹ مرنا ہے۔ وہ رہ رہ کر آسمان کی طرف یوں دیکھتے تھے  
جیسے انڈین ایئر فورس کے طیارے پھر آئیں گے اور وہ ان طیاروں کو فضا میں ہی بھسم کر دیں گے — لیکن  
کس طرح! دشمن کے طیاروں کے پر شہری کس طرح لوچ سکتے ہیں؟

یہی ایک سوال تھا جو وزیر آباد کی فضا میں منڈلانا پھر رہا تھا۔ لوگوں کی بے چین آنکھوں میں جوش اور جذبے  
سے اکھڑی ہوئی سانسوں میں اور دل کی دھڑکنوں میں یہی ایک سوال مبلدلا رہا تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا جو انہیں اس



سوال کا جواب دیا۔ انہوں نے جنگ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُن کے ملک پر کبھی حملہ نہیں ہوا تھا، لیکن ہر آدمی ہر عورت اور ہر بچہ جس کا شعور بیدار تھا، محسوس کر رہا تھا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے، یہ ان کے لیے نیا تو ضرور ہے لیکن عجیب اور غیر مانوس نہیں۔ جیسے ان کے ساتھ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہو، جیسے باطل نے پہلے بھی حق پر چھینا مارا ہو۔ ان لوگوں میں جو اپنی تاریخ سے واقف تھے وہ سمجھتے تھے کہ یہ اسلام اور کفر کا ایک اور معرکہ ہے اور یہ اُن معرکوں کی ایک کڑی ہے جو چودہ سو سال سے لڑے جا رہے ہیں بعض نے اسے ایک اور صلیبی جنگ کہا۔

جو لوگ کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے، انہیں از خود ہی اشارے ملنے لگے کہ اس صورت حال میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ کسی نے کہہ دیا کہ ٹرک پر فوجی ٹرک لاہور کی طرف جا رہے ہیں۔ لوگ پھول، پھل، شربت، طرح طرح کی تہلیں، انگور کی پیٹیاں، مرغیاں، انڈے، روٹی اور برف کے بلاک اٹھاتے اُس ٹرک پر جا پہنچے جو شاہراہ پاکستان کہلاتی ہے۔ انہوں نے فوج کا ایک ٹرک دیکھا تو اُسے روک لیا، پورا کنواٹے دیکھا تو اس کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ وہ جو کچھ ساتھ لاتے تھے، فوجی ٹرکوں میں پھینکنے لگے۔

”خدا کے لیے ہمیں نہ روکو“۔ فوجی چلا چلا کر کہتے تھے۔ ”رُکنے کا وقت نہیں ہم مر گئے تو تم محاذ پر جانا“۔ لوگوں نے وقت کی ضرورت اور فوجی ڈسپلن کی پروا نہ کی۔ وہ اپنے جذبوں کی تسکین کر رہے تھے۔ کئی نوجوان ٹرکوں پر چڑھ بیٹھے کہ ہم بھی محاذوں پر جاتیں گے۔ عورتیں دور کھڑی دوپٹے پھیلا کر فوجیوں کے لیے دعا مانگ رہی تھیں۔ ”شاستری مُردہ باد۔ پاکستان زندہ باد۔ پاک فوج زندہ باد“ کے نعرے مبوں کی طرح پھٹ رہے تھے۔ اب فوجی ٹرک چلے تو اُن کی چال ہی زلی تھی اور فوجیوں کے چہرے جذبہ حب الوطنی سے دھنکے لگے تھے۔



باہرہ نے اُس روز بازار میں سودا سلف خریدتے کچھ زیادہ ہی وقت لگا دیا۔ وہ لوگوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی لیکن گھڑائی تو وہاں مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ گھر والوں سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اُسے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے۔ وہ توبہ سیدی سادی لڑکی تھی۔ وزیر آباد کے بڑے بڑے دانشمندیوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ انڈین آئرن فورس کے راکا بمباریادوں نے ان چھوٹے چھوٹے ریلوے سٹیشنوں پر کھڑی ہنترے ریل گاڑیوں کو کیوں نشانہ بنایا ہے۔ یہ بھارت کے جاسوسوں کا کمال تھا۔ وزیر آباد کے لوگوں کے دہم دھماکے میں بھی نہ تھا کہ اُن کے فلک شگاف نعرے اُن سرگوشیوں کو نہیں دبا سکتے جو اسی شہر میں سے اٹھ کر سرحد پار بھارت کی اٹلی جنس تک پہنچ رہی تھیں۔ اتنی دُور تک یہ سرگوشیاں نعروں سے بھی بلند آواز میں سنائی دے رہی تھیں۔ بھارت کے یہ طیارے خود نہیں آتے تھے، بلاتے گئے تھے۔ سحر کی تاریکی میں لاہور ریلوے سٹیشن سے ایک مال گاڑی روانہ ہوئی تھی جس میں فوجی سامان اور گولہ بارود بھرا ہوا تھا۔ اس گاڑی کی منزل سیالکوٹ تھی۔ اسے وزیر آباد کے راستے سیالکوٹ تک پہنچنا تھا۔ بھارت کے جاسوسوں نے سرحد پار اس گاڑی کی روانگی اور اس کی جنگی اہمیت کی اطلاع دے دی تھی۔ اس گاڑی کو راستے میں تباہ کرنے کے لیے انڈین آئرن فورس کے طیارے ایسے وقت نیچے گئے جو صبح طلوع ہونے کا وقت تھا۔ بھارت کے جہازوں نے بالکل صحیح اطلاع بھیجی تھی، لیکن اس اطلاع پر عمل کرنے والوں سے کچھ کوتاہی ہو گئی۔ حملہ آور طیارے اُس

وقت آئے جب یہ مال گاڑی وزیر آباد ریلوے سٹیشن پر کھڑی تھی یا کہیں رُکے بغیر وقت سے پہلے خطرے سے نکل گئی تھی۔ جب بھارت کے ہوا باز آئے تو اپنے اصل شکار کو نہ پا کر اس علاقے میں جہاں کہیں کوئی ریل گاڑی کھڑی دیکھی انہوں نے اسی پر راکٹ یا بم گوا دیتے۔ انہیں توقع تھی کہ وہ گاڑی انہی سے کوئی ایک ہوگی۔

صرف وزیر آباد میں ہی نہیں تمام پاکستان میں لوگوں کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ پتہ چلا کہ محاذ کے رزمیوں کے لیے خون کی ضرورت ہے۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اور مریض بھی ہسپتالوں، ریلوے اسٹیشن کے مرکزی دفاتروں میں جا پہنچے اور اپنی رگوں سے خون نکلوا کر خون کے تالاب جمع کر دیتے۔ وزیر آباد کی تو یہ کیفیت تھی کہ جن کے پاس سکوتر، موٹر سائیکل یا گاڑی تھی وہ اپنے ساتھ جتنے بھی آدمیوں کو بٹھا سکتے تھے بٹھا کر خون دینے کے لیے لاہور چلے گئے۔ وہ لڑکیاں جو بچوں میں مستور اور چار دیواری میں بند رہتی تھیں اور وہ لڑکیاں جو بال کھاتے تنگ لباس میں نیم عریاں نظر آتی تھیں، ایک مرکز پر جمع ہو گئیں۔

”ہیں کوئی کام بناؤ“۔ ان سب کا ایک ہی مطالبہ تھا۔ ”ہیں اُن ہسپتالوں میں بھیج دو جہاں محاذ کے رزمیوں کو لایا جاتا ہے۔“

نوجوان جو راہوں میں کھڑے ان لڑکیوں سے چھڑ خانی کو جینے کا مقصد سمجھتے تھے اور جن کا کردار لذت پرستی سے مرکب تھا وہ انہی لڑکیوں کے دوش بدوش شہری محاذ پر یکجا ہو گئے۔ جنس مٹ گئی مرد مٹ گیا، عورت مٹ گئی اور ایک فرد نے جنم لیا جس کا نام پاکستانی تھا۔ تمام تر جذبات اور احساسات انڈین آئرن فورس کے پہلے حملے سے ایمان کی کھٹی میں کھل کر ایک نئے سانچے میں ڈھل گئے جسے جذبہ حریت کہتے ہیں۔

پاکستان مردانِ عر کا وطن بن گیا۔

کسی نے کہہ دیا کہ وطن کے دفاع کے لیے پیسہ چاہیے تو لوگوں نے عیاشیاں اور روزمرہ کی ضرورتیں بھی ملٹوی کر دیں اور اپنی توفیق سے بڑھ کر بیگوں میں روپے پیسے کے انبار لگا دیتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی بچیوں کے جہیز کے زیورات دفاعی فنڈ کے حوالے کر دیتے جس کے پاس پیسہ نہ تھا اُن نے آٹے کا کنستری دے دیا۔ جگہ جگہ قطاریں نظر آنے لگیں۔ خون دینے کے لیے قطاریں، پیسے جمع کرانے کے لیے قطاریں، فوجیوں کے لیے تحفے تیار کرنے کے لیے قطاریں شاہراہ پاکستان کے دونوں طرف فوجیوں کو نعرے لگا کر رخصت کرنے کے لیے قطاریں۔

قوم قطار اندر قطار منظم ہو گئی۔ قوم نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔

شام سے کچھ پہلے باہرہ کو بازار جانا پڑا۔ یہ تو وہ مین چار وٹوں سے دیکھ رہی تھی کہ اُسے چھڑنے والے اُس سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ اُس نے ایک اور انقلاب دیکھا۔ کہیں سے کسی فلمی گیت کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ پنوار کی دکان کے سامنے سے گزری تو اُس کے ریلوے باہرہ کو جوشیلا ترانہ سنائی دیا۔

اے مدد مجھ بجاں ذرا اب وقت شہادت ہے آیا

الہ اکبر اللہ اکبر

وہ جدھر بھی گئی اُسے جنگی ترانے سنائی دیتے۔ وہ ایک گلی میں سے گزرتی تھی تو عام سنی شہری کی آواز چار



پاکستان کو اس قابل بننے ہی نہیں دیں گے کہ وہ ہمارا ایک بھی دارسہہ سکے۔  
 مہاتما گاندھی تو یہی کہتے کہتے مر گیا۔ پاکستان کے وجود کو بھارت کی تاریخ کسی قیمت پر تسلیم  
 نہیں کر سکتی۔

بھارت کے ان حکمرانوں نے اٹھارہ برس اپنی رعایا کو جھوٹا ننگارکھ کر چھتمبر ۱۹۶۵ء کے حملے کے لیے اسلحہ بارود جمع کیا تھا۔ انہوں نے لوگوں کی خُون پسینے کی کمانی پر ظالمانہ ٹیکس لگا کر فرانس، برطانیہ اور روس سے جدید لڑاکا بمبار طیارے خریدے تھے۔ امریکہ کو چین کا بھوت دکھا کر دُور مارتوبیس لی تھیں اور امریکہ کے جنگی ماہرین سے نوٹین ڈویژن تیار کراتے تھے۔ ہمارے دشمن نے دس لاکھ فوجیوں کو چھتمبر ۱۹۶۵ء کے لیے ہی پالا ہوا تھا۔ امریکہ نے بھارتیوں کو اسلحہ بارود کے وہ بند کس بھی دے دیتے تھے جو پاکستان کی فوجی امداد کے لیے اُلک رکھے ہوئے تھے۔

ادھر لاہور کے دفاع میں لڑنے والے ڈوئین کے کمانڈر نے ”آرڈر آف دی ڈے“ دیا —  
 ”پاکستان! آخری سپاہی تک، آخری گولی تک لڑو۔ بگنیوں سے، خالی ہاتھوں سے، ناخونوں سے لڑو۔ اپنے  
 وطن کا ایک انچ بھی دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو۔“

آج اس کی روانی میں دشمن کی توپوں اور ٹینکوں کے گولے پھٹ رہے تھے اور ٹینک اس نہر کو پھلانگنے کے لیے پلوں کی طرف دھاڑتے چلے آ رہے تھے۔ نہر کا پانی اچھل اچھل کر دشمن کے گولوں کو ٹھنڈا کرتا چلا جا رہا تھا اور پلوں پر پاک فوج کے جیالوں نے جان کی بازی لگا دی تھی۔ وہ نہر جو پاکستانیوں نے اپنا پسینہ بہا کر کھودی تھی۔ آج ان سے خون کے نذرانے مانگ رہی تھی۔ پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ بری کھیتیوں میں سے گزرتی یہ نہر پاک فوج کے لیے اپنی بہن کی مانگ بن گئی تھی اور اس مانگ کی لاج رکھنے کے لیے پاک فوج کے پیادہ دستے دشمن کے ٹینکوں کے سامنے گوشت پوست کی بارودی سرنگیں بن گئے تھے۔

ماجرہ آگے گئی۔ دونوں جوان رُکے آرہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں بالیاں اویسیلچے تھیں۔ اُسے چھڑنے والوں کی فہرست میں یہ دونوں نوجوان شامل تھے۔ یہ اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکی گونگی ہے۔ ماجرہ انہیں دیکھ کر ایک طرف ہو گئی۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ ان دونوں میں کوئی تبدیلی آئی ہوگی، لیکن وہ اس طرح اُس کے قریب سے گزر گئے جیسے اُنہوں نے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ اُن دونوں کے قدموں میں تیزی اور چہروں پر ایسا تاثر تھا جیسے اُن کے گھر کو آگ لگ گئی ہو۔

”اے آر۔ پی پوسٹ پر سامان اکٹھا کر رہے ہیں۔“ لڑکے نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا ”معلوم نہیں کس وقت شہر پر بمباری ہو جاتے۔ زخمیوں کو بلے سے نکالنے کے لیے سامان پورا ہونا چاہیے۔“  
 ہجرہ اُس کے قریب رُک گئی۔

ماجرہ کے جی میں آتی کہ اس لڑکے کا منہ چوم لے حالانکہ اس لڑکے نے ایک بار اس کا دوپٹہ کھینچ کر مر سے اتار دیا تھا۔ آج یہ تمام لڑکے اُسے افضال کی طرح اچھے لگنے لگے۔ اُس کے جی میں آتی کہ وزیر آباد کے ہر گھر میں جائے اور اپنے جیسی جوان لڑکیوں سے کہے۔ ”ہم گریں تو گھر کا نام نہیں۔ لڑکے سنبھال لیں گے۔“

چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کی دوپہر تک دشمن کی اس طوفانی یلغار کو روک لیا گیا تھا لیکن ابھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بھارتی لشکر نہر کے پار ہی رکا رہے گا۔ بھارتی حکومت نے پاکستانی قوم کا جذبہ مجروح کرنے کے لیے ایک تو اپنے ریڈیو سے یہ بے بنیاد خبر نشر کی تھی کہ انڈین آرمی لاہور پر قابض ہو گئی ہے، ہندو لیڈروں نے دوسرا کمال یہ کر دکھایا کہ برطانیہ کے نشری ادارے بی بی سی سے بھی یہی خبر نشر کروادی۔ دشمن اٹھارہ برسوں سے پاکستان کو ختم کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بھارت کے پہلے وزیر خارجہ سردار ٹیل نے جسے ہندو مرد آہن کہتے تھے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے ہی ڈنکے کی چوٹ کہا تھا۔ "ہم



لاہور پوسٹمن کے جن تین ڈویژنوں اور دو بریگیڈوں نے حملہ کیا تھا، ان کے کور کمانڈر نے اعلان کیا تھا — "ہم لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے ساٹھ سے آتی فیصد نفری مرادیں گے۔"

ادھر پاکستانی سرفروش لاہور کو بچانے کے سو فیصد مرنے کی قسم کھا کر لڑ رہے تھے۔



لیفٹیننٹ اقبال بیہوش سیکٹر میں ایسٹ بنگال رجمنٹ کی ایک بٹالین کے ساتھ تھا۔ وہ ابھی سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ ایکٹمی سے ٹریننگ ختم کر کے وہ ابھی ابھی آیا تھا۔ اس ٹریننگ نے اس کے جسم کو توفیقی بنادیا تھا لیکن ذہنی لحاظ سے وہ ابھی تک کالج کا وارہ طالب علم تھا جس نے باپ کے روپے پیسے پر ادب باش پن کے سوا کچھ سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کا فوج میں بھرتی ہو جانا محض فرار تھا۔ وہ ٹریننگ کے دوران بھی ادب باش اور کھلنڈارا تھا۔ ان آرگنٹس (بے ہمتیاں لڑائی) اور ہونٹ فائٹنگ (سنگین بازی) کا انسٹرکٹر اسے اکثر کہا کرتا تھا — "مسٹر! سپاہی گیری تمہارے بس کی بات نہیں۔ یہیں سے گھر چلے جاؤ اور کسی سینما میں گیسٹ کیمری کرلو۔ تنخواہ بھی مل جائی کرے گی اور دن میں تین شوخنت دیکھ لیا کرو گے... تمہیں نہ اپنے جسم پر کنٹرول ہے نہ دماغ پر اور چلے آئے ہو لفظیں بننے۔ تم تو چار لاکھ لڑکیوں کی بھی کمانڈ نہ کر سکو گے کہیں جنگ میں جانا پڑا تو دشمن کے پہلے ہی شیل کے دھماکے سے اپنا نام نمبر بھی بھول جاؤ گے"

اقبال اس طرح کی لعن طعن اور ڈانٹ ڈپٹ خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا کرتا تھا۔ اس نے پاس آؤٹ ہونے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ادھر سے نکال دیا گیا تو اور کیا کرے گا۔ وہ کسی بجے سے فوج میں بھرتی نہیں ہوا تھا۔ وہ گیا ہی لفظیں بننے تھا — اور وہ لفظیں بن کر ایسٹ بنگال رجمنٹ میں آگیا۔ وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ کیا بنا، شہزادہ بن گیا۔ وہ فوجی کم اور افسر زیادہ تھا۔

پوری کی پوری بٹالین مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کی تھی جس میں اقبال کے علاوہ تین چار اور افسر مغربی پاکستان کے رہنے والے تھے مشرقی پاکستان کے چھوٹے چھوٹے، ڈبلے ڈبلے، سانولے سانولے اور بعض سیاہ کالے سپاہی اور عہدیدار وغیرہ اسے سلیوٹ کیا کرتے تو اس کی گردن مبارجوں اور نوابوں کی طرح تن جایا کرتی تھی۔ وہ انہیں بنگال کے مچھیرے اور دھان اگانے والے کسانوں سے بڑھ کر کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

"یہ عجیب مذاق ہے" — اقبال نے اس بٹالین میں آتے ہی مغربی پاکستان کے ایک لیفٹیننٹ سے کہا تھا — "ندریوں اور چھپڑوں کے پانی میں پلنے والی مخلوق کو ہماری حکومت نے خاکی درومی میں پیرٹ کر مغربی پاکستان کی خشکی پر لایا ہے۔ وقت پڑا تو اس بٹالین کی حفاظت کے لیے ہمیں پنجاب رجمنٹ کی دو بٹالینیں ساتھ بھیجنی پڑیں گی۔"

"زبان بند رکھو یا ر! — اس پنجابی لیفٹیننٹ نے اقبال سے کہا تھا — "ایسی بات پھر منہ سے نہ نکالنا۔ ہمارے ساتھ بنگالی افسر بھی ہیں۔ یہ بنگالی اگر تیجھے پڑ گئے تو قبر تک تمہاری جان نہیں چھوڑیں گے۔"

"لیکن انہیں لڑا تے کا کون؟ — اقبال نے کہا۔ — وہ وقت آیا تو یہ پھر بھی مرادیں گے۔"

اور وہ وقت آگیا۔ آیا بھی ایسا ایسا تاک کہ خود اقبال کو سنبھلنے کی اہلی نہ ملی حالانکہ آفیسر تین میں

افسر ہی باتیں کرتے تھے کہ پاکستان نے کشمیر میں جو کمانڈو آپریشن شروع کیا ہے یہ دونوں ملکوں کی بڑی خونریز جنگ کا باعث بنے گا۔ یکم ستمبر کے روز جب اس کی بٹالین کو آدھے گھنٹے کے نوٹس پر سرحد پر پہنچنے کا حکم ملا تھا تو بھی وہ اس طرح خوش و خرم رہا تھا جیسے بٹالین پکنک پر جا رہی ہو۔

"لیفٹیننٹ اکرم!" — اقبال نے چند ہی روز پہلے اپنے ایک لیفٹیننٹ دوست سے کہا تھا — "اس ویک اینڈ پر وزیر آباد جاؤ گا۔ اپنی نوکرائی سے فلرٹ کرنے کو دل بیتاب ہو رہا ہے۔ کم سخت جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی اکڑ ہے۔" اور اس نے اس لیفٹیننٹ کو باجرہ کے حسن و شباب کی ایسی تفصیلات سنائی تھیں کہ اس کا دوست تڑپ اٹھا تھا۔

"پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو اقبال!" — لیفٹیننٹ اکرم نے اسے کہا تھا — "نوکرائی ہی ہے نا! تمہاری خالہ تو نہیں۔ کار کا بند و بست میں کر لوں گا۔"

دونوں نے باجرہ کو کسی نہ کسی بہانے ہفتے کی شام کو لاہور لانے کا پروگرام طے کر لیا اور ایک ہوٹل بھی منتخب کر لیا تھا لیکن چھب جوڑیاں کی طرف پیشقدمی شروع ہوتے ہی اس فوج کا جوہر کون میں تھی، بیکروں سے تھوڑی سی دیر کے لیے بھی غیر حاضر ہونا بند کر دیا گیا تھا۔



بلیک آؤٹ کی تاریکی بہت گہری تھی۔ شام کے کھانے کے بعد اقبال کے باپ نے باجرہ کو اپنے کمرے میں بلایا۔ دروازوں، کھڑکیوں اور روشنیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ پھر بھی اقبال کے باپ نے بلب نہ جلایا۔ اس نے ایک موم بتی جلا کر کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔

"بیٹھو باجرہ!" — اقبال کے باپ نے باجرہ کو چارپائی پر بٹھا کر شفقتانہ لہجے میں کہا — "ہم نے تمہیں کبھی نوکرائی نہیں سمجھا۔ تم ہماری عزت ہو اور اس گھر کی عزت تمہاری عزت ہے۔ وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا اور اس نے سر جھکا لیا۔ باجرہ اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ اقبال کے باپ نے سر اٹھا کر باجرہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"صاحب جی! — باجرہ نے مسکین سے لہجے میں پوچھا — "مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

"ہاں باجرہ! — اقبال کے باپ نے کہا — "میں حیران ہوں کہ تم جیسی شریف لڑکی ایسی غلطی کیوں کر رہی ہے۔"

"مجھے بتاؤ نا صاحب جی! — باجرہ کے لہجے میں ایسا نکھار تھا جیسے وہ ابھی رو پڑے گی۔

"وہ جو اس محلے میں ایک جوان سامووی رہتا ہے۔" — اقبال کے باپ نے پوچھا — "اس کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟ ... میں نے سنا ہے تم اس کے پاس جاتی ہو۔"

"ہاں صاحب جی! — باجرہ نے اب ذرا جرات سے جواب دیا — "میں وہاں سے گزرتے کبھی کبھی اس کے پاس بیٹھ جاتی ہوں۔ ... بس یہی اس کے ساتھ تعلق ہے۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں باجرہ بیٹی! — اقبال کے باپ نے کہا — "لوگ شک کرتے ہیں۔"

"وہ بھی یہی کہتا ہے۔" — باجرہ نے معصوم سے لہجے میں کہا — "اس کا نام آپ کو پتہ ہوگا، افضال جی میں جب اس کے کمرے میں جاتی ہوں تو وہ میرے ساتھ بڑی اچھی باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا



یہاں آنا ٹھیک نہیں۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔

”لوگ باتیں بنا چکے ہیں۔“ اقبال کے باپ نے کہا۔ ”مجھے آج ایک آدمی نے کہا ہے کہ آپ کی نوکرائی اس آدمی کے پاس جاتی ہے۔ تم جانتی ہو ہمارا گھر انہ کتنا شریف اور نیک نام ہے۔ اپنے ساتھ تم ہمیں بھی بدنام کر رہی ہو۔۔۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اس نے خود تمہیں بلایا تھا یا تم اپنے آپ ہی اس کے کمرے میں چلی گئی تھیں؟“

ہجرہ کے ساتھ گھر کے ہر فرد کا سلوک بڑا اچھا تھا لیکن اقبال کے باپ کا انداز تو بہت ہی پیارا تھا۔ ہجرہ کو تو وہ اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے جب ہجرہ اور اپنے خاندان کی رسوائی کی بات کی تو ہجرہ نے اپنی مخصوص معصومیت سے بتا دیا کہ افضال کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات کس طرح ہوئی تھی اور وہ کتنی مرتبہ اس کے کمرے میں جا چکی ہے۔

”صاحب جی! ہجرہ نے کہا۔“ وہ تو مولوی ہے۔ مذہب کا بہت پکا ہے۔ میں اپنی آپ کو بتاؤں کہ میں جب اس کے کمرے میں جاتی ہوں تو اس وقت میں اپنے آپ کو جوان لڑکی نہیں سمجھتی۔۔۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ بڑی بات ہے تو میں اس کے پاس نہیں جایا کروں گی۔ اس راستے سے گزرنا ہی چھوڑ دوں گی۔ لیکن کہہ بات ضرور کہوں گی کہ جو باتیں لوگ کرتے ہیں وہ میں نے کبھی سوچی ہی نہیں۔“

ہجرہ کے سن میں آئی کہ وہ اقبال کے باپ سے بھی کہہ دے کہ اپنے بیٹے اقبال سے پوچھیں کہ میرا ایمان اور چال چلن کیسا ہے، لیکن وہ اس ڈر سے یہ بات نہ کہہ سکی کہ اقبال کا باپ نہیں مانے گا، انا اسی کی بے عزتی کر رہی ہوں۔

اقبال کا باپ ہجرہ کو پیار سے سمجھانا چاہتا تھا کہ جیسے وہ غلطی نہیں سمجھتی وہ بہت بڑی غلطی ہے لیکن اس کی بات ابھی سنہ میں ہی تھی کہ اقبال کی ماں اور اس کی دونوں بہنیں کمرے میں اس طرح آئیں جس طرح بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تھا۔

”اسے آپ کے لاڈ نے غراب کیا ہے۔“ اقبال کی ماں نے اقبال کے باپ سے غصیلی آواز میں کہا۔ ”اسے اپنے پاس کیوں بٹھا رکھا ہے؟“

”درا آرام سے بات کرو۔“ اقبال کے باپ نے کہا۔ ”میں اس سے وہی بات پوچھ رہا ہوں۔“

”پوچھنے سے کیا ہوتا ہے؟“ اقبال کی ماں نے کہا۔ ”یہ اپنے کمرے میں آئے گی تو توت مانے گی تھوڑا ہی۔ اس کے سر پر آپ دو جوئے کیوں نہیں مارتے۔ یہ تو یہی کہے گی کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔“

”بھولی بھالی صورت دیکھو۔“ اقبال کی بڑی بہن شمع نے کہا۔ ”اور کمرے میں دیکھو۔ رسوا اور بدنام کرنے کو اسے ہمارا ہی گھر ملا تھا!“

”بے ہودہ باتیں مت کرو شمع!“ اقبال کے باپ نے کہا۔ ”اس شخص کو میں جانتا ہوں۔ وہ مذہب پرست انسان ہے اور محلے کے بچوں کو قرآن مجید پڑھاتا ہے۔“

”ہم نے ایسے کئی مولوی دیکھے ہیں۔“ اقبال کی ماں نے کہا۔ ”وہ اسے پیسے دیتا ہوگا وہ جوان بھی ہے اور اکیلا بھی رہتا ہے۔“

پچھڑا گھر سے باہر نکال پھینکوں گی۔۔۔ ابا جان! آپ اس کے ساتھ لاڈ پیار چھوڑ دیں۔ مجھے تو ڈر ہے یہ کوئی اور کل نہ کھلا بیٹھے۔“

”اللہ کی قسم بی بی جی! ہجرہ نے روتے ہوئے کہا۔“ مجھے آپ کے گھر کی عزت کا خیال ہے یا نہیں۔ مجھے اپنی عزت کا پورا پورا خیال ہے۔“

”پھر اس مسئلہ سے کے پاس کیا لینے جاتی ہے تو؟“

”تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ ہم نے تجھے اپنی بیٹی بنا کے رکھا ہوا ہے۔“ اقبال کی ماں نے ہجرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور سر کو زور زور سے ہلا کر کہا۔ ”اور تو ہے کہ ہماری عزت خاک میں ملا رہی ہے۔“

اقبال کی ماں اپنے خاوند سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”اس جیسی لڑکیوں کا کیا ہے جس نے چار پیسے ہاتھ میں دے دیئے اسی کا دل خوش کرنے بیٹھ گئیں۔ گھر گھر نوکری کرنے والیوں کی عزت ہوتی ہی کہاں ہے۔“

ہجرہ نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر بڑی زور سے مارے اور سر کو ہاتھوں میں تھام کر سر جھکا لیا۔ وہ اتنی روتی کہ اس کی جھکی بندھ گئی۔ ایک بار پھر اس کے ذہن میں اقبال آیا لیکن اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اقبال کے باپ کو تو بولنے کی ہمت ہی نہیں مل رہی تھی۔ وہ بولنے لگتا تھا تو اس کی بیوی یا اس کی دونوں بیٹیاں اکٹھی بول پڑتی تھیں۔

”ہجرہ بیٹی! اقبال کے باپ نے بڑی مشکل سے بات کرنے کا موقع نکالا اور بولا۔ ”قسم کھاؤ کہ تم آئندہ اس شخص کے ہاں نہیں جاؤ گی۔“

”نہیں جاؤں گی صاحب جی! ہجرہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”لیکن قسم نہیں کھاؤں گی میں خدا سے کہوں گی کہ تو اگر میرا خدا ہے تو انصاف کر۔“

اگلی شام ہی اقبال کی بڑی بہن شمع کے کھانے کے بعد کسی سیلی کا نام لے کر ماں سے کہنے لگی کہ اس نے آج بلایا تھا کہتی تھی کہ دوسری لڑکیاں بھی آئیں گی اور تم بھی آجانا۔

”رات کا وقت ہے بیٹی! ماں نے کہا۔“ ہر طرف اندھیرا ہے گلیاں سنسان ہیں۔ اس وقت نہ جاؤ۔“

”میں بہت جلدی آ جاؤں گی امی! شمع نے بچوں کی سی صند کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

شمع ماں کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتی باہر نکل گئی۔ اس سیلی کا گھر دور نہیں تھا۔ ماں کو ڈر تھا کہ لڑکی کنواری ہے اور ابھی اس کا بچپن گیا نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکیوں کے ساتھ باہر نکل جائے۔

شمع کو گئے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اس کی ماں نے ہجرہ سے کہا کہ وہ اسے سیلی کے گھر سے بلا لائے۔ ہجرہ شمع کی اس سیلی کو جانتی تھی۔ وہ چلی گئی اور یہ جواب لائی کہ شمع کی سیلی گھر میں ہے لیکن شمع وہاں نہیں تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ شمع ادھر آئی ہی نہیں۔ ماں سر پچھڑا کر بیٹھ گئی۔

”اپنے باپ کو ابھی پتہ نہ چلنے دینا کہ شمع باہر نکل گئی ہے۔“ اقبال کی ماں نے اپنی چھوٹی لڑکی اور ہجرہ سے کہا۔ ”میں خود جا کر دیکھتی ہوں۔ وہ شیخوں کی بیٹی کے ہاں چلی گئی ہوگی۔“



کو لینے کے لیے تھانے جا رہا تھا اس وقت اس کا بیٹا اقبال بیدیاں سیکڑ میں نہر کے کنارے اپنی پلاٹن کے ساتھ پوزیشن میں تھا۔ اس کی پلاٹن نے ابھی ایک کچی راؤنڈ فائر نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس پلاٹن کے سامنے دشمن ابھی واضح طور پر نہیں آیا تھا یعنی اس پلاٹن کو اپنا ٹارگیٹ ابھی پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس پلاٹن کی خاموشی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کا پلاٹن کمانڈر سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال خاموش تھا۔ وہ خاموش تو تھا لیکن بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ اس کی بھاگ دوڑ اپنی پلاٹن کی پوزیشنوں تک محدود تھی۔ اس کا وارنر اس کے ساتھ ساتھ بھاگ دوڑ رہا تھا۔ وہ اپنے کمانڈر کا پیغام سننا اور اقبال کو سنا دیتا تھا۔ ہر پیغام اقبال کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں اضافہ کرتا تھا۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال کی پلاٹن کا نائب ضویدار برہمچاری کچھ دیر اس کے ساتھ رہا تھا اور اس کا منہ دیکھتا رہا تھا۔ وہ آخر اپنی پلاٹن کے پاس چلا گیا اور اس نے پلاٹن حوالدار سے کہا تھا کہ یہ پنجابی چھوٹا پلاٹن کو مر دے گا۔

"فکر نہیں صاحب! — پنجابی حوالدار نے نائب ضویدار برہمچاری سے پنجابی زبان میں کہا — "ہم اس چھوٹے کے حکم کا انتظار نہیں کریں گے۔ پنجاب کا ڈیفینس ہماری ذمہ داری ہے ہم یہ نہیں کہلوانا چاہتے کہ پنجابیوں نے پنجاب کا ڈیفینس نہیں کیا تھا۔۔۔ ہماری نظر دشمن پر ہے صاحب! دشمن ابھی سامنے نہیں آ رہا۔"

"کیسے آئے گا! — نائب ضویدار برہمچاری نے کہا — ابھی ہماری تین پوٹیں نہر کے آگے ہیں۔ وہ دشمن کو نہر تک نہیں آنے دیں گے۔"

انڈین آرمی نے ایک حملہ واگہ سیکڑ پر کیا تھا، دو سر قصور سیکڑ پر اور اس کا تیسرا حملہ بیدیاں سیکڑ پر تھا۔ بیدیاں لاہور اور قصور سیکڑ کا جکشن پوائنٹ تھا۔ وہاں بی۔ آر۔ بی۔ ایک سائنس تھا۔ دشمن نے بیدیاں کی طرف پیش قدمی کر کے توپ خانے کی بے ستارہ گولہ باری کی تھی جو ابھی تک وقفے وقفے سے جاری تھی۔ لاہور اور قصور کے دفاع میں لڑنے والے دونوں ڈویژن کمانڈروں نے چھ ستمبر کی شام تک محسوس کر لیا تھا کہ بیدیاں پر دشمن نے جو حملہ کیا ہے یہ دراصل دھوکہ ہے۔ اس کا اصل ٹارگیٹ واگہ تھا جہاں وہ اپنا پورا دباؤ ڈال کر اس سیکڑ کا دفاع توڑنا چاہتا تھا۔

دشمن کے دباؤ کا دوسرا سیکڑ قصور کا تھا۔ دشمن یہ دھوکہ دے کر کہ وہ بیدیاں سائنس سے لاہور کی طرف نکلنا چاہتا ہے قصور اور لاہور کے دفاع میں لڑنے والوں کو بیدیاں سیکڑ میں اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ پاک فوج کے یہ ٹروپس بیدیاں سیکڑ میں اکٹھے ہو جائیں گے تو وہ واگہ سیکڑ سے آسانی سے لاہور میں داخل ہو جائے گا۔ ہمارے ڈویژن کمانڈر اس دھوکے کے بھانپ گئے۔ انہوں نے لاہور اور قصور سے توجہ نہ ہٹائی۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ بیدیاں سائنس کے آگے سرحد کی طرف زمین ٹینکوں کے قابل نہیں۔ اس علاقے میں دلدل جگہ جگہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ٹینک باگ ڈال کر لڑنے کے لیے بیدیاں سائنس کی طرف لے آئے۔ اس کے باوجود بیدیاں کے دفاع میں کوئی کسر رہنے نہیں دی گئی تھی۔

ماں باہر چلی گئی اور آدھے پونے گھنٹے بعد اس حالت میں واپس آئی کہ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی اور اس کا سر جھکا رہا تھا۔ شمع کو گتے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ شمع کی مشادی ہونے والی تھی۔ ماں کے دل میں اس قسم کے وسوسے آتے کہ وہ کسی کے ساتھ چلی ہی نہ گئی ہو۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا تاہم ایک فضا میں دو تین طیاروں کا گونجنا زناٹہ سنا دیا۔ یہ پاک فضا تیرہ کے بمبار طیارے تھے جو رات کے وقت دشمن کے کسی ٹھکانے پر بمباری کے لیے بہت کم بلندی پر اڑتے جا رہے تھے۔ ان کی آواز بڑی ہی خوفناک تھی۔ اقبال کی ماں اپنے خاوند کے پاس دوڑی گئی اور اسے بتایا کہ شمع باہر نکل گئی تھی تین گھنٹے ہو گئے ہیں۔ ابھی تک واپس نہیں آئی نہ ہی وہ کسی سہیلی کے گھر گئی ہے باپ اچھل کر اٹھا۔

"اُسے ڈھونڈنے کہاں جاؤں؟ — اقبال کے باپ نے کہا — "تھوڑی دیر اور دیکھ لو۔ اگر نہ آئی تو میں تھانے جا کر پولیس کو اطلاع کروں گا۔۔۔ تم نے اُسے اس وقت جانے ہی کیوں دیا تھا؟"

"بس ضد کر کے نکل گئی۔" اقبال کی ماں نے جواب دیا۔

پھر سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔

اس سناٹے میں دستک بنائی دی۔ ماں اس خیال سے دروازہ کھولنے کے لیے دوڑی گئی کہ شمع آگئی ہے لیکن وہ ایک پولیس کانسٹیبل تھا۔ اس نے اقبال کی ماں سے کہا کہ کسی مرد کو باہر بھیجیو۔

اقبال کا باپ گیا۔ کانسٹیبل نے اس سے اس کا نام پوچھا۔

"کیا شمع آپ کی بیٹی ہے؟ — کانسٹیبل نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" اقبال کے باپ نے پوچھا۔ "شمع میری بیٹی ہے۔۔۔ کہاں ہے وہ؟"

"تھانے میں۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "آپ میرے ساتھ چلیں اور اُسے شناخت کریں۔"

"وہ تھانے میں کس طرح پہنچ گئی ہے؟ — اقبال کے باپ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "وہ بالکل ٹھیک ہے بلکہ ہماری اور آپ کی نسبت زیادہ ٹھیک ہے۔ آپ تھانے چلیں۔"

"وہ تھانے کس طرح پہنچ گئی ہے؟ — اقبال کی ماں نے پوچھا۔

"پولیس کی کثرت نے اُسے ریلوے لائن سے پکڑا ہے۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ وہ بھاگ گئے۔ اس لڑکی نے مجھے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پڑی گئی۔ پولیس کو فوج کی طرف سے بڑا سخت حکم ملا ہے کہ ریلوے لائن اور ریلوے سٹیشن پر ہر وقت نظر رکھو کیونکہ اس علاقے میں ساہوکار کا بہت خطرہ ہے ہمیں بڑا پکا شک ہے کہ آپ کی بیٹی کے ساتھ جو آدمی تھے وہ دشمن کے تحریک کار یا جاسوس تھے۔ اگر آپ کی بیٹی ان پڑھ ہوتی تو ہم اسے فوراً چھوڑ دیتے۔ وہ کالج میں پڑھی ہوئی لڑکی ہے۔ اُسے ہم اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ کو تھانے میں لڑکی کی صرف شناخت کے لیے بلایا گیا ہے۔"

شمع کی ماں اور بہن نے رونا شروع کر دیا۔ شمع کا باپ کانسٹیبل کے ساتھ چل پڑا۔

جس وقت سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال کا باپ چوہدری کرامت پولیس کانسٹیبل کے ساتھ اپنی بیٹی شمع



بیدیاں سائنس کے دفاع کے لیے جو نفری مورچہ بند تھی وہ بہت تھوڑی تھی۔ بیشک یہ دھوکہ ہی تھا لیکن دشمن بیدیاں کے لیے دو ڈوژن لایا تھا جنہیں ٹینک جھنڈوں کی اور کیم و شیش پانچ سو چھوٹی بڑی توپوں کی مدد حاصل تھی۔ ایسٹ بنگال جھنڈ سائنس کے دفاع میں مورچہ بند تھی۔ چھ ستمبر کا دن گزر گیا تھا رات گزرتی جا رہی تھی سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال کی پلاٹون نے ایک بھی راؤنڈ فائر نہیں کیا تھا جس سے دفاع میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ فرق نہ پڑنے کی وجہ یہ تھی کہ سائنس سے آگے یعنی سرحد اور بی۔ آر۔ بی کے درمیان اس ایسٹ بنگال جھنڈ کی دو تین پونٹیں تھیں۔

ایسٹ بنگال جھنڈ میں تمام نفری بنگالیوں کی تھی۔ چند ایک افسر غیر بنگالی تھے انہی بنگالیوں کے متعلق لیفٹیننٹ اقبال نے کہا تھا کہ مچھلی اور چاول کھانے والے یہ مجھ سے سوائے بھاگنے کے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اقبال ہی نہیں، پاک فوج میں اکثر لوگوں کی رائے کچھ ایسی ہی تھی کہ بنگالی بجا بول اور پٹھانوں کے سے جوش و خروش سے نہیں لڑ سکیں گے۔ وہ دلیل یہ دیتے تھے کہ بنگالی لڑنے والے ہوتے تو انگریزوں کی جھنڈیں ضرور بناتے۔ انگریزوں نے دوسری جنگ عظیم میں ایسے آدمیوں کو بھی بھرتی کر لیا تھا جو طبی لحاظ سے اگلے مورچوں میں لڑنے کے قابل نہیں تھے لیکن انہوں نے بنگالیوں کو انفسٹری اور ٹینک جھنڈوں میں بھرتی نہیں کیا تھا۔ فوج میں جو بنگالی بھرتی کیے گئے تھے انہیں دفنوں میں یا پسپائی کوڑ میں لگایا گیا تھا اس طرح بنگالی صرف ہیڈ کوارٹروں میں تھے

بنگالیوں کو پہلی بار پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد انفسٹری کے لیے بھرتی کیا گیا اور ان کی الگ جھنڈ کھڑی کی گئی جس میں چار پانچ پلٹنیں تھیں۔ اس جھنڈ کو ایسٹ بنگال جھنڈ کہا گیا۔ خالصتاً بنگالیوں کی پلٹنیں قائد اعظم کے ذاتی حکم سے کھڑی کی گئی تھیں اور ان پلٹنوں کی جھنڈ کو جھنڈ کلر (پرچم) قائد اعظم نے اپنے ہاتھوں دیا تھا۔ اس موقع پر قائد اعظم نے کہا تھا کہ بنگالی بجا بول اور پٹھانوں کی طرح جھگڑیں اور یہی اسلام کی انہی عسکری روایات کے امین ہیں جن کے بجا بول اور پٹھان ہیں۔ قائد اعظم نے کہا تھا کہ وقت آنے پر بنگالی ثابت کر دکھائیں گے کہ وہ پاکستان کے ہر مسلمان کی طرح مرد و مون ہیں اور اتنی جرات اور شجاعت رکھتے ہیں کہ اسلام کی دہشتہ روایات کو زندہ رکھیں۔

آگے چل کر ایسٹ بنگال جھنڈ کو بنگال ٹائیگرز کہا گیا تھا۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ پاک فوج کی نظریں بنگال ٹائیگرز پر لگی ہوئی تھیں کہ وہ قائد اعظم کی توقعات پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔



یہ پہلا موقع تھا کہ ایسٹ بنگال جھنڈ کی اس بٹالین کو جس کی ایک پلاٹون کا کمانڈر سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال تھا، دشمن کے سامنے آنے کا موقع ملا۔ بنگالیوں کا مقابلہ ایک بریگیڈ سے تھا۔ ان پر ۶ ستمبر کی صبح سے اتنی شدید گولاباری ہو رہی تھی کہ اس صبح کے سورج کو طلوع ہوتا وہ نہیں دیکھ سکے تھے۔ اتنی شدید گولاباری کا مطلب ہوتا ہے کہ حملہ آرمے لیکن دن گزر گیا، رات بھی گزر گئی اور حملہ نہ آیا یہی وہ دھوکہ تھا جسے پاک فوج بھانپ گئی تھی۔

گولوں کی بارش پاکستان کے بنگالیوں کے مورچوں کے پیچھے، داییں، بائیں اور درمیان گزر رہی تھیں۔ ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ گولاباری مورچوں کو تباہ کر دے۔ اتنی زیادہ گولاباری کا یہی فائدہ کافی سمجھا جاتا ہے کہ جن مورچوں پر کی جاتی ہے، وہاں مورچوں سے کوئی سر نہیں اٹھاتا۔ دوسرا فائدہ یہ کہ مسلسل دھماکے

پہلے دماغ کو ماف کرتے ہیں، پھر دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ کان بند ہو جاتے ہیں اور کانوں میں سیٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ مورچوں میں بیٹھے ہوئے جوانوں پر موت کا خوف سوار ہو جاتا ہے۔ ذہن میں ہی ایک ڈراؤنا خیال رہتا ہے کہ ابھی ایک گولہ سر پر آ پھٹے گا۔ گولاباری زیادہ دیر جاری رہے تو جوانوں کے مزاج میں غصہ اور چڑچڑاہٹ پیدا ہو جاتا ہے جو ان کا اپنا خون جلانے لگتا ہے۔ اس سے آگے پاگل پن ہوتا ہے جسے شیل ٹناک کہتے ہیں۔ یہ اعصابی نظام ٹوٹ پھوٹ جانے سے ہوتا ہے۔

ایسٹ بنگال جھنڈ کے جوان گولاباری کے ان ظالم اثرات میں سے گزر رہے تھے۔ ان کے لیے یہ دنیا مسلسل دھماکے اور گرد و غبار بن گئی تھی۔ پھٹتے گولوں کے لال گرم ٹکڑوں اور ان کے اڑائے ہوئے پتھروں کی جھنڈیں اور زناٹے بنگالیوں کے جذبے اور قوت برداشت کا بڑا ہی سخت امتحان لے رہے تھے۔ گرد و غبار میں بارود کی جوبلو تھی، وہ متلی پیدا کر رہی تھی۔ دشمن ان کے اعصاب توڑ رہا تھا کہ اس کی انفسٹری اور ٹینک حملہ کریں تو مزاحمت کرنے والے ہوش و حواس میں نہ ہوں۔ ہمارے دشمن کے پاس بے دردی سے پھونکنے کے لیے بے انداز گولابارود تھا جو اس نے اسی روز کے لیے اکٹھا کیا تھا۔

ایسٹ بنگال جھنڈ کے مورچوں سے چار پانچ آوازیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے بلند ہوتی تھیں۔ یہ بنگالی زبان کی للکار تھی۔ "ہوش میں رہنا جوان.... دشمن تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ صوبیداروں اور نائب صوبیداروں کی للکار تھی جو مورچے میں دبکے ہوئے جوانوں کے حوصلے اور جذبے کو زندہ و بیدار رکھے ہوئے تھے۔

وہ دھماکوں، زناٹوں، جیخوں اور گرد و غبار کا طوفان تھا جس میں دبلے پتلے، سانولے سانولے بنگالی ثابت قدم رہنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ ان کے اوپر سے عقب سے آنے والے اپنے توپ خانے کے گولے پھٹتے چنگھاڑتے گزر رہے تھے۔ یہ توپ خانوں کا معرکہ تھا لیکن اس طرف توپ خانے کی صرف ایک فیلڈ جھنڈ تھی اور اُدھر ڈوژن کا توپخانہ تھا۔ اس معرکہ میں مشرقی پاکستان کے ان جوانوں کے اعصاب جنہیں سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال نے مجھ سے کہا تھا، پس رہے تھے۔

"پاکستان" — مورچوں سے کسی نے نعرہ لگایا اور زمین کے اندر سے ایک گر جدار دھماکا اٹھا۔ "جندہ باد" — پھر پاکستان جندہ باد کے نعرے تھم نہ سکے، مگر جیتے ہی رہے۔ ان نعروں نے جذبے اور مورال کو بہت تقویت دی۔

بنگالی جوانوں نے تو اپنا جذبہ قائم رکھا۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال کا مورال کانپ رہا تھا۔ اس کے پاس جذبہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ فاکس ہول کی طرز کے مورچے میں سر نہیوڑائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے وائرلیس آپریٹر کو اس طرح اپنے قریب بٹھا رکھا تھا کہ گولے کے ایک دو ٹکڑے اس کے فاکس ہول میں آجائیں تو وائرلیس آپریٹر کو لگیں۔

"سر! — وائرلیس آپریٹر نے اقبال سے کہا۔ "کچھ ہیڈ کوارٹر رپورٹ مانگتا ہے۔"

"او کے بول دو" — اقبال نے آپریٹر سے کہا اور بڑبڑایا۔ "کبھی مخوس گھڑی تھی جب میں کالج سے بھاگ کر بھرتی دفتر جا پہنچا تھا۔"

آپریٹر اس سے کہی بار کہ چکا تھا کہ کچھ ہیڈ کوارٹر رپورٹ مانگتا ہے اور اس نے ہر بار او کے



بول دو" ایسے لہجے میں کہا تھا جیسے اُس کے سر کے ساتھ ریو اور کی نالی لگا کر اُس سے یہ الفاظ کھلوائے جا رہے ہوں۔ اُس کی پلاٹوں کا تو سب اچھا تھا لیکن اپنے متعلق اُس کی رپورٹ کچھ اور تھی جو وہ اپنے کمپنی کمانڈر کو نہیں دے سکتا تھا۔

اُس نے اپنے فاکس بول مورچے میں بیٹھے بیٹھے اوپر دیکھا۔ گولا باری اچانک رگ گئی تھی۔ اسے اپنا نائب صوبیدار بدراحتی مورچے پر کھڑا نظر آیا۔ اقبال نے بدراحتی کے چہرے کو بڑی غور سے دیکھا۔ اُسے اس چہرے پر خوف کی ٹہکی سی جھلک بھی نظر نہ آئی بلکہ اس ہنگامی نائب صوبیدار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اقبال حیرت منگ گیا۔

"آپ اتنی جلدی مورچے سے باہر کیوں آ گئے ہیں؟" لیفٹیننٹ اقبال نے کہا۔ "شیلنگ پھر شروع ہو جائے گی۔"

اور شیلنگ پھر شروع ہو گئی۔ نائب صوبیدار بدراحتی وہیں کھڑا رہا۔

"آپ فوراً نیچے چلے جائیں۔" لیفٹیننٹ اقبال نے حکم کے لہجے میں کہا۔

"اقبال شاب! بدراحتی نے کہا۔" ایسا آرڈر ہم کو نہیں دیو۔ ہم نیچے زائے کا تو جوان اور نیچے زولہ زائے کا اور پلاٹوں کا مورال بھی نیچے زولہ زائے کا.... ہم باہر سے نعرہ مارا چھے۔ پاکستان جوان نعرہ مارا چھے۔ چندہ باد! کمپنی کا سب نائب صوبیدار اور صوبیدار لوگ باہر سے۔" نیچے جاؤ۔" لیفٹیننٹ اقبال نے اب کے بڑے افسروں کے لہجے میں سخت حکم دیا۔ "آپ مارے گئے تو...."

"ہم مارا نہیں زائے کا شاب! بدراحتی نے کہا۔" ہم سید ہوگا۔"



گولا باری پہلے کی طرح شدید تھی۔ اقبال نے سر نیچے کر لیا جیسے اُس کے جوانوں کے ہاتھوں کھودا ہوا یہ گڑھا اُسے موت سے بچائے گا۔ یہ گڑھا جسے کتابی زبان میں فاکس بول کہتے تھے۔ اُس کی قبر بھی بن سکتا تھا۔ امکان ہی نظر آ رہا تھا۔ بدراحتی اسی گڑھے میں اتر گیا۔

"شاب! بدراحتی نے اقبال سے کہا۔" ہم آپ شے تھوڑا بات کرے گا۔"

"کیا بات کرے گا؟" لیفٹیننٹ اقبال نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ ابھی شک میں ہیں۔ یہ جنگ ہے، ایک سائز نہیں ہے۔ آپ اس کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ آپ نہیں رہے اور آپ.... اقبال بدک کر چپ ہو گیا کیونکہ قریب ہی دو تین گولے اکٹھے پھٹے تھے۔ اُن کی آرائی ہوئی مٹی اقبال کے مورچے میں گری تھی۔

"سر نیچے کرو بدراحتی صاحب!"

بدراحتی ہنس پڑا۔ اُس نے سر نیچے نہ کیا۔

"بولو، کیا بات کرنی ہے؟" اقبال نے کہا۔

"اقبال شاب! نائب صوبیدار بدراحتی نے کہا۔" یہ پاکستان ہم نے بنایا۔ اوس ٹیم آپ ماں کا دودھ پیتا تھا ہم اوس ٹیم شولہ شترہ شال کا تھا۔ آپ کالز میں ایزو کسین لیا ہم دوش کلاش پڑھا ہم ویشٹ ہنگال کا رہنے والا تھا۔ اُدھر ہندو جیاستی تھا اور شلمان بہت تھوڑا ہم قدامتِ اعظم کے آرڈر سے نعرہ لگایا

کہ ہم پاکستان بنائے گا۔ اُدھر ہندو ہمارا دشمن، برٹس ہمارا دشمن۔ ہندوؤں نے ہم کو جہانی روکا۔ اوش نے بولا، کانگریس میں آؤ ہم بولا، ہم شلمان ہے۔ وہ کافر جیاستی تھا۔ اوش نے ہم پر بہت زیادہ جیاستی کیا۔" نائب صوبیدار بدراحتی گولا باری کی قیامت میں جس سے لیفٹیننٹ اقبال ہکتا اور ڈرتا تھا، بڑے اطمینان سے اقبال کو بتا رہا تھا کہ اُس نے یہ پاکستان کس طرح حاصل کیا تھا۔ اقبال پر تو اس ہنگامی نائب صوبیدار کا رعب صرف اس وجہ سے ہی بڑھ گیا تھا کہ وہ اتنی زیادہ گولا باری میں اتنے زیادہ اطمینان سے باتیں کر رہا تھا۔ بدراحتی ٹوٹی چھوٹی اردو بول رہا تھا لیکن دو اپنا مطلب واضح کر رہا تھا۔

"اقبال صاحب! نائب صوبیدار بدراحتی اُسے اردو اور ہنگامی ملا کر کہہ رہا تھا۔" پاکستان کی قدر و قیمت وہی جانتے ہیں جنہوں نے اُس کے حصول کے لیے بے دریغ قربانیاں دی تھیں۔ یہ پودا جو آج تناور درخت بن چکا ہے۔ ہم نے اپنی نوجوانی میں اپنے ہاتھوں لگایا اور اسے اپنے اور اپنے بچوں کے خون سے سینچا تھا۔ میں آپ کو چھوٹا سا ایک واقعہ بتا ہوں۔ مغربی ہنگاموں میں ہندو بچوں کو اکثریت میں تھے اس لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کو طرح طرح کے لالچ دیتے تھے کہ وہ کانگریس کی حمایت کریں اور دوسری طرف وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑنے۔ انہیں قتل کرتے اور اُن کے گھروں کو آگ لگا دیتے تھے۔ انگریز اُن کے ساتھ تھا حکومت اُن کے ساتھ تھی۔ انگریز کی پولیس انہی کا ساتھ دیتی تھی۔ مارے جاتے تو مسلمان۔ بلوے اور ذکا فساد میں گرفتار ہوتے تو مسلمان لیکن مسلمان اپنے اس مطالبے اور اس نعرے سے دست بردار نہیں ہوتے تھے کہ ہم پاکستان بنائے رہیں گے۔"

دشمن نے گولا باری ایک بار پھر روک دی۔ اقبال بدراحتی کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُسے کچھ اس قسم کا شک ہونے لگا کہ اُس کے نائب صوبیدار کا دماغ گولا باری سے شاید بیکار ہو گیا ہے۔ اُس کی نظر میں یہ پاگل پن ہی تھا کہ سر پر دشمن کے گولے پھٹ رہے تھے اور یہ نائب صوبیدار اس طرح کہانی سنا رہا تھا جیسے وہ بارک میں بیٹھا ہوا ہو۔

"اقبال صاحب! نائب صوبیدار بدراحتی کہہ رہا تھا۔" آپ میرے افسر ہیں۔ اگر آپ اسے گستاخی سمجھیں تو مجھے معاف کر دینا لیکن میں نے جو باتیں فاروڈ ایریا میں آنے سے پہلے اپنے جوانوں سے کی تھیں وہ میں آپ کے ساتھ بھی کر دوں گا۔"

"نائب صاحب! لیفٹیننٹ اقبال نے کمانڈروں کے لہجے میں کہا۔" باہر جا کر پلاٹوں کو چیک کرو اور رپورٹ دو.... آپ نے اس طرح باتیں شروع کر دی ہیں جیسے ہم یہاں میلے پر آئے ہوتے ہیں جا کر دیکھیں۔ اگر کوئی جوان زخمی یا شہید نہیں ہوا تو جوان ڈرے ہوتے ضرور ہوں گے۔ اُن کا حوصلہ مضبوط کریں۔"

"میں آپ کو یہیں رپورٹ دے دیتا ہوں۔" نائب صوبیدار بدراحتی نے کہا۔ "ایسٹ ہنگال رجمنٹ کا کوئی جوان ڈرا ہوا نہیں ملے گا.... آپ میرے کمانڈر ہیں لیکن اس وقت میں آپ کو اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔ میں کل صبح سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ ڈرے جوئے میں۔ میں ایک بار خیر عافی چاہتا ہوں کیونکہ میں فوجی ڈسپن کے خلاف بات کر رہا ہوں لیکن اقبال صاحب! یہ چھاؤنی نہیں اور یہ



پریڈکٹ اور ڈنٹیں۔ یہ فیڈ ہے اور دشمن پوری طاقت سے ہمارے سر پر چڑھا رہا ہے۔  
سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال نے نائب صوبیدار برحق کے منہ کی طرف دیکھا اور اس پر ایسا تاثر طاری ہو گیا جیسے  
برحق اُس کا باپ ہو اور وہ اُسے ہر خطرے سے بچائے گا۔

”اقبال صاحب! — برحق نے کہا — خوف کو دل پر نہ بیٹھنے دیں۔ خوف ایسی چیز ہے جو دماغ  
کو بھی بیکار کرتی ہے اور ہم کو بھی۔ آدمی اپنے آپ کو کمزور سمجھنے لگتا ہے۔ میں آپ کو ایک واقعہ منہ لگا  
تھا۔ ۱۹۴۶ء میں ایک طرف کانگریسی ہندوؤں کے جلوس نکلتے تھے، دوسری طرف مسلم لیگ کے  
مسلمانوں کے۔ کوئی ہتھیار اپنے پاس رکھنا جرم تھا۔ چھوٹا سا چاقو بھی پاس رکھ کر کوئی باہر نہیں نکل سکتا تھا ہندوؤں  
نے اعلان کیا کہ مسلمانوں نے اب جلوس نکالا تو ہندوؤں پر حملہ کریں گے۔ مسلمانوں نے بہت بڑا جلوس نکالا۔ جلوس  
میں بٹینے نوجوان تھے یا طلباء تھے اُن سب نے مسلم لیگ کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے اٹھائے کھے تھے  
جو بانسوں کے ساتھ لگے ہوتے تھے جھنڈا اٹھانا ممنوع نہیں تھا۔۔۔

”ہندوؤں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے پاس ہتھیار تو کوئی ہو نہیں سکتا اس لئے وہ ہندوؤں کا بڑا آسان  
شکار ہوں گے۔ پولیس ہندوؤں کا ساتھ دیتی تھی۔ مسلمانوں کا جلوس جب ہندو آبادی میں سے گزر رہا تھا تو  
ہندوؤں نے ڈنڈوں، خنجروں اور چاقوؤں سے مسلح ہو کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کے جلوس میں جو ڈیڑھ  
دو ہزار نوجوان اور طلباء تھے وہ ہندوؤں پر لوٹ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاتعداد ہندو زخمی ہو کر بھاگے اور  
بہت سے اتنے شدید زخمی ہوئے کہ وہ گر پڑے۔ مسلمان بہتے نہیں تھے۔ اُن کے پاس جھنڈیوں اور جھنڈوں  
والے جو بانس تھے وہ دراصل برہمچیاں تھیں۔ بانسوں کے جو سرے جھنڈوں میں چھبے ہوئے تھے انہیں  
نوجوانوں نے تراش کر برہمچیوں کی انیسوں کی طرح بنا رکھا تھا۔ میں بھی اُس جلوس میں شامل تھا۔ میں بھی ایسے ہی  
ایک بانس سے مسلح تھا جس پر سبز جھنڈے کا پردہ پڑا ہوا تھا اور جو اندر سے جیھی کی طرح نوکدار تھا۔ کئی ہندو  
مر گئے تھے۔۔۔

”اقبال صاحب! میں نے آپ کو یہ بات اس لئے سنائی ہے کہ آپ سمجھ جائیں کہ جو ڈر کیا وہ مارا گیا۔  
اگر ہم یا ہمارے لیڈر ہندوؤں سے ڈر جاتے تو آج ہم آزاد پاکستانی نہ ہوتے بلکہ ہندوؤں کے غلام ہوتے۔  
آپ لکھتے ہوتے نہ میں نائب صوبیدار ہوتا۔۔۔ ہم نے پاکستان بنا تو لیا لیکن ہندوؤں نے مغربی بنگال میں ہم سے  
ظالموں کی طرح انتقام لیا۔ کلکتہ کی گلیاں اور سڑکیں مسلمانوں کی لاشوں سے بھر گئی تھیں۔ اُس وقت ہم بہتے  
تھے۔ آج ہمارے پاس ریفلیں ہیں، مارٹر گنز ہیں، توپیں ہیں، ٹینک اور طیارے ہیں۔ ہمارا سب سے زیادہ  
مضبوط ہتھیار ہمارا جذبہ ہے۔ انڈیا والے اسے مورال کہتے ہیں، لیکن ہم اسے جذبہ ایمان کہتے ہیں۔ آج

ہندو نے ہمیں پھر لٹکا رہا ہے۔ نائب صوبیدار برحق بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اُسے ہنسی سی آتی۔ اُس  
پر رقت طاری ہو گئی تھی۔ اُس نے جذباتی سے ہلچے میں کہا — ”جس ہندو سے ہم کبھی نہیں ڈرے تھے  
اُس سے ہم آج بھی نہیں ڈریں گے۔ اُس کی پوری بٹالین کا مقابلہ صرف ہماری پلاٹون کرے گی۔“ برحق  
نے اقبال کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دھیمی سی آواز میں بولا — ”ممت ڈریں صاحب! ہم آپ کے ساتھ  
ہیں۔ آپ ساری عمر یاد رکھیں گے کہ بنگالیوں نے پنجاب کو کس طرح بچا یا تھا۔ ہمیں ٹائیگر کہتے ہیں۔ ہم  
ثابت کر دیں گے کہ ہم ٹائیگر ہیں۔“



اُس وقت تک ایسٹ بنگال رجمنٹ ثابت کر چکی تھی کہ یہ واقعی ٹائیگر بٹالین ہے۔ بنگالیوں کی  
اس بٹالین کی ایک کمپنی تین الگ الگ پوسٹوں کی صورت میں منہ کے سرحد والے کنارے سے آگے مورچہ  
بند تھی۔ دشمن نے چھ ستمبر کی صبح سے ہی ان تینوں پوزیشنوں پر حملے شروع کر دیئے تھے جن پوزیشنوں  
میں تیس چالیس جوان تھے اُن پر دشمن نے پوری پوری بٹالین سے حملے کئے۔ بنگالیوں نے بہت نہ ہاری۔  
دماغ کو حاضر رکھ کر انہوں نے دشمن کو نہر اور سائفن سے فوری رکھا۔ دشمن ان پوسٹوں کو کچلنے کے لیے ٹینک  
بھی لایا، لیکن پاکستان کے ان بنگالیوں نے ٹینکوں کو بھی روک لیا۔ اُن کے پاس ٹینک فکٹ گنز (آر آر) بہت  
تھوڑی تھیں، لیکن انہوں نے انہی سے دشمن کا آہنی غور توڑ دیا۔

ان اگلی پوزیشنوں میں لڑنے والے پورے جذبے سے لڑ رہے تھے لیکن اُن کی معرکہ آرائی  
انسانی استعداد کی سطح سے بلند تھی۔ انہیں پیچھے آجانے کا حکم دیا گیا۔ پیچھے ہٹنا بھی آسان نہیں تھا کیونکہ دشمن  
سر پر آیا ہوا تھا۔ فضا میں گولیاں اُڑ رہی تھیں۔ ٹینکوں کے گولے پھٹ رہے تھے۔ اس آگ میں سے  
زندہ نکل کر آنا ممکن نہ تھا۔ انہیں پیچھے ہٹانے کی ضرورت یہ تھی کہ ڈیفنس کو ایک جگہ اکٹھا کرنا تھا۔ ان میں  
سے دو پلاٹونیں اپنی پوزیشن سے نکل آئیں۔ دشمن نے انہیں کچلنے کے لیے ٹینک دوڑا دیئے لیکن ان جوانوں  
نے مورچوں کے بغیر حمہ کر مقابلہ کیا۔ پیچھے بھی ہٹتے آئے اور دشمن کو بھی روک رکھا۔

تیسری پوسٹ میں بارہ چودہ جوان تھے جن کا کمانڈر ایک حوالدار تھا۔ یہ حوالدار اپنی پوسٹ چھوڑنے  
کی بجائے دشمن پر کارگر فائر کرتا رہا تاکہ دوسری پلاٹونیں آسانی سے پیچھے چلی جائیں۔ اس کے بعد اس  
حوالدار نے اپنی پوسٹ چھوڑ کر پیچھے آنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے اُس وقت بھی پوسٹ نہ چھوڑی  
جب اُس کے جوانوں میں صرف تین زندہ رہ گئے تھے۔ وہ مسلسل لڑتا رہا۔ سائفن کو دشمن سے بچانے  
کے لیے اور سائفن کا راستہ بند رکھنے کے لیے صرف یہ حوالدار اپنے تین جوانوں کے ساتھ موجود تھا اور  
وہیں رہا۔ اُسے پیچھے آنے کا حکم تو مل گیا تھا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کی ذمہ داری کس قدر نازک ہے۔  
اُس نے یہاں تک کیا کہ اپنی بٹالین کی مارٹر پلاٹون کو فائر آرڈر دے کر دشمن پر مارٹر گنز کی گولہ باری کراتا

رہا۔ اس طرح ان چار بنگالیوں نے دشمن کو سائفن کے قریب نہ آنے دیا۔ اُسے جب کمپنی کمانڈر کی طرف  
سے پیچھے آنے کا حکم ملا تھا تو وہ ایک ہی جواب دیتا تھا کہ وہ پیچھے آ گیا تو دشمن آگے آ جائے گا۔



جنگ ستمبر عجیب جنگ تھی مسلمانوں کے لیے یہ عجیب نہیں ہونی چاہیے تھی کیونکہ عسکری جذبہ جو  
مسلمان کے ہومیں صدیوں سے رواں دواں چلا آ رہا ہے، وہ اسے ہر لمحہ جہاد کے لیے تیار رکھتا ہے۔  
یہی جذبہ تھا جس نے جنگ ستمبر میں شجاعت اور حب الوطنی کے ایسے مظاہرے کرائے کہ دنیا دنگ  
رہ گئی۔ اقوام عالم، خصوصاً وہ اقوام جو ہندوستانیوں کی ہمنوا تھیں اور جو ہندوستانیوں کے حق میں بہتر سمجھتی  
تھیں کہ پاکستان کا خاتمہ ہو، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ پاکستانی اس بے جگری سے اپنے وطن کا دفاع  
کریں گے کہ ایک پاکستانی دس ہندوؤں کا مقابلہ کرے گا۔ جنگی مبصر بھی حیران رہ گئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود پاکستانی حیران رہ گئے تھے کہ انہوں نے کیا کر دکھایا ہے۔ جو کہ یہ  
تھی کہ پاکستان کے اقتدار پرست یا سی لیڈروں نے اور اقتدار میں آنے والے نت نئے حکمرانوں نے



قوم کو قوم رہنے ہی نہیں دیا تھا، بلکہ قوم کو انسانیت کے درجے سے بھی گرا دیا تھا۔ انسان مویشی بن چکے تھے۔ پولیس اور جرائم پیشہ لوگوں میں گہرا رشتہ پیدا ہو چکا تھا۔ امریکہ کی دی ہوئی مالی امداد اور قرضے ارباب اقتدار و اختیار کے گھروں میں جارہے تھے۔ معاشرہ بے اطمینانی، بے انصافی اور عدم مساوات کا شکار ہو کر افراد میں بٹ گیا اور افراد میں مرگت نہ رہی، باہمی پیار نہ رہا اور ان کی سوچیں پیٹ کی نذر ہو گئی تھیں۔ ایسی معاشرتی کیفیت قومی جذبوں کو کہاں زندہ رہنے دیتی ہے لیکن ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح قوم یوں اٹھ کھڑی ہوئی جیسے لاش میں جان پڑ گئی ہو۔ جیسے سمار کی ہوتی عمارت کا لمبہ از خود عمارت بن گیا ہو۔ جذبے جاگ اُٹھے اور شعلے بن گئے۔

بیداری اور بے جگری کی یہی کیفیت پاک فوج، فضائیہ اور بحریہ میں بھی پیدا ہو گئی۔ پاک فوج کی عسکری کا تو یہ عالم تھا جیسے ہم نہیں رچیں لڑ رہی ہوں۔ یہ جذبہ حب الوطنی کی انتہا تھی کہ بعض محاذوں پر انسروں اور جوانوں نے فوجی قواعد و ضوابط کو نظر انداز کر دیا۔ ہر انسر اور جوان یہ سوچ کر اپنے وطن کا دفاع کر رہا تھا کہ لڑنے کے لیے وہ اکیلا رہ گیا ہے اور وطن کے دفاع کی ذمہ داری اُس اکیلے پر آ پڑی ہے۔ یہ مظاہرے کئی محاذوں پر ہوتے۔ بیدیاں کے محاذ پر سالٹن سے آگے ایسٹ بنگال جہٹ کی جو پولیس تھیں وہاں بھی یہی مظاہرہ ہوا۔ ایک پوسٹ کے حوالدار نے پیچھے آنے سے انکار کر دیا فوج میں ایسی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ جو تیر کی نذر اپنے ہیڈ کوارٹر کے احکام کی پروا نہ کریں، لیکن یہ جذبہ حب الوطنی کی شدت تھی جس کے آگے وطن کے یہ سرفروش بے بس ہو گئے تھے۔ جب یہ حوالدار بھی اپنے باقی ماندہ جوانوں کے ساتھ شہید ہو گیا تو یہ جلاکہ اُس نے پیچھے آنے سے انکار کیوں کیا تھا۔ اُن کے ساتھ وائلیس کا بلاپ لوٹ گیا تھا، اُس کے تقریباً نصف گھنٹہ بعد دشمن کے ٹینک اور اُس کی انفری آگے بڑھتی نظر آتی۔ بعد میں یہ معلوم ہوا تھا کہ دشمن کے اس حملے کو اس بنگالی حوالدار نے اپنے چند ایک جوانوں کے ساتھ روکا ہوا تھا۔ یہ جانباز آخری جوان تک لڑے۔ دوسری دو پولسوں میں سے ایک پوسٹ کی نفری پیچھے آ چکی تھی۔ دوسری پوسٹ کے جوان ابھی رینگتے ہوتے اور اڑتے ہوتے پیچھے آ رہے تھے۔ دشمن نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ اُس نے بڑی مشین گنوں کا فائر ان پر مرکوز کر دیا تھا۔ جب دشمن نے ایڈوانس کیا تو ان بنگالی جوانوں نے دیکھ لیا۔ انہیں فوراً واپس آ جانا چاہیے تھا تاکہ نہر کی رکاوٹ کو سامنے رکھ کر اور محفوظ پوزیشنوں میں آکر دشمن کا مقابلہ کرتے لیکن انہوں نے از خود ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ انہیں واپس نہیں جانا چاہیے انہوں نے وہیں پوزیشنیں لے لیں۔ اُن کے پاس رائفلوں کے علاوہ دو مشین گنیں تھیں، ایکٹ لاکر بھی تھے اور ایک جیب تھی جس پر آر آر لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے وہیں سے دشمن کا مقابلہ شروع کر دیا۔

اپنے توپخانے کے دو او۔ پی بہت آگے گئے ہوتے تھے۔ انہوں نے دشمن کو بڑھتے دیکھا تو اپنے توپخانے کو فائر آدھ دیا۔ حملہ کم و بیش دو انفری پلٹنوں کا تھا جن کے ساتھ ٹینکوں کے دو سکواڈرن تھے اور انہیں ڈیڑھ دو سو چھوٹی بڑی توپوں کی گولہ باری کا چھاتہ حاصل تھا۔

ایسٹ بنگال رجمنٹ کے ساتھ جو توپخانہ تھا وہ پوری رجمنٹ نہیں تھی۔ صرف دو بیڑیاں تھیں۔ اُن کے پاس فیلڈ گنیں تھیں۔ دشمن کی جو طاقت تھی، اُس کے مقابلے کے لئے میڈیم گنوں کی ضرورت تھی لیکن یہ پاکستانیوں کی بے مائیگی تھی کہ اُن کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ اُس سے زیادہ سے زیادہ کام لینے

کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ یہ تو سوچ ہی نہیں رہے تھے کہ اُن کے پاس کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ وہ جذبے سے سرشار تھے اور اسی کے زور پر لڑ رہے تھے۔ نعرے جو بھڑکے میدان میں گرجے تھے اُن کی بازگشت بیدیاں کے محاذ پر صاف سنائی دے رہی تھی۔ بدر اور بیدیاں شانہ بشانہ نظر آتے تھے۔ دشمن کی سینکڑوں توپوں کے گولے بنگالیوں پر وہ اثر نہ کر سکے جو اتنی تیز اور شدید گولہ باری کیا کرتی ہے۔ نائب عویدر بدر الحق نے سینکڑوں لیفٹیننٹ اقبال سے کہا کہ دشمن کا بڑا سخت حملہ آ رہا ہے۔ اقبال نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی حالت ڈرے ہوئے پنکھے جیسی تھی۔



اقبال کے گھر میں پہلے ہی ماتم کی فضا تھی، جتنی تھی۔ جنگ کے دوسرے ہی روز یہ خبر اقبال کے گھر بھی پہنچ گئی تھی کہ شہیدوں کی لاشیں لاہور سے آتی ہیں اور اُن کے گھروں کو جا رہی ہیں۔ وہ ایک فوجی ٹرک تھا جس میں دو شہیدوں کی لاشیں لے جانی جا رہی تھیں۔ لوگوں نے اس ٹرک کو روک لیا تھا۔ یوں گتا تھا جیسے سارا شہر اپنے شہیدوں کو دیکھنے کے لیے گھروں سے نکل آیا ہو۔ لوگ پھول الا لاکر ٹرک کے اندر پھینک رہے تھے۔

جب یہ خبر اقبال کے گھر پہنچی تو اُس کی ماں کا دل ڈوبنے لگا۔ اقبال کی چھوٹی بہن نے رونا شروع کر دیا جیسے فوجی ٹرک میں اقبال کی لاش آئی ہو شہیدوں کی لاشیں تو چلی گئیں، لیکن ماتم اقبال کے گھر ہونے لگا۔ جس روز اقبال کو اپنے فاکس بول سے اس لئے نکلنا پڑا کہ دشمن کا بڑا طاقتور حملہ آ رہا تھا اُس روز اُس کے گھر صحیح معنوں میں ماتم ہو رہا تھا کیونکہ اُس کی بہن شمع رات کو ریلوے لائن سے پکڑی گئی تھی اور وہ ٹھانے میں تھی۔ ٹھانے سے ایک کانٹیل آ یا اور اقبال کے باپ کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ ٹھانے لے گیا کہ اُس کی بیٹی ٹھانے میں ہے۔ باپ چکراتا ہوا ٹھانے پہنچا۔

ٹھانہ بلیک آؤٹ کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کانٹیل اُسے ایک کمرے میں لے گیا جس میں ایک لاشیں جل رہی تھی۔ دروازوں کھڑکیوں اور روشنائیوں کے شیشوں پر کالے رنگ کے موٹے کاغذ چڑھے ہوئے تھے۔ وہاں ایک تنہا نیدار اور اُس کے پاس پاک فوج کا ایک کیپٹن بیٹھا ہوا تھا۔ اقبال کے باپ نے ان دونوں کو گھبراہٹ اور خوفزدگی کے عالم میں سلام کیا اور تنہا نیدار کے اشارے پر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”آپ کا نام چوہدری کرامت علی ہے؟“ تنہا نیدار نے پوچھا۔  
”جی“ کرامت علی نے جواب دیا اور کیپٹن کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”میرا بیٹا فوج میں سینکڑوں لیفٹیننٹ ہے۔۔۔ محمد اقبال۔ وہ لاہور کے کسی محاذ پر ہے۔“

”کس یونٹ میں ہے؟“ کیپٹن نے پوچھا۔  
”ایسٹ بنگال رجمنٹ میں۔“

”ادھر دیکھتے“ کیپٹن نے کمرے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

چوہدری کرامت نے پہلے ادھر نہیں دیکھا تھا۔ اب دیکھا تو کونے میں بیٹھ کر ایک جوان لڑکی بیٹھی تھی جس کا سر جھکا ہوا تھا اور دوپٹہ اتنا آگے آ یا ہوا تھا کہ اُس کا چہرہ ابھی طرح نظر نہیں آتا تھا۔

”کیا یہ آپ کی بیٹی ہے؟“ کیپٹن نے پوچھا۔

”یہ نام شمع بتاتی ہے۔“ تنہا نیدار نے کہا۔



چوہدری کرامت آہستہ آہستہ اٹھا اور لڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ لڑکی کا جھکا ہوا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ چوہدری کرامت نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اُس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اُسے اچھی طرح دیکھا۔ وہ اپنے آپ کو کوئی فریب نہ دے سکا۔ وہ اُسی کی بیٹی سمجھتی تھی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور اُس نے اس قدر زور سے اپنی بیٹی کے مُنہ پر پتھر مارا کہ لڑکی بیچ سے فرش پر جا پڑی۔ چوہدری کرامت کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو اور زیادہ پیٹنے کا کیٹن تیزی سے اٹھا اور دونوں کے درمیان آگیا۔ اُس نے تھانیدار سے کہا کہ لڑکی کو باہر بھیج دو۔ تھانیدار نے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اسے کہا کہ لڑکی کو باہر بٹھائے اور اُس کے پاس موجود رہے۔ کیٹن نے چوہدری کرامت کو بازو سے پھڑا کر سی پٹھا دیا۔ چوہدری کرامت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”چوہدری صاحب!“ تھانیدار نے کہا۔ ”آپ کے جذبات کو ہم بڑی اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ کسی جوان اور بالغ لڑکی کا کسی آدمی کے ساتھ رات کو گھومنا پھرنا کوئی ایسا سنگین جرم نہیں کہ لڑکی کو یا دونوں کو حراست میں لے لیا جائے۔ لیکن چوہدری صاحب! یہ حالات ایسے ہیں کہ میرا باپ بھی اگر مشکوک حالت میں گھومتا پھرتا نظر آجائے یا تو میں اُسے بھی حراست میں لے لوں گا۔ میں اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کی بیٹی کا چال چلن اچھا ہے یا بُرا لیکن جس حالت میں اور جن حالات میں یہ چڑی گئی ہے وہ ایسے ہیں کہ شک رفع کئے بغیر اسے چھوڑا نہیں جاسکتا۔“

”آپ نے اسے کہاں سے پکڑا ہے؟“ چوہدری کرامت نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ٹھوڑی دیر پہلے ریلوے لائن سے“ تھانیدار نے جواب دیا۔ ”ریلوے لائن پر پولیس کی گشت رستی ہے۔ آپ کی بیٹی کے ساتھ دو آدمی تھے۔ یہ شک بھی ہے کہ وہ دونوں تین تھے۔ گشت کے کانسٹیبلوں نے انہیں بلایا۔ ایک آدمی ایک طرف بھاگ گیا۔ دوسری طرف نکل گئے۔ آپ کی بیٹی نے بھی بھاگنے کی کوشش کی لیکن کانسٹیبلوں نے اسے پکڑ لیا۔ آپ پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستانی ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”ہاں ہاں شاہ صاحب!“ چوہدری کرامت نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں انڈیا کے جاسوس ملے پاکستان میں موجود ہیں۔“

”صرف جاسوس نہیں چوہدری صاحب!“ کیٹن نے کہا۔ ”سب سے بڑا خطرہ سا بوتل کا ہے۔ سا بوتل شاید آپ سمجھتے ہوں۔ تخریب کاری کو کہتے ہیں۔ مثلاً ریلوے لائن کسی جگہ سے اکھاڑ دینا۔ پل تباہ کر دینا۔ کوئی فوجی گاڑی آ رہی ہو تو اُس کے نیچے بم رکھ دینا وغیرہ۔ آپ کے قریب چناب کا پل ہے۔ اگر یہ پل تباہ ہو جائے تو نہ ہم لاہور کے محاذ کو پہلائی اور کمک دے سکتے ہیں نہ سیالکوٹ کو۔ اس کے علاوہ وزیر آباد کی ایک فوجی اہمیت ہے۔ یہ سیالکوٹ اور لاہور کا جنگشن سٹیشن ہے۔ کیٹن نے آہ لی اور ذرا خاموش رہ کر بولا۔ ”آپ چونکہ پڑھے لکھے آدمی ہیں اس لئے میں آپ سے ایسی بات کر سکتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ انڈیا وزیر آباد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ سیالکوٹ سیکرٹس اُس نے ٹیکوں سے حملہ کیا ہے۔ اُس کے جنگی قیدیوں سے اور ان کاغذات سے جو اُن کے تباہ شدہ ٹیکوں سے برآمد ہوئے ہیں یہ انکشاف ہوا ہے کہ انڈین آرمی سیالکوٹ کے راستے وزیر آباد تک پہنچے گی اور پاکستان کو دو حصوں میں کاٹ دے گی۔ یہاں سے انڈین آرمی

لاہور کی طرف پیش قدمی کرے گی اور ہمارے لاہور کے دفاع کو توڑ دے گی.... آپ غور فرمائیے یہ کتنا خطرناک پلان ہے۔ اس پلان سے آپ وزیر آباد کی اہمیت کا اندازہ کریں۔ ہم تو یہاں کے ہر ایک آدمی کو لگا ہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ بھی سوچیں کہ میں یہاں کیوں آ بیٹھا ہوں۔ جاسوسی کے محاذ پر لڑنا میرا کام ہے۔ وزیر آباد جاسوسوں اور تخریب کاروں کے خطرے میں ہے۔“

”چوہدری صاحب! یہ بھی سوچیں“ تھانیدار نے کہا۔ ”جنگ کے پہلے روز دھونگل راہوالی اور گلگھر کے ریلوے سٹیشنوں پر انڈیا کے ہوائی جہازوں نے جو حملے کئے تھے وہ مسافروں کو مارنے کے لیے نہیں کئے تھے۔ یہاں کے جاسوسوں نے ایک خاص مال گاڑی کی نشاندہی کی تھی۔ انڈیا کے ہوائی جہاز اس گاڑی کو تباہ کرنے آئے تھے۔“

”میں سب سمجھتا ہوں جناب!“ چوہدری کرامت نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لیکن میری بیٹی جاسوس نہیں ہو سکتی نہ اس کا کسی جاسوس کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ یہ باہر گھومنے پھرنے والی لڑکی بھی نہیں۔“

”اور یہ شریف لڑکی بھی نہیں چوہدری صاحب!“ تھانیدار نے کہا۔ ”اگر یہ گھر بندوق کی بھلی لڑکی ہوتی تو رات کے وقت شہر سے اتنی دُور ریلوے لائن پر مردوں کے ساتھ نہ گھوم پھر رہی ہوتی۔“

”شاہ صاحب!“ کرامت نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ ”یہ کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ آپ میری عزت کا خیال کریں۔“

”چوہدری صاحب!“ کیٹن نے میز پر بڑی زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ ”محاذوں پر ہمارے جوان جانیں قربان کر رہے ہیں۔ ٹانگیں اور بازو کٹوا رہے ہیں۔ میں خاکی وردی پہن کر اور اس ڈیوٹی پر بیٹھ کر صرف اس لیے ایک مشکوک لڑکی کو کیسے چھوڑ دوں کہ یہ صرف ایک شہری کی عزت کا سوال ہے۔ یہ لڑکی بہت بڑی تباہی کا اور نہ جانے کتنی قیمتی جانیں لینے کا باعث بن سکتی ہے۔ آپ ایک فوجی افسر کے باپ ہیں۔ آپ کی بیٹی کی فزاسی حرکت آپ کے اپنے بیٹے کی موت کا باعث بن سکتی ہے، بلکہ اُس کی پوری یونٹ کو تباہ کر سکتی ہے۔“

”نہیں کپتان صاحب! نہیں۔“ چوہدری کرامت نے رقت سے دہی ہوئی آواز میں اپنے سر کو داتیں باتیں ہلا کر کہا۔ ”میری بیٹی پر کوئی اور الزام عائد کر دیں، میں سر جھکا لوں گا، یہ جاسوس نہیں ہو سکتی۔“

”پھر آپ اسے کہہ دیں کہ ہمیں بتادے کہ اس کے ساتھ کون تھا؟“ تھانیدار نے کہا۔ ”میں ایک بیہودہ سی بات کہنا چاہتا ہوں جو آپ کو بُری لگے گی۔ اگر آپ کی بیٹی جاسوس نہیں اور وہ کسی دوسرے مقصد کے لئے گھر سے نکل گئی تھی تو اس کے ساتھ ایک آدمی ہونا چاہیے تھا۔ اس عمر کی لڑکی تین آدمیوں کے ساتھ نہیں جاسکتی۔ ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے ساتھ کون تھا۔ یہ کہتی ہے کہ کوئی بھی نہیں تھا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ وہاں کیا کر رہی تھیں تو کہتی ہے کہ ویسے ہی نکل گئی تھی.... یا تو آپ یہ ثابت کر دیں کہ آپ کی بیٹی میں کوئی دماغی فراہی ہے جس کے زیر اثر وہ کبھی کبھی باہر نکل جاتی ہے۔“

”میں جھوٹ نہیں بولوں گا شاہ صاحب!“ چوہدری کرامت نے کہا۔ ”اس میں کوئی دماغی فراہی نہیں۔ یہ جدمر بھی گئی تھی اپنے ہوش و حواس میں گئی تھی میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہوں گا۔ اگر آپ کو یقین



ہے کہ میری بیٹی جاسوسوں کے کسی گروہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہے تو مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے ہاتھوں اس کا گلا گھونٹ دوں۔“

”جذبانی بائیں نہ کریں چوہدری صاحب!“ کیپٹن نے کہا۔ ”ہمارا سامنا ایک بہت بڑی اور بڑی ہی خطرناک حقیقت سے ہے۔ کسی ایک جاسوس کو بچ کر اُسے قتل نہیں کر دیا جاتا۔ اُس نے اُس کے تمام ساتھیوں کی نشاندہی کرانی جاتی ہے۔ اگر لڑکی نے یہ بتایا کہ اُس کے ساتھ کون لوگ تھے تو آپ کے گھر کی بھی تلاشی ہوگی۔“

چوہدری کرامت نے کیپٹن کے منہ کی طرف دیکھا اور اُس کی آنکھیں یوں پھٹ گئیں جیسے اُس پر کشتہ طاری ہو گیا تو اُس کی حرکت قلب بند ہو گئی ہو۔

”آپ پائیں ان پکڑیں“ چوہدری کرامت نے تھانیدار سے کہا اور کیپٹن کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”اور آپ فوج کے کیپٹن ہیں آپ دونوں کو بہت اتھارٹی حاصل ہے لیکن آپ دونوں ہی معاشرہ کے افراد ہیں جس کا میں ہوں۔ میری ایک عزیز سہیلیں اور میری کچھ مدد کریں۔ اس لڑکی کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ لڑکے والے وزیر آباد کے رہنے والے نہیں۔ اگر یہ خبر پھیل گئی کہ میری بیٹی بچڑی گئی ہے اور تھانے میں ہے تو لوگوں کو آپ جانتے ہیں، وہ لڑکے والوں تک خبر بچا دیں گے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل جاتے گا۔ لڑکا فوج میں لفٹیننٹ ہے۔“

”محترم!“ کیپٹن نے کہا۔ ”یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ لڑکی کے کہیں کہیں بتا دے اُس کے ساتھ کون کون تھا۔“

”یہ مجھے نہیں بتاتے گی۔“ چوہدری کرامت نے کہا۔ ”آپ خود پوچھ لیں۔“ اُس نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”وہ میرے سامنے مذہبی آئے تو اچھا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ جو جذبہ آپ میں ہے وہ مجھ میں نہیں۔ آپ اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے جب ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ پولیس کی آنسو گیس سے آج تک میری آنکھیں فراہ ہیں۔ میں پانچ مہینے جیل میں بند رہا تھا۔ حوالات میں انگریزوں کی پولیس نے مار مار کر میری اور میرے ساتھیوں کی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔ پاکستان بن گیا تو مجھے رہائی ملی تھی۔“

”اُس وقت کی کہانیاں اگر آپ اپنی اولاد کو سناتے تو آج آپ اس حالت میں تھانے نہ بیٹھے ہوتے۔“ تھانیدار نے کہا۔ ”بہر حال آپ کی یہ باتیں آپ کی بیٹی کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکتیں۔“

”اگر آپ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو باہر بیٹھیں۔“ کیپٹن نے کہا۔ ”آپ گھر جانا چاہتے ہیں تو چلے جاتیں۔ ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ آپ کی بیٹی کو ہم کب فارغ کریں گے۔۔۔ فارغ کریں گے۔“

”جی یا نہیں۔“ چوہدری کرامت بول اٹھا جیسے اُس کے کندھوں پر اُس کی اولاد کے گناہوں کا سارا بوجھ ڈال دیا گیا ہو یا جیسے وہ ایک ہی جست میں نوے برس کا ضعیف بوڑھا ہو گیا ہو۔ وہ تھانیدار کے دفتر سے نکلا اور ایک آؤٹ کی تالیقی میں غائب ہو گیا۔

”اے ادا سے۔“ کیپٹن نے تھانیدار سے کہا۔

”میں اُسے اندر بھیج دیتا ہوں۔“ تھانیدار نے اُٹھے ہوئے کہا۔ ”پہلے آپ اپنا طریقہ آزمائیں۔ میں اُسے آپ کے پاس چھوڑ جاؤں گا۔۔۔ لیکن کیپٹن طارق!“ تھانیدار نے مسکرا کر کہا۔ ”لڑکی خوبصورت ہے اور آپ ابھی نو عمر ہیں۔ اگر لڑکی جاسوس ہوتی تو آپ پر جادو چلا جائے گی۔ جاسوس عورتوں کے قصے آپ نے سنے ہوں گے۔“

”شاہ صاحب!“ کیپٹن طارق نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اگر جنگ نہ ہوتی تو میں شاید کچھ وقت کے لیے اس لڑکی کا جادو قبول کر لیتا لیکن اب قصہ کچھ اور ہے۔ مجھ جیسے لفٹیننٹ اور کیپٹن محاذوں پر لڑ رہے ہیں کٹ رہے ہیں ٹینکوں سے کرا رہے ہیں۔ مجھے وہاں ہونا چاہیے تھا لیکن میرا محاذ یہ ہے۔ ابھی تو اپنا ایمان زیادہ عزیز ہے۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔ اُسے لے آئیں۔“

تھانیدار سمع کو کیپٹن کے کمرے میں داخل کر کے چلا گیا کیپٹن طارق نے شمع کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ ہر لحاظ سے پرکشش لڑکی تھی اور بوجوان بھی تھی۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے کیپٹن طارق نے اُسے اپنے سامنے کرسی پر بٹھالیا۔

”کیا فائدہ آنسو بہانے کا۔“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”صرف اس سوال کا جواب دے دو کہ تم وہاں کیا کر رہی تھیں اور تمہارے ساتھ کون تھا۔“

وہ خاموش رہی کیپٹن اُسے دیکھتا رہا۔

”تم نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ تمہارا بڑا بھائی فوج میں لفٹیننٹ ہے؟“ کیپٹن طارق نے پوچھا۔

”تم نے تو یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہارا باپ کتنا معزز آدمی ہے اور وہ تمہارے رشتے کے لیے پریشان ہو رہا ہے۔“

”شمع کا سر جھکا رہا۔ وہ کچھ بھی نہ بولی۔“

”کب تک چپ رہو گی؟“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”ہم تمہارے بولنے کا انتظار نہیں کریں گے۔ تم جس جگہ بیٹھی ہوئی ہو، یہاں پھرتوں جیسے سخت چور اور ڈاکو بھی بول پڑتے ہیں۔“

”میں چور تو نہیں۔“ شمع نے سر اٹھا کر دبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے کہیں ڈاکہ بھی نہیں ڈالا۔“

”تم جاسوس ہو۔“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”تم اپنے ملک کو ڈنک مار رہی ہو۔“

”شمع یوں تڑپتی جیسے اُس کے جسم کے ساتھ بجلی کی نیکی تار لگا دی گئی ہو۔ اُسے پہلی بار جاسوس کہا گیا تھا۔“

”نہیں۔“ اُس نے کوئی ناگ آواز میں کہا۔ ”مجھ پر ایسا ذلیل الزام نہ لگائیں۔“

”تم جاسوس ہو۔“ کیپٹن طارق نے دانت پیس کر دھیمی سی آواز میں کہا۔ ”میں نے پہلے اس لئے نہیں جاسوس نہیں کہا تھا کہ تم خود مان جاؤ گی لیکن تم سمجھتی ہو کہ تمہارے آنسو نہیں بے گناہ ثابت کر دیں گے۔۔۔ شمع! اب مجھ سے شرافت کی توقع نہ رکھنا۔“

”مجھ پر بدظنی کا الزام عائد کر دو۔“ شمع نے کہا۔ ”مجھے چور کہہ لو۔ جو جی میں آئے کہہ لو، خدا کے لیے مجھے جاسوس نہ کہو۔“



”پھر تم وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟“ کیپٹن طارق نے پوچھا۔ ”اپنے یار سے ملنے گئی تھیں؟“  
 ”ہاں! شمع نے سر ہلا کر آہستہ سے کہا۔ ”یہ الزام صحیح ہے.... لیکن.... لیکن اُسے آپ بُرے  
 لفظوں میں یار نہ کہیں۔ میں اُسے ملنے گئی تھی۔“

”اُسے یا انہیں؟“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”کانیبل کہتے ہیں کہ تمہارے ساتھ تین آدمی تھے۔“  
 ”میرے ساتھ ایک ہی تھا۔“ شمع نے کہا۔ ”ہم دونوں لاتن کے ایک طرف کھڑے تھے اور  
 دو آدمی لاتن کے ساتھ ساتھ دوسری طرف جا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہم دونوں وہاں سے چل پڑے۔  
 آگے سے پولیس کے دو سپاہی آ رہے تھے۔ ایک نے لاکار کو کہا۔ ”خبردار۔ بھاگنا نہیں۔ وہیں رک جاؤ۔“  
 وہ دو آدمی لاتن سے ہٹ کر دوڑ پڑے۔ انہیں بھاگتے دیکھ کر میں جس کے ساتھ تھی، وہ مجھے  
 اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ میں اُس کی خاطر یہ خطرہ مول لے کر گھر سے نکلی تھی۔ اُس نے اتنا بھی نہ کیا کہ مجھے  
 اپنے ساتھ لے کر بھاگتا۔ میں بھی بھاگنے لگی لیکن سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا اور تھانے لے آئے۔“

”تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی؟“  
 ”اپنی بے عزتی سے ڈرتی تھی۔“ شمع نے جواب دیا اور چند سیکنڈ چپ رہ کر بولی۔ ”آپ خود  
 نوجوان نہیں معلوم نہیں آپ نے شادی کی ہے یا نہیں۔ آپ میرے جذبات کو سمجھتے ہونگے۔ اُس کے  
 ساتھ میرا تعلق وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“  
 ”پہلے اُس کا نام اور ایڈریس بتاؤ۔“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”اُس کے بغیر میں تمہیں رہا نہیں کر  
 سکوں گا۔“

شمع نے نام بھی بتا دیا ایڈریس بھی۔  
 کیپٹن طارق نے اُسی وقت تھانیدار کو بلا کر اس آدمی کا نام اور ایڈریس دیا اور کہا کہ اُسے فوراً  
 تھانے لایا جائے۔



”آپ نے مجھے جاسوس کیوں سمجھ لیا ہے؟“ شمع نے پوچھا۔  
 ”جاسوسوں کے سروں پر سینگ نہیں ہوتے شمع!“ کیپٹن نے کہا۔ ”وہ مجھ جیسے ہوتے ہیں۔  
 تم جیسے ہوتے ہیں۔ انہیں اسی طرح شک میں پکڑا جاتا ہے۔ وہ اتنے کچے نہیں ہوتے کہ فوراً تسلیم کر لیں کہ  
 وہ جاسوس ہیں۔ میں تم سے بھی توقع نہیں رکھتا کہ فوراً تسلیم کر لو گی کہ تم جاسوس ہو۔“  
 ”خدا کے لیے مجھے....“

”شمع! پہلے میری بات سن لو۔ کیپٹن طارق نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے بے چین سے لمبے  
 میں کہا۔ ”تم اگر غیر مسلم ہو تو اس وقت تک یہاں متنازل علیہ کچھ اور ہو چکا ہوتا۔ چونکہ تم مسلمان باپ کی بیٹی  
 اور ایک لفٹیننٹ کی بہن ہو اس لیے میں کوشش کروں گا کہ تم صرف باتوں سے مان جاؤ۔ نہیں مانو گی تو تم تصور  
 میں نہیں لاسکتیں کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔“

شمع کچھ کہنے لگی تھی۔ کیپٹن طارق نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے چپ کرادیا۔  
 ”جاسوس کا کام کیا ہوتا ہے؟“ کیپٹن طارق نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔

”ادھر کے فوجی راز اُدھر پہنچانا۔ ریل گاڑیاں اسلحہ بارود، تیل، پٹرول اور دیگر فوجی سامان سے لدی ہوئی محاذوں  
 کی طرف جاتی ہیں۔ جاسوس اور تحریک کاران گاڑیوں کو اپنے ہوائی جہازوں سے بان کے راستے میں بم  
 یا ڈائنامیٹ رکھ کر تباہ کر دیتے ہیں.... تم اپنے جوان بھائی کو تصور میں لاؤ۔ اُسے ایجنشن نہیں پہنچتا۔ اُس  
 کی یونٹ کی گاڑیوں کو پٹرول نہیں ملتا تو وہ دشمن کا مقابلہ کیسے کرے گا؟ دشمن کی مشین گنوں کی گولیاں اُس  
 کے جسم سے پار ہو جاتیں گی، یا گرنیڈ یا توپ کا گولہ اُس کے قریب پھٹ کر اُس کے جسم کے ٹکڑے بکھر  
 دے گا۔ تمہیں اپنے بھائی کی لاش بھی نہیں ملے گی.... تم اگر فوجیوں کو اپنے بھائی نہیں سمجھتیں تو اپنے بھائی  
 کو تو بھائی سمجھو۔ کیا تم اپنے بھائی کو دشمن سمجھتی ہو؟“

”نہیں۔“ شمع نے ٹپ کر کہا۔ ”میں پاکستان کی بیٹی ہوں۔ میں کسی فوجی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتی۔“  
 ”سنا ہے جس کے ساتھ تمہاری شادی ہو رہی ہے وہ بھی فوجی ہے۔“ کیپٹن طارق نے کہا۔  
 ”لفٹیننٹ ہے شاید!“

شمع نے آہ لی اور بولی۔ ”اسی شادی نے مجھے خراب کیا ہے۔ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں۔ میں  
 نے اس لڑکے کو دیکھا نہیں۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ وہ لفٹیننٹ ہے لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ اس کی ایک  
 وجہ یہ ہے کہ میں اُسے چاہتی ہوں جو ریلوے لاتن پر میرے ساتھ تھا۔“  
 ”کب سے؟“

”میں اُس وقت فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔“ شمع نے جواب دیا۔ ”بس اُس سے محبت ہو گئی اور  
 ہم نے شادی کے وعدے کر لیتے.... خدا جانتا ہے کہ ہماری محبت پاک رہی ہے۔ اُس کے والدین نے  
 میرا رشتہ مانگا تھا لیکن میرے ماں باپ نے انکار کر دیا۔ ہم پھر بھی ملتے رہے۔ میں نے اپنی امی سے کہا تھا  
 کہ میں اسی کے ساتھ شادی کروں گی لیکن وہ نہیں مانتی تھی۔ اب بھی نہیں مانتے تھے۔ میں نے اپنی پسند کے  
 اس لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کا اور کورٹ میں شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“  
 ”آج رات تم گھر سے بھاگ رہی تھیں؟“

”نہیں جی!“ شمع نے جواب دیا۔ ”یہ ہماری ویسے ہی ملاقات تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ جنگ کی جہ  
 سے لوگ رات کو باہر نہیں نکلتے۔ بلیک آؤٹ ہوتا ہے رات کو آ جانا۔ رات کو میں اتنی سے جھوٹ بول کر گھر  
 سے نکل گئی اور وہ مجھے مل گیا جہاں اُسے ملنا تھا۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے ریلوے لاتن کی طرف چلے گئے۔ ہمیں کہیں  
 چھپ کر بیٹھنا نہیں تھا۔ ہم واپس آ رہے تھے۔“

”کمرے کا دروازہ کھلا۔ تھانیدار اندر آیا اور کیپٹن طارق کو بتایا کہ وہ لڑکا آگیا ہے۔  
 ”اے آئیں اُسے!“ کیپٹن نے کہا۔ ”آپ بھی آجائیں۔“

تھانیدار ایک نوجوان کو اندر لایا۔  
 ”یہ تھا؟“ کیپٹن طارق نے شمع سے پوچھا۔  
 ”جی!“

”کیوں جوان!“ کیپٹن نے اُس سے پوچھا۔ ”اُس کے ساتھ تم تھے؟“  
 نوجوان نے شمع کی طرف دیکھا پھر کیپٹن طارق کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ کا تاثر  
 آگیا۔

”بولویار!“ کیپٹن نے اُسے کہا۔ ”گھبراتے کیوں ہو؟ تم سے تو یہ لڑکی دیر رہے جس نے ساری بات سنا دی ہے۔“

”نہیں جی!“ نوجوان نے گھبراتے ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں تو اس کے ساتھ نہیں تھا۔“  
 ”اوتے رشید!“ شمع نے حیرت سے کہا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں یہاں مجھ پر جاسوسی کا الزام لگ رہا ہے۔“

”نہیں جی.... نہیں جی۔“ نوجوان رشید نے خوفزدہ آواز میں کہا۔ ”میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ میں.... میں.... خدا کی قسم، میں جاسوس نہیں ہوں۔ یہ اکیلی گئی ہوگی۔“

”کہاں گئی ہوگی؟“ کیپٹن نے پوچھا۔ ”کہاں تھی یہ؟“  
 ”ریلوے لائن پر۔“ رشید نے جواب دیا اور فوراً سنبھل گیا۔ ”بھلا کر بولا۔“ مجھے کیا پتہ ہے یہ کہاں تھی۔“

کیپٹن طارق نے اٹھ کر اُس کے منہ پر ڈے سے زور سے تھپڑ مارا۔ رشید گسوا تو وہ سنا تھپڑ تھانیدار نے مارا۔

”بزدل!“ کیپٹن طارق نے اُس کے سر کے بال سٹھی میں لے کر جھٹکا دیا اور کہا۔ ”تم اس کے ساتھ نہیں تھے تو تمہیں یہ کس طرح پتہ چلا ہے کہ اسے ہم نے ریلوے لائن سے پکڑا ہے؟“  
 ”کیپٹن نے تھانیدار سے کہا۔“ شاہ صاحب! اس کی تلاشی لیں اور اسے حوالات میں بند کر دیں پھر اس کے گھر کی تلاشی لیں گے۔“

رشید نے ہاتھ جوڑ دیئے اور وہ رونے لگا۔ کیپٹن طارق نے تھانیدار کو بتایا کہ شمع نے کیا بیان دیا ہے۔ دونوں نے شمع کی طرف دیکھا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

”اوپر دیکھو شمع!“ کیپٹن طارق نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”کیا تم اس کہنے کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا ارادہ کئے ہوئے تھیں؟ کیا تم اسے مرنے دیتی رہی ہو؟“ اُس نے رشید کا ایک کان پکڑ کر زور سے مروڑا اور پوچھا۔ ”کیوں اوتے بے غیرت! کیا تو اسے گھر سے بھاگ لے جاتا؟ تجھ میں اتنی جرات ہے؟“

”یہ خود کہتی تھی۔“ رشید نے دوسری تیسری جماعت کے نالائق بچے کی طرح روتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے اسے گھر سے بھاگنے کو کہا تھا۔“

شمع نے اُسے جاہل عورتوں کی طرح گالیاں دینی شروع کر دیں۔ رشید شمع کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔

”سن اوتے فلمی مجنوں!“ تھانیدار نے پیچھے سے رشید کی گردن پکڑ کر پوچھا۔ ”اس کے ساتھ تم ریلوے لائن پر کیا کرنے گئے تھے؟“

”مجھے نہیں۔“ رشید نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”خدا کی قسم، اس سے پوچھ لو۔ اس کے ساتھ میری محبت پاک ہے۔ یہ اُس قسم کی محبت نہیں، خدا کی قسم۔“

”تم اس قابل ہو ہی کہاں کہ اس قسم کی محبت کر سکو؟“ کیپٹن طارق نے اس کے بازو کو اٹکھیل سے دبا تے ہوئے کہا۔ ”فلموں اور فلمی کانوں کے مارے ہوئے تم جیسے بیوقوف محبت کے

بی آربی بتے رہے کی

سوا کر ہی کیا سکتے ہیں۔ تم کاغذی مکوڑے! تم پاکستان کا نام کیا روشن کرو گے۔“ کیپٹن طارق سنس پڑا اور بولا۔ ”محبت سرکٹا.... کتنا ہے یہ اُس قسم کی محبت نہیں۔ اوتے میری سن!.... تو کسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کے قابل نہیں۔ میں تیری شادی فوج کے کسی لاکھری کے ساتھ کروں گا۔ تم مروانہ کپڑے پہن کر بہرہ دیتے بنے ہوئے ہو.... اس لڑکی کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ کیوں آئے تھے؟“

رشید کیپٹن کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ تھانیدار نے پیچھے سے اُس کی گردن پر زور دار تھپڑ مار کر کہا جواب دو۔ رشید نے جواب دینے کی بجائے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔

”بول اوتے سیٹج ڈرائے کی تیر دن!“ کیپٹن طارق نے رشید کے پیٹ میں انگلی چھو کر پوچھا۔ ”اسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ کیوں آئے تھے؟“

”سپاہی آگے گئے تھے نا!“ رشید نے روتے ہوئے جواب دیا۔

”اور جس کے ساتھ تم پاک محبت کرتے تھے اسے سپاہیوں کے پاس چھوڑ آئے تھے؟“ کیپٹن نے پوچھا۔

”میں نے اسے کہا تھا بھاگ آؤ۔“ رشید نے جواب دیا۔ ”یہ کتنی تھی مست ڈرو ہمیں کہا تو نہیں جاتیں گے۔“

”پھر تم اکیلے بھاگ آئے۔“  
 ”اور کیا کرتا جی!“

”شاہ صاحب!“ کیپٹن طارق نے تھانیدار سے کہا۔ ”ڈرا دیکھیں، اس لڑکی کے دل صاحب باہر ہیں یا چلے گئے ہیں؟“

”وہ تیار وہ اُس وقت سے باہر بیٹھا رو رہا ہے۔“ تھانیدار نے کہا۔  
 ”انہیں بلا لیں۔“



”اس لڑکے کو آپ جانتے ہیں؟“ چوہدری کرامت علی اندر آیا تو کیپٹن طارق نے اُس سے پوچھا۔ ”آپ بیٹھ جاتیں۔“

”اچھی طرح جانتا ہوں بیٹا!“ چوہدری کرامت نے ماری ہوئی اور محبوبی آواز میں کہا۔ ”ہمارے محلے کا لڑکا ہے۔“

”اس کے ماں باپ نے اس کے لیے آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا؟“  
 ”ماں بیٹا!“ چوہدری کرامت نے جواب دیا۔ ”مانگا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔“

”کیوں؟“  
 ”آوارہ ہے جی!“ چوہدری کرامت نے جواب دیا۔ ”آپ خود دیکھیں۔ یہ صرف خوبصورت ہے۔ باقی اسے دیکھ لیں۔“

کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک کاسٹل اندر آیا اور کہنے لگا کہ باہر دو عورتیں آتی ہیں۔ ایک اس لڑکی کی ماں ہے۔ وہ رو رہی ہے اور بار بار ادھر آتی ہے۔ رکتی نہیں۔ اس کا کیا کریں؟



”بھیس دو اندر آ — کمیٹن طارق نے کہا۔  
شمع کی مال کمرے میں آئی۔ اُس کے ساتھ ہاجرہ تھی۔ کمیٹن طارق کی نظریں ہاجرہ پر جم گئیں۔

”میری بیوی ہے۔“ چوہدری کراست نے کہا۔ ”اور یہ ہماری نوکرانی ہے۔“  
چوہدری کراست کو کٹھیل تھانے لے آیا تھا اور شمع کی مال گھر بیٹھی پریشان ہوتی رہی جب اُس  
بہت گزر گئی اور چوہدری کراست واپس نہ آیا تو وہ ہاجرہ کو ساتھ لے کر تھانے آگئی۔ اپنی بیٹی کو تھانے  
میں دیکھ کر وہ روئی بھی بیٹی کو کو سا بھی اور اُدھم بھی بپا کیا۔ اُس نے رشید کو دیکھا تو اُس نے اپنے گولہوں  
پر ہاتھ رکھ لیے۔

”یہ تھا تیرے ساتھ؟“ مال نے رشید کی طرف اشارہ کر کے شمع سے پوچھا۔ شمع نے  
آہستہ سے سر ہلایا تو اس عورت نے رشید کو ہلار کے بے شمار گالیاں دے ڈالیں پھر اُس کے منہ میں  
دھتورے دے دے کر کہنے لگی۔ ”تجھے ہم نے دھتورہ دیا تھا پھر بھی تو نے میری بیٹی کا سچا نہیں چھوڑا۔  
تو اصل بد معاش ہے۔ تیری مال کی بد معاشیاں سارا شہر جانتا ہے۔“ مال نے تھانیدار سے کہا۔  
”یہ میری بیٹی کو درغلا رہتا ہے۔“

”آپ کی بیٹی سچی تو نہیں؟“ تھانیدار نے کہا۔ ”جوان اور بالغ لڑکی ہے۔ آپ صرف اسے  
گالیاں نہ دیں۔“

”صاحب جی! — ہاجرہ بول پڑی۔“ یہ مجھے ہر روز چھیڑتا تھا۔ میں بازار جاتی ہوں تو یہ راستے  
میں ضرور کھڑا ہوتا ہے۔ مجھے اشارے کرتا ہے اور پیسے بھی دکھاتا ہے۔ اس کے پاس بجلی کے بغیر  
چلنے والا ریڈیو ہوتا ہے جو ہر وقت گانے سناتا رہتا ہے۔“

”ان دنوں جب کافر بھی مسلمان ہو گئے ہیں، اس لڑکے نے اپنا رویہ وہی رکھا ہوا ہے۔“  
چوہدری کراست نے کہا۔ ”اس کی بد معاشیوں میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا۔“  
رشید چپ چاپ کھڑا تھا۔ شمع سر جھکا کر بیٹھی تھی۔ چوہدری کراست اور اُس کی بیوی رشید کے  
خلاف کبھی باری باری اور کبھی اکٹھے بول رہے تھے۔

تھانیدار اور کمیٹن طارق نے سب کو باہر نکال دیا۔ انہوں نے کچھ دیر آپس میں صلاح مشورہ کیا  
اور شمع کے باپ کو اندر بلایا۔

”ہم نے آپ کی عزت کا بہت خیال کیا ہے۔ کمیٹن طارق نے کہا۔ ”آپ اپنی بیٹی کو گھر  
لے جائیں۔ میں آپ سے ملکہ لکھوالوں کا جب اور جس وقت آپ کی بیٹی کو تھانے بلایا جائے آپ  
اسے تھانے لے آئیں۔ اس لڑکے کو ہم ابھی رہا نہیں کریں گے۔ ہمیں نفیث کر دینی ہے۔ میں آپ سے  
یہ توقع بھی رکھوں گا کہ آپ اپنی بیٹی کی نگرانی کریں گے۔ میں آپ کو شاید پہلے بچہ چکا ہوں کہ مجھے پاکستان  
کی عزت اور سلامتی عزیز ہے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہو تو میں آپ کی عزت اور شرافت کی  
پروا نہیں کروں گا۔“

رشید کو انہوں نے مز قیثش کے لیے تھانے میں روک لیا اور شمع کو اپنے مال باپ کے ساتھ  
جانے کی اجازت دے دی۔

دشمن کا بگچید بیدیاں کے محاذ پر بڑھتا آ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ سائنس سے گزرنا چاہتا ہے۔  
انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف نے اعلان کیا تھا کہ ۶ ستمبر صبح نو بجے وہ لاہور پر قبضہ کر چکا ہوگا اور وہ  
جہم خانہ کلب میں دھبکی سے فتح کا جشن منائے گا لیکن جنگ کا تیسرا دن گزر رہا تھا اور جنرل چوہدری  
کی انڈین آرمی ابھی بی۔ آر۔ بی کے قریب نہیں آ سکی تھی۔ خاکی وردی والے سرفروشلوں نے دشمن کے  
لیے لاہور کے وہ تینوں راستے بند کر دیئے جن سے اُس نے گزر کر لاہور پر قبضہ کرنا تھا۔

ایک راستہ ہٹا پور کا تھا۔ دوسرا ہٹا پور کے شمال میں بھینی کا پل تھا اور تیسرا برکی۔ لاہور کے دفاع  
میں لڑنے والوں نے دشمن کے لیے یہ راستے اسی کی لاشوں سے بند کر دیئے تھے۔ دشمن کی ایسی  
بیہت ناک قوت اور اتنی زیادہ نفی کو دیکھ کر جنگی مشینیں سوتھ بھی نہیں سکتے تھے کہ مٹھی بھر پاکستانی لاہور  
کو بچانے کے لیے دشمن کو بی۔ آر۔ بی کے پار ہی روک سکیں گے۔ مگر وہ ناممکن کو ممکن کر دکھا رہے تھے۔  
ان مٹھی بھر جوانوں کے سر پر خدکا اور مٹھی پر قوم کا ہاتھ تھا۔ لوگوں نے اپنی فوج کے لیے  
اور جو کچھ کیا سو کیا۔ انہوں نے محاذوں پر قرآن پاک کے چھوٹے سائز کے نسخے ہزاروں کی تعداد میں بھیج  
دیئے تھے۔ تقریباً ہر جوان کے گلے میں یا جیب میں قرآن کا نسخہ تھا۔

لاہور کا ایک دروازہ قصور بھی تھا۔ اسے ہمارے جانبازوں نے نہ صرف بند کر دیا تھا بلکہ دشمن  
کو پیچھے دھکیلنے کے لیے اُس کے علاقے پر قابض ہو گئے تھے۔ اس طرح جنگ ہندوستان کی زمین  
پر چلی گئی تھی۔

اب بیدیاں سائنس رہ گیا تھا۔ دشمن اس راستے پر اپنی قسمت آزمایا رہا تھا۔ ایسٹ بنگال جرنل  
کو سائنس کے اگلے علاقے سے پیچھے ہٹا لیا گیا تھا۔ دشمن نے اسے شاید پانی سمجھ لیا تھا۔ اُس کا  
توپ خانہ قیامت کی گولہ باری کر رہا تھا اور اُس کے ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور انفنٹری آگ اگلتی آرہی تھی۔  
نائب صوبیدار بدراحتی نے سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال کو فاکس بول سے نکال لیا تھا۔ ایک طرف اُس  
کا وائرس آپریٹر تھا جو اُسے بار بار کمپنی یا جلیں ہٹا کر ٹرک کا کوئی پیغام دیتا تھا۔ دوسری طرف نائب صوبیدار  
بدراحتی اُسے چلا چلا کر بتا رہا تھا کہ دشمن جس شدت سے آ رہا ہے۔ اسے روکنا آسان نہیں ہوگا۔  
”پلاٹون کا پوچھیں ٹھیک نہیں شاب! — بدراحتی نے کہا۔

”نائب صاحب! — اقبال نے چلا کر کہا۔ ”آپ میرا دماغ کیوں چاٹ رہے ہیں۔ پوزیشن  
ٹھیک نہیں ہے تو جاؤ اور ٹھیک کرو۔“

نائب صوبیدار ہوا میں اڑتی گولہوں اور گولوں کے ٹکڑوں کو چیرتا کر دو غبار میں غائب ہو گیا۔ گولہ  
سے ایک فٹ بلند ہوا۔ ”پاکستان... جندہ باد۔“ اقبال کو اس نعرے نے بلا ڈالا۔ اُسے ایسے لگا  
جیسے کسی نے اُسے دھکا دیا ہو۔ وہ نہر کی طرف دوڑا اور کنارے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُس نے دور بین  
آنکھوں سے لگائی تو اُس کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ گولہ دو غبار میں اسے جو کچھ نظر آیا اس نے اُس پر گھبراہٹ  
طارق کردی۔ دشمن کے ٹینک کم و بیش چھ سو گز دور کر گئے تھے اور انفنٹری ٹینکوں سے تقریباً  
ایک سو گز آگے مورچے کھود رہی تھی۔ بکتر بند گاڑیاں آہستہ آہستہ آگے آرہی تھیں۔ ان کی مشین گنیں  
اور ٹینکوں کی توپیں آگ آگ رہی تھیں۔



اقبال کی حالت بھرے میلے میں بھٹکے ہوئے بچے کی سی ہو گئی۔ اس کی پلاٹون اس کے نائب صوبیدار کے زیرِ کمان آچکی تھی۔ وہ اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا۔ شرمندگی اسے الگ پریشان کر رہی تھی۔ اس کی باقی بٹالین نہر کے کنارے سے دور دور تک بکھری ہوئی گرد میں چھپ گئی تھی۔ نظری ملاپ ٹوٹ چکا تھا۔ پلاٹون کا دائرہ لیس آپریٹر ایک گولے سے زخمی ہو گیا تھا لیکن بنگال کا یہ مسلمان غموں کی پرواہ کیے بغیر اپنے سیٹ کو سنبھالے زخموں پر فیلڈ ٹی لیٹ رہا تھا۔

اقبال نے بے بس ہو کر چائنا نہ وہ سوال دھا کی اول میں اپنی دھڑائی چٹھائی پلاٹون کسے نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اس کے قریب ایک اور گولہ پھلا۔ وہ بدک کر آگے کو بھاگا اور نہر کے کنارے پر جا پڑا۔ دشمن کے لیے وہ بڑا صاف تارگیٹ بن گیا لیکن پاک چھپکتے نہر کے کنارے پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ زمین دھماکوں سے لرز رہی تھی۔ تیجے سے پال آرٹری کی توپیں دھاڑ رہی تھیں اور ان کے پیچھے گولے اس کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

اس کی نظریں بی آر بی کی روانی پر جم گئیں۔ اس نے نہر میں کود جانا چاہا لیکن اس نے دیکھا کہ نہر میں لاشیں ہی جا رہی تھیں۔ یہ تمام لاشیں بھینی اور باٹاپور کی طرف سے آرہی تھیں۔ ان میں دو تین لاشیں خاکی وردی میں لمبوس تھیں۔ ان شہیدوں کا یہی کفن تھا۔ انہیں پکڑنے اور نہر سے نکالنے کی کسی کوشش نہیں تھی۔

بہتی ہوئی لاشوں میں دیہاتیوں کی لاشیں بھی تھیں۔ یہ بد نصیب سرحدی دیہات کے رہنے والے تھے جو وقت سے پہلے بھاگ نہ سکے۔ انہوں نے جنگ کے دوران تیر کر نہر پار کرنے کی کوشش کی تھی۔

ان لاشوں میں اس کنارے کے ساتھ ساتھ اقبال کو دو سفیدی گٹھڑیاں بہتی دکھائی دیں جب گٹھڑیاں اس کے قریب سے گزریں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک جوان سال عورت کی لاش تھی اور اس کے پہلو میں ننھے سے ایک بچے کی لاش ہی جا رہی تھی۔ اقبال کو معانیال آیا کہ ہندوستانیوں نے پاکستان کے سرحدی دیہات میں تباہی مچا دی ہوئی ہے۔ اسے تلخ سا خیال آیا کہ یہ کسی غیرت مند پاکستانی ماں کی لاش ہے جس نے اپنی آبرو بچانے کی خاطر اپنے بچے سمیت نہر میں چھلانگ لگا دی ہوگی۔ اس کا خاندان شہید ہو گیا ہوگا۔ اس کے بھائی بھی ضرور شہید ہو گئے ہوں گے۔

لاش کی آنکھیں کھلی تھیں اور منہ کنارے کی طرف تھا۔ اقبال کو یوں لگا جیسے پاکستان کی یہ غیور ماں اسے ہی دیکھ رہی ہو۔ بچے کی آنکھیں بند اور مصوم سے چہرے پر کرب اچھڑتا تھا۔ منہ ماں کی طرف مڑا ہوا تھا۔ اقبال کے جسم نے جھرجھری لی۔ اس نے محسوس کیا جیسے بچے نے نفرت سے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا ہو۔ عورت کی لاش کی ٹھمری ہوئی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جیسے اقبال سے کہہ رہی ہوں۔ "تجھ جیسے گھبر جانوں کے جیتے جی میں اکو تے بچے سمیت ڈوب مری ہوں۔"

قیامت کی گولاباری اور الیٹ بنگال جمنٹ کی بے پناہ جوالی فائرنگ کے فلک کشی و دھماکوں میں اقبال کو سرکوشی سانی دی۔ اقبال جی! بے آسرا لوگ رانی کو چھپنا چاہئے تو نہیں کسی بھائیوں والی بہن کو جا چھپونا!

"شاب! — اسے اپنے قریب اپنے نائب صوبیدار کی آواز سانی دی — پلاٹون کے آگے کر دیا ہے۔"

"دشمن کا فائر پاور بہت زیادہ ہے۔" اقبال نے کہا۔ "نہر پار کر لے گا۔" "شیکے گا نہیں۔" نائب صوبیدار نے غصیلی آواز میں کہا۔ "شیکے گا نہیں شاب! پاور جیاستی ہے تو ہم بھی مشکمان ہے۔ پچھڑاؤ دے شو شاب!"

"فائر آرڈر! — اس نے زیر لب کہا اور اسے یاد آگیا کہ وہ پلاٹون کمانڈر ہے، اسے دشمن کو دیکھنا اور پلاٹون کو فائر آرڈر دینا ہے۔ اس نے دوہین سے دشمن کو دیکھا۔ اسے جو ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور دشمن کے سپاہی مورچے کھودتے دکھائی دے رہے تھے، ان کا اس نے نظروں سے اور ٹینک میں بنائے ہوئے طریقوں سے فاصلہ نہ پایا لیکن فائر آرڈر کے متعلق سوچا تو اس نے اپنے ذہن کو خالی پایا تارگیٹ انڈیکیشن اور فائر آرڈر جیسے اہم سبق اس کے ذہن سے یوں صاف ہو گئے تھے جیسے کبھی پڑھے ہی نہیں تھے۔

"اقبال شاب! — نائب صوبیدار بدراحتی نے اس کے کان میں چلا کر کہا۔ "آؤ دے شو شاب... دشمنس بولو... بولو... بولو اقبال شاب!"

"دشمنس چھ سو... آٹھ سو... کوکا۔" اقبال نے یوں کہا جیسے اس کے جسم اور دماغ کا رشتہ ٹوٹ گیا ہو۔

وہاں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ وقت غلط فائر آرڈر کا نہیں تھا اور وہ وقت غلط کمانڈر کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ وقت کا تقاضا اور مطالبہ صرف ایک تھا۔ دشمن کو نہر کے اس طرف روکو۔ جانیں قربان کر دو۔ پاکستان پر جو وقت آن پڑا تھا، وہ جانوں کے نذرانے مانگ رہا تھا۔

سیکنڈ لیٹینٹ اقبال نائب صوبیدار بدراحتی کے سامنے طفل محنت تھا لیکن بدراحتی اقبال کے حکم کا پابند تھا۔ بدراحتی نے اپنے "شاب" کو دیکھا پھر دشمن کو دیکھا۔ دشمن کی فائر پاور دیکھی تو وہ اقبال کو اکیللا چھوڑ کر اپنی پلاٹون کی پوزیشن کی طرف دوڑا گیا۔ اس نے کسی کے حکم کے بغیر پلاٹون کی کمانڈ سے لی۔

"منبر لو پلاٹون! — وہ چلا یا۔ "دشمنس نو سو... دشمن ایڈنس کرتا... اپنا تارگیٹ۔ اپنا ہم۔" پھر اس نے بنگالی میں چلا کر کچھ کہا۔ اس کی پلاٹون کی شین گنوں اور انٹوں کے منہ کھل گئے۔ اس کے ساتھ ہی بنگالیوں نے فائر کے مسلسل دھماکوں سے بلند پاک فوج کا مخصوص نعرہ جیدی لگایا۔ نائب صوبیدار بدراحتی نے دوڑ دوڑ کر بڑی مشین گنوں کی اور آر آر کی پوزیشن ذرا اسی بدل دی۔ آر آر کے گنر دشمن کی بکتر بند گاڑیوں کو نشانہ بنانے لگے۔ نشانہ بنانا آسان کام نہیں تھا کیونکہ دشمن کی طرف سے اس قدر گولیاں اور اسٹن زیادہ گولے آرہے تھے کہ سر اوپر اٹھانا خودکشی تھی لیکن بنگال کے جوان پنجاب کے دفاع میں خودکشی معرکہ لڑ رہے تھے۔ وہ سر اٹھاتے تھے، سامنے دیکھتے تھے، گرد میں دشمن کو ڈھونڈتے اور فائر کرتے تھے۔





ہاجرہ کی دو برس پرانی آواز اقبال کے لاشور سے ابھر کر اس کے کانوں میں گونجی تو وہ تڑپ اٹھا۔ مال اور پیسے کی لاشیں بہتی آگے نکل گئیں۔ اقبال نے یقین کی حد تک محسوس کیا کہ وہ ہاجرہ کی لاش تھی۔ اُسے بھی محسوس ہوا جیسے ہاجرہ اُسے مرتے مرتے کہتی ہو۔ "اقبال جی! تم ہندو ہو۔ ہندوؤں نے نہتی مسلمان عورتوں کی آبرو لوٹی ہے۔ تم نے میری آبرو پر حملہ کیا تھا۔ تم بھی ہندو ہو۔۔۔ تم ہندو ہو۔"

اقبال کو چکر آنے لگے۔ ایک ہی راہ فرار نظر آئی کہ نہر میں ڈوب مرے اور اُس کی لاش ان لاشوں کے ساتھ بہتی پاکستانیوں کی نگاہوں سے اچھل ہو جائے۔ وہ بھول گیا کہ وہ سیکنڈ لیفلینٹ ہے۔ وہ بھگڑا تھا۔ جنگ کی ہولناکی سے ہی نہیں وہ اپنے آپ سے بھی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ اچھل کراٹھا اور نہر کے کنارے سے اُتر آیا۔ اُسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اُس کا نائب صوبیدار اور اُس کی پلاٹون کے جوان اقبال ہی کو نہیں ساری دنیا کو فراموش کر کے بلکہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر کے اُس دشمن پر آگ برسا رہے تھے جو بیدیاں کے راستے لاہور میں داخل ہونے کے لیے حملہ آور ہو رہا تھا۔



اقبال پیچھے آیا اور کچھ زیادہ ہی پیچھے آگیا۔ پیچھے چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ گولوں کے دھوئیں کی گھٹاؤں میں اقبال کو نو دس برس کی ایک بچی جیتی چلاتی، تھر تھر کاہنتی، تیز بھاگتی نظر آئی۔ وہ شاید قریب کے گاؤں میں کہیں چھپی رہی تھی۔ گاؤں تو دور وزبوسے خالی ہو گیا تھا، مگر یہ بچی جانے کہاں دبی رہی تھی۔ اقبال جاگ اٹھا۔ اُس کے احساسات میں بھونچال سا آگیا اور وہ بچی کو اٹھا کر سینے سے لگا لینے کو دوڑا لیکن بھارتی توپ خانے کا ایک گولہ بچی سے ڈیڑھ دو گز کے فاصلے پر پھٹا۔ شعلہ چمکا۔ گرد اڑی، پتھر اڑے، لوہے کے لال انکارہ بھڑکے۔ بچہ سے جسم کو چیرتے فضا میں بکھر گئے۔ اقبال اس گولے سے نہ ڈرا۔ وہ دوڑتا گیا مگر نہی سی بچی کا جسم خون کا لوتھڑا بن چکا تھا۔ بچی کھسے آنکھیں کھلی تھیں اور اقبال کو ٹھکنے کی مانند دیکھ رہی تھیں۔ یہ ننھی ننھی دو آنکھیں، سینکڑوں، ہزاروں لاکھوں بچہ کھڑوں آنکھیں بن گئیں اور اقبال کو یوں لگا جیسے پاکستان کی لاکھوں معصوم بچیوں کی لاشوں کی آنکھیں اسے گھور رہی ہوں۔

اقبال کی سوتج اور فخر کے دھارے خشک ہو گئے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دوسرے لمحے چند گز دور ایک گولہ پھٹا جس کا ذرا سا ٹکڑا اقبال کے کال پر آ لگا۔ وہ خوش نصیب تھا کہ کھڑا ڈرا جتنا تھا اور ترچھا آیا تھا۔ نہ دونوں گولوں کو چیرنا گز جانا۔ اقبال نے زخم کھا کر پروا نہ کی اور بچی کی لاش پر چبھا۔ اقبال کے زخمی کال سے خون کے قطرے گرے اور بچی کے خون میں جذب ہو گئے۔ اُس نے اپنے کال پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ کو دیکھا۔ خون سے لٹخا ہوا تھا۔ اُس نے بچی کے خون کو دیکھا۔ بچی کے خون کا رنگ بھی وہی تھا۔ لال نہر، پاکستانی خون!

اقبال کے سینے میں ہولناک دھماکہ ہوا۔ اُسے چکر آیا لیکن سنبھل گیا۔ جب وہ اٹھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اُسے بچی کی لاش کے پاس بیٹھے ایک مدت گزر گئی ہو لیکن یہ سب کچھ ایک

نمائیے میں ہو گیا تھا۔ وہ اٹھا تو اُس نے اپنے جسم میں انوکھی سی قوت محسوس کی۔ نہ اُسے خوف آ رہا تھا۔ نہ مرجانے کا خدشہ باقی تھا۔ کال کے زخم سے درد کی میس اکٹھی۔ وہ تڑپا جیسے پاکستان کی کسی بہن نے اُس کے منہ پر پتھر مار دیا ہو۔ اوباش اقبال مر گیا اور اس کے وجود سے پاکستان کی آبرو پر مرٹنے والے اقبال نے جنم لیا۔

اقبال پر پنجابی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُسے بھولی لہری باتیں یاد آ گئیں۔ اُسے فار آرڈر اور تاریکیت انڈی کمیشن کے سبق بھی یاد آ گئے۔ اُسے یہ بھی یاد آ گیا کہ جنہیں اُس نے بنگال کے مچھ سے سمجھا تھا وہ دشمن کی ہولناک آتشیں اور آہنی قوت کے سامنے آگ کی دیوار بنے ہوئے ہیں اور یہ بھی یاد آ گیا کہ اُس کی بٹالین کو بنگال ٹائیگرز کہتے ہیں۔ آج وہ سچ مچ کے ٹائیگر بن گئے تھے۔ اللہ کے شہید!

اقبال نے اپنی پلاٹون کے ڈیپلا سے اور پوزیشن کا جائزہ لیا پھر دشمن کی طرف دیکھا۔ وہ دوڑ کر اپنے نائب صوبیدار کے پاس گیا۔ نائب صوبیدار میڈیم مشین گن فائر کر رہا تھا کیونکہ اس گن کے دونوں جوان شدید زخمی ہو گئے تھے۔

"نائب صاحب! اُس نے کہا۔" اُس مشین گن اور آر آر کی پوزیشن ٹھیک نہیں۔ آپ...  
"آپ خود دیکھو شاب! نائب صوبیدار بولا۔" یا سین گن سنبھالو۔ جسم اُدھر کو دیکھو گا۔  
"ٹھیک ہے صاحب! اقبال نے کہا۔" میں دیکھوں گا۔" اور وہ دوڑ کر مشین گن اور آر آر والی جیب کی پوزیشن بدلنے لگا۔ ذرا سی دیر میں اقبال نے تجربہ کار کمانڈر کی طرح پلاٹون کی مختصر فریغ اور تھوڑے سے ہتھیاروں کو اس طرح ترتیب دے لیا کہ چند ایک جوان اور تھوڑا سا اسلحہ دشمن کا زیادہ سے زیادہ نقصان کرنے لگا۔ اسلحہ سے زیادہ تو بنگالیوں کا جذبہ لڑ رہا تھا۔ سانولے سانولے بنگالی مورچوں سے نکل نکل کر نہر کے کنارے کے اوپر جا کر فائر کرنے کو بڑھ رہے تھے۔ ان کے انداز اور ان کے نعروں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نہر پھلانگ کر بھارتیوں کے ساتھ دست بستہ جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔

ایک راکٹ لانچر کے گز کی پشانی میں گولی لگی اور بنگال کا ایک شیر تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اقبال اُس کی طرف دوڑا اور شہید کی لاش کو بازوؤں پر اٹھالیا۔ وہ لاش اٹھا کر پیچھے گیا۔ اُدھر سے سسٹر بچہ نہر آ گئے۔ اقبال نے لاش کو سسٹر بچہ پر ڈالا اور وار فٹنگی سے اُس کا ہاتھ چوم کر بازو اُس کے سینے پر رکھ دیا۔ لاش کو سسٹر بچہ نہر اٹھا لے گئے۔ اقبال نے اپنے سینے میں شعلہ سا جلتا محسوس کیا جس کی تپش سے وہ پاگل سا ہو گیا۔ وہ سپریم کی طرح اچھلتا کودتا اپنی پلاٹون کی پوزیشن تک آیا۔ دشمن کے ٹینکوں اور مارٹرول کے گولے اوشین گھنوں کی بوچھاڑیں نہر کے اس کنارے کو بے رحمی سے زدیں لیے ہوئے تھیں۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ انڈی کمیشن کے غازی سپاہی آتے تو جنگ کا کوئی بھی ماہر حیران نہ ہوتا لیکن بنگال ٹائیگرز کو یہ احساس دیوانہ کیے جارہا تھا کہ پنجاب کی لاج ان کے ہاتھ ہے۔ فوراً ہی دیر پہلے ان کا حوالہ دساری پلاٹون کو لکھا کہ بنگالی زبان میں کہہ چکا تھا۔ "بنگالیو! تمہارے دائیں بائیں پنجابی اور پٹھان لڑ رہے ہیں۔ کوئی یہ نہ کہہ دے کہ بنگالی پنجاب کو نہیں بچا سکے۔" اور نائب صوبیدار نے انہیں

دن اور رات کام ممبرز  
برائے اقبال

کہا تھا۔ کسی اور طرف سے دشمن نہر پار کر لے تو پروا نہیں۔ ہماری پوزیشن سے دشمن نہر کے قریب نہیں آنا چاہیے۔



اقبال کی پلاٹوں کے عہدیدار اور جوان حاضر دماغی اور شجاعت کے حیرت انگیز مظاہرے کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو آوازیں دے دے کر ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اقبال نے دشمن کی بکتر بند انفنٹری کی پوزیشن دیکھ کر اپنی آر آر کی جیپ کو ایک اور جگہ کر دیا۔ وہ نہر کے کنارے پر جاتا، دشمن کو دیکھتا اور آر آر فائر کرتا تھا۔

”شاب آڈلے نوٹ۔ اس کے حوالدار نے گلا پھاڑ کر اسے کہا۔ ”ٹینک میں دشمن کو جیاستی“ تارگیٹ مت نہیں دیو۔ لیکن اقبال نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بتائے ہوئے تارگیٹ پر آر آر والوں نے گولے فائر کر کے دشمن کے ایک ٹینک کو آگ لگا دی اور ایک ٹینک کا ٹریک توڑ دیا۔ ٹینک کی گئیں فائر کرتی رہیں مگر وہ ملنے کے قابل نہ رہا۔ آر آر کی ایک ڈائریکٹ ہٹ سے وہ بھی تباہ ہو گیا۔ اس کے کمریو کو ٹینک سے کودتے دیکھا تو مشین گن نے انہیں دو بوجھاڑوں میں ٹینک کے قریب ہی ٹھنڈا کر دیا۔

انڈین ایئر فورس کے دو بمبار طیارے خامی بلندی پر آتے اور بی آر بی کے سائنس پر ایک ایک ہزار پاؤنڈ کے چارجم گرا گئے۔ بم بکھر کے پھٹے۔ دو سائنس سے دور نہر میں اور دو دوسرے کنارے سے بھی دور۔ نہر کا پانی میسوں فٹ اوپر اچھلا اور دیہاتیوں کی کئی لاشیں جو ہٹاپور کی طرف سے ہتی آر بی تھیں پانی کے ساتھ اوپر اٹھیں اور اس کنارے سے پرے جا گئیں جس طرف بھارتیوں کے مورچے تھے۔ بموں سے سائنس محفوظ رہا۔ دشمن نے سائنس کا رخ کیا لیکن ایسٹ بنگال جرنٹ کی اس فیلینک کی کچنی نے دشمن کے ٹینکوں اور انفنٹری کا وہی حال کیا جو ہٹاپور اور بھینی کے پل پر ہو چکا تھا۔ بھارتی کمانڈرول نے جب سائنس پر قبضہ ناممکن دیکھا اور اپنے طیاروں کے بم بھی رائیگاں جاتے دیکھے تو انہوں نے اپنی میڈیم آرٹلری کا فائر سائنس پر مرکوز کر دیا۔ پاک آرٹلری کے اوپی جان کی بازی لگا کر انتہائی خطرناک جگہ چلے گئے اور دشمن کی آرٹلری کی پوزیشن دیکھ کر اپنی توپوں کے فائر کی رہنمائی کرنے لگے۔ اپنی توپوں نے دشمن کی بیشتر توپیں خاموش کر دیں اور جو فائر کرتی رہیں، ان کا فائر بے ٹھکانہ تھا۔

دشمن کا بکتر بند ہراول سائنس کے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بیدیاں سیکھ کر بھارتی کمانڈر کے لیے یہ فیصلہ کرنا محال ہو گیا ہے کہ سائنس کو تباہ کیا جائے یا اس پر قبضہ کیا جائے۔ لیکن اب فیصلہ بھارتیوں کے ہاتھ میں نہیں ایسٹ بنگال جرنٹ کے ٹائیگرز کے ہاتھ میں تھا۔ بھارتیوں کی قسمت اب پاکستان کے بنگالیوں کے ہاتھ میں تھی۔ بنگالی فیصلہ کر چکے تھے کہ سائنس نہ تباہ ہو گا نہ دشمن کے قبضے میں جائے گا۔ اقبال کو ابھی سائنس کی اہمیت کا علم نہیں تھا۔ اس نے اپنی پوزیشن بے جگہ سے لڑکھڑکائی تھی۔

اس کا پھنی کمانڈر دوڑتا آیا۔ اس بنگالی سبجر کے دانتیں کندھے سے خون بہہ رہا تھا۔ مارتیا توپ کے ٹوٹے کے ٹکڑے نے اس کا کندھا خاصا زخمی کر دیا تھا لیکن وہ زخموں سے بے نیاز کچنی کے پاؤں

جما تے ہوئے تھا۔

”اینا پلاٹوں رات فلینک میں بی کچنی کے ساتھ ایچ ڈیو۔ سبجر نے اقبال سے کہا۔“ فوراً بی کچنی کمانڈر کو رپورٹ کرو۔ سائنس کو کوڑا کرو۔ فوراً نوو کرو۔ دشمن سائنس کو تباہ کر کے نہر کو کھانا چاہتا ہے۔ مگر میڈیا آر آر، راکٹ لانچر اور مارٹر کا زیادہ استعمال کرو۔ ایمونیشن لے لو۔“

”دشمن نہر کو روکنا چاہتا ہے ہا۔ اقبال نے سیرت زدہ ہو کر پوچھا۔“

”ہاں ہاں اقبال ہا۔ کچنی کمانڈر نے ہمازت تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔“ سائنس ٹوٹ گیا تو آگے نہر خالی ہو جائے گی اور اس طرف اپنی جمع ہو کر سیلاب آجائے گا۔“

”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔“ اقبال نے تیبانی سے لہجے میں لگا کر کہا۔ ”بی آر بی ہتی رہے گی۔“

”اس نے چلا کر نعرہ لگایا۔ بی آر بی ہتی رہے گی۔“

ایسٹ بنگال جرنٹ کی اس فیلینک کی کچنی نے دشمن کے ٹینکوں اور انفنٹری کا وہی حال کیا جو ہٹاپور اور بھینی کے پل پر ہو چکا تھا۔ بھارتی کمانڈرول نے جب سائنس پر قبضہ ناممکن دیکھا اور اپنے طیاروں کے بم بھی رائیگاں جاتے دیکھے تو انہوں نے اپنی میڈیم آرٹلری کا فائر سائنس پر مرکوز کر دیا۔ پاک آرٹلری کے اوپی جان کی بازی لگا کر انتہائی خطرناک جگہ چلے گئے اور دشمن کی آرٹلری کی پوزیشن دیکھ کر اپنی توپوں کے فائر کی رہنمائی کرنے لگے۔ اپنی توپوں نے دشمن کی بیشتر توپیں خاموش کر دیں اور جو فائر کرتی رہیں، ان کا فائر بے ٹھکانہ تھا۔



لینڈینٹ اقبال کی ہنس شمع گھر والوں کے لیے اچھوت بن گئی تھی کیپٹن طارق نے دیکھ لیا تھا کہ اس لڑکی کا جاسوسوں کے ساتھ تعلق نہیں ہو سکتا، پھر بھی اُس نے شمع کو اپنے شک میں رکھا تھا۔ وہ شمع کو جتنے دن چاہتا تھا نے میں رکھ سکتا تھا لیکن اُس کے باپ پر اُسے رحم آ گیا۔ چوہدری کرامت معزز آدمی تھا۔ اُس کی عزت کا خیال کرتے ہوئے کیپٹن طارق نے شمع کو باپ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔

”اس لڑکے کو بھی جانے دیں۔“ تھا نیدار نے کیپٹن سے رشید کے متعلق کہا۔ ”اس قسم کے ہیجر لے کیا جاسوسی کریں گے؟“

”نہیں شاہ صاحب! کیپٹن نے کہا۔“ اسے ابھی نہیں چھوڑوں گا۔ میں جانتا ہوں یہ جاسوس یا تخریب کار نہیں ہو سکتا۔ اس میں اتنا دم کہاں لیکن شاہ صاحب! اسے دو چار دن اپنے پاس رکھ کر اس کا خون خشک کر دو۔ میں اس کی کھوپڑی سے عشق بازی نکالنا چاہتا ہوں۔“ شمع کو باپ اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ شمع کی ماں اور ماجرہ چوہدری کرامت علی کے کہنے پر کچھ دیر پہلے گھر آگئی تھیں۔ چوہدری کرامت نے بھانے سے گھر تک شمع کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ شمع چپ چاپ اُس کے پیچھے پیچھے چلتی آئی۔ اُس کی ماں، چھوٹی بہن اور ماجرہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اُس رات گھر میں کوئی نہ سو سکا۔

شمع کو اگر گھر والے مار پیٹ لیتے تو وہ اتنی زیادہ زہنی یا مہانی اذیت میں مبتلا نہ ہوتی جتنی وہ ہو رہی تھی۔

”بھول جاؤ کہ تم میری بیٹی ہو۔“ چوہدری کرامت نے اُسے کہا۔ ”میری مجبوری ہے کہ میں تمہیں اس گھر سے نکال نہیں سکتا۔“

”جادفع ہو جا۔“ ماں نے کہا۔ ”یہ نخوس صورت اپنے کمرے میں لے جا۔“ ماں نے شمع کی چھوٹی بہن سے کہا۔ ”اس ناپاک کے برتن الگ کر دو۔“

”ملا جی! چھوٹی بہن نے دبی دبی سی آواز میں کہا۔ ”کچھ تو شرم کی ہوتی۔“

صرف ماجرہ رہ گئی تھی جو چپ چاپ کھڑی تھی۔ یہ سب صحن میں کھڑے تھے۔ بلیک آؤٹ کی وجہ سے کوئی تبی نہیں چل رہی تھی۔ پھیک پھیک کی چاندنی تھی جس میں چہرے اچھی طرح نظر نہیں آتے تھے لیکن شمع کو یوں لگ رہا تھا جیسے سورج چمک رہا ہو اور وہ ایک ہجوم کے درمیان کھڑی ہو۔ اُس کے دل پر ایسی گھبراہٹ اور ایسا خوف طاری ہو گیا جیسے یہ ہجوم اُسے سنگسار کرنے کا۔

اُس نے جب ماجرہ کی طرف دیکھا تو ایک تیر سا اُس کے دل میں اُتر گیا۔ اسی دن کی بات ہے کہ چوہدری کرامت نے ماجرہ سے کہا تھا کہ اُس کے متعلق شکایت ملی ہے کہ وہ افضال کے ہاں جاتی ہے۔ چوہدری کرامت نے تو پیار اور شفقت سے بات کی تھی لیکن شمع نے ماجرہ پر بڑے ہی ذلیل الزام تھوپ ڈالے تھے اور اُسے بد کا رنگ دکھا دیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے پاس ایسے الزام کا کوئی ثبوت نہیں کوئی شہادت نہیں لیکن شمع اس پر الزام عائد کر سکتی تھی کیونکہ وہ ماں تھی اور ماجرہ اُس کی نوکرانی تھی۔ ماجرہ کے پاس آنسوؤں کے سوا اپنی سہانی میں پیش کرنے کے لیے

وزیر آباد میں سے سینکڑوں شہیدوں کی لاشیں گزر گئی تھیں اور گزر رہی تھیں۔ شاہراہ پاکستان بھی وزیر آباد سے گزرتی تھی، سیالکوٹ والی سڑک بھی۔ قصور، لاہور، چونڈہ اور سیالکوٹ کے محاذوں کے شہیدوں کی لاشیں جو اُن کے گھروں کو بھیجی جاتی تھیں، وہ انہی سڑکوں سے گزرتی تھیں۔

بھارت نے انہی دونوں سڑکوں پر قبضہ کرنے اور مغربی پاکستان کو دو حصوں میں کاٹنے اور لاہور، سکسٹر پر وزیر آباد کی طرف سے یعنی عقب سے حملہ کرنے اور لاہور کے دفاع میں لڑنے والی فوج کو مفلوج کر کے پاکستان کو اپنی جھولی میں ڈال لینے کا خواب دیکھ کر ۶ ستمبر کی صبح حملہ کیا تھا۔ اس پلان کی کامیابی کا بھارت کے فوجی لیڈروں نے بہتر (۷۲) گھنٹے وقت مقرر کیا تھا۔

بھارت نے بہتر گھنٹوں میں پاکستان کا کام تمام کر دینے کے لیے اپنی زیادہ سے زیادہ جنگی قوت سرحدوں پر جھونک دی تھی لیکن ایک سو چالیس گھنٹے گزر گئے تھے، بھارت کے سیاسی اور فوجی دیوتاؤں کی ہیبت ناک جنگی قوت سرحد پر ہی لہو مان ہو رہی تھی اور اُن کے ہتھ بندہ سپنے اُن کے اپنے ہی ٹینکوں تلے کچلے گئے اور اپنے ہی توپ خانے کے اڑاے ہوئے گمر دو غبار میں گم ہو گئے تھے۔

جن سڑکوں سے انڈین آرمی کے ٹینکوں کو گزرنا تھا، اُن سڑکوں سے پاک فوج کے شہیدوں کی لاشیں گزر رہی تھیں۔ لوگ اُن پر پھول برسار رہے تھے اور شہیدوں کی روحوں جیسے سڑکوں پر کھڑی قوم سے بڑھ رہی تھیں۔ ”جن شاہراہوں سے ہماری لاشیں گزری ہیں ان پر دشمن کا تہ کبھی نہیں پڑے گا۔“

بھارت نے اپنے فضائی پڑے کے لیے سرحد کے قریب جو ہوائی اڈے بنائے تھے، وہ پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے بیکار کر دیئے تھے۔ پٹیاں کوٹ کا ہوائی اڈہ تو ۶ ستمبر شام کو ہی پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے اس طرح تباہ کیا تھا کہ وہاں انڈین ایئر فورس کے کچھ جہاز لڑا کا بمبار طیارے سے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بھی صحیح سلامت نہیں رہا تھا۔ وہاں کے ایئر ٹریفک کنٹرول کی عمارت کو بھی تباہ کر دیا گیا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال آدم پور اور ملوڑہ کے ہوائی اڈوں کا کر دیا گیا تھا۔

انڈین ایئر فورس نے پاک فضائیہ کے سرگودھا کے ہوائی اڈے پر اپنی طاقت آزمائی کی تھی لیکن پہلے ہی حملے میں اُس کے تین لڑا کا بمبار طیارے پاک شاہبازوں کے ہاتھوں فضائیہ ہی پھٹ گئے اور ان کے کھڑے سرگودھا کی زمین پر کچل گئے تھے۔

جس کا تہ و دوں کو پہنچ رہی تھی۔



کچھ بھی نہ تھا۔

”کیا مجھے اس غریب کی آہ لگی ہے؟“ شمع نے جب باجرہ کی طرف دیکھا تو اس کے اندر سے ایک آواز اٹھی۔

اسے کچھتاوا محسوس ہونے لگا۔ اس کی ماں رشید کو کالیاں دے رہی تھی۔ اسے ہکا بکا غنڈہ اور بد معاش ثابت کر رہی تھی۔ شمع سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ پلنگ پر اس طرح بیٹھی جیسے گر پڑی ہو۔ اس پر ایک ہی چوٹ تو نہیں پڑی تھی جسے وہ سہہ لیتی۔ یہ چوٹ کچھ کم نہیں تھی کہ جسے اس نے دل دیا تھا اور جس کی خاطر اس نے قیاس کھالی تھیں اور جس نے اس کے ساتھ یہ عزم کر رکھا تھا کہ اسے عدالت میں لے جا کر شادی کرے گا۔ اس نے اسے اس قدر اذیت ناک طریقے سے دھوکہ دیا تھا جیسے اس سے کسی دشمنی کا انتقام لیا ہو۔ ایک تو رشید اسے ریلوے لائن پر اکیلا چھوڑ آیا پھر اس نے تھانے میں یہ جھوٹ بولا کہ وہ اس کے ساتھ تھی ہی نہیں۔

شمع کی صرف محبت کا خون نہیں ہوا تھا بلکہ رشید نے اسے ذلت میں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ تھانے میں ملزم کی حیثیت سے لے جایا جانا ایک باعزت خاندان کی لڑکی کے لیے معمولی حادثہ نہیں تھا۔ لڑکی کو باپ سے پیار ہوتا ہے۔ شمع کو باپ سے دھتکار دیا تھا۔ یہ چوٹ بھی کیا کم تھی کہ اپنی جس نوکرائی کو اس نے بدکار کہا تھا۔ اس نوکرائی نے اسے تھانے میں دیکھا تھا اور نوکرائی کو پتہ چل گیا تھا کہ شمع کسی آدمی کے ساتھ پکڑی گئی ہے۔ یہ تو کوئی سننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ رشید کے ساتھ اس کی محبت پاک تھی۔

کمرہ تاریک تھا۔ شمع لیٹ گئی لیکن یوں اٹھ بیٹھی جیسے پلنگ پر کانٹے بکھرے ہوئے ہوں۔ یہ کانٹے اس کے وجود میں اتر گئے اور اس کی روح تک جا پہنچے۔ اس کی روح سے خون لسنے لگا۔ وہ کوئی تجربہ کار اور گھنا گھٹ عورت نہیں تھی۔ اس کی ذہنیت مجربانہ بھی نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ کیا جذبات سے مغلوب ہو کر کیا تھا۔ محبت کوئی عزم بھی تو نہیں تھا لیکن جذبات کا خمار اُترا تو شمع اس حقیقت کا سامنا نہ کر سکی جو اس کے سامنے آگئی تھی۔ عمر ابھی نادانی کی تھی۔ جذبات عقل پر غالب آگئے تھے۔ شمع چالاک لڑکی نہیں تھی۔ اندھیرے کمرے میں اس کی حالت ڈری ہوئی بچی کی سی ہو گئی۔ رات خاموش تھی۔ ادھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ بات کی خاموشی میں ریل گاڑی کی آواز سنائی دی جو آگے ہی آگے بڑھتی اور بلند ہوتی جا رہی تھی۔ شمع کو یوں ڈر آنے لگا جیسے ریل گاڑی اس کی طرف آرہی ہو اور اسے چلتی کاسٹی گزر جائے گی۔ تھوڑی دیر بعد ریل گاڑی پلکھونپل سے گزرنے لگی۔ شمع کا گھر اس پل سے دور نہیں تھا۔ ریل گاڑی کا شور اتنا زیادہ تھا کہ شمع کا دل دہلنے لگا۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ اسے وزیر آباد کرنا نہیں تھا۔ شمع کے کمرے کے ایک دروازے کے کواڑ اس طرح ملنے لگے جس طرح زلزلے سے ہلا کر تے ہیں۔

اس سے پہلے شمع نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ ریل گاڑی کی رفتار تیز تو ریلوے لائن کے قریب جو گھر ہیں ان کے کواڑ لڑنے لگتے ہیں۔ اس رات کواڑوں نے ملکی ملکی آواز پیدا کی تو شمع

ڈر نے لگی۔ گاڑی قریب سے گزری تو اتنا شور ہوا کہ شمع ادبھی آواز سے بولتی تو اسے اپنی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔ پھر اسے ایسے لگا جیسے یہ گاڑی اس کے وجود کے اوپر سے گزر رہی ہو۔ اس کا گوشت کھٹ رہا ہو۔ بڈیاں ٹوٹ ٹوٹ کر پس رہی ہوں۔

گاڑی آگے نکل گئی تو دو تین جیٹ بمبار طیارے میبب زماٹے سے اوپر سے گزر گئے۔ پاک فضائیہ کے یہ طیارے دشمن کے کسی ہوائی اڈے یا کسی فوجی ٹھکانے پر بمباری کر کے واپس آئے تھے۔ ان کی بلند کی کم تھی۔ دو انجنوں کے ان طیاروں کی آواز شمع کے وجود سے پار ہو رہی تھی۔ شمع کی جین نکل چلی تھی۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ روک لی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ ریل گاڑی کی آواز ڈراؤنی نہیں تھی نہ طیاروں کی آواز سے وہ کبھی ڈری تھی۔ یہ ایک نفسیاتی رد عمل تھا۔ اس کے ساتھ جو بیٹی تھی یہ اس کا رد عمل تھا۔ یہ اس کے ضمیر کا بھی رد عمل تھا جس پر ایک جرم کا خفت اور پچھتاوے کا بوجھ سوار تھا۔

شمع نے اپنی ماں کے پاس جانا چاہا، پھر باپ کا خیال آیا مگر دونوں اس کے لیے بیگانے ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسے دھتکار دیا تھا۔ اسے اپنی چھوٹی بہن کا خیال آیا کہ اسے اپنے پاس بلا لے مگر چھوٹی بہن بھی اس کی بہدر نہیں رہی تھی۔ اسے بہن کی بڑی تلخ آواز سنائی دی۔

”با جی! کچھ تو شرم کی ہوتی۔“

اور اس ایک خدشے نے تو اس کی جان نکال دی کہ سارے شہر کو پتہ چل جائے گا کہ اس شمع ایک آدمی کے ساتھ پکڑی گئی تھی اور ماں باپ اسے تھانے سے گھر لائے تھے۔

”تم جاسوس ہو۔“ اسے کمیٹین طارق کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ”تم جاسوس ہو۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ تاریک کمرے میں اسے اپنی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”مجھ پر کوئی اور الزام عائد کر دو، میں جاسوس نہیں۔“

اسے وجود کے اندر سے کانٹے جھبھنے لگے۔ وہ نجات کے، فرار کے راستے ڈھونڈنے لگی۔

”خودکشی!۔“ یہ راستہ بڑا صاف تھا۔ اس نے غور کیا۔ اپنے پیچھے بڑا گندہ دھبہ چھوڑ جاؤ گی شمع!۔ اس کے اندر سے آواز اٹھی۔ ”خودکشی ثبوت ہو گا کہ تمہارا چال چلن ٹھیک نہیں تھا اور تم رشید کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں پکڑی گئی تھیں۔ لوگ جب اپنے عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے جایا کریں گے تو تمہاری قبر دیکھ کر کہا کریں گے کہ یہ ہے اس بدکار لڑکی کی قبر جس کا باپ شریعت اور عزت دار آدمی ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں اپنے باپ کو بدنام نہیں کروں گی۔“

وہ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اس میں عقل بھی تھی۔ اسے خدا یاد آیا اور یہ بھی کہ پچھلے دل سے توبہ کر لو تو خدا نجات کا راستہ دکھا دیتا ہے، لیکن یہاں سوال خدا کا نہیں خدا کے بندوں کا تھا۔ خدا تو بخش دیا کرتا ہے خدا کے بندے نہیں بخشا کرتے۔

”بندوں پر کس طرح ثابت کروں کہ میں گناہگار نہیں؟“ یہ سوال اس کے ذہن میں اٹک گیا۔ اس نے ایک ناول پڑھا تھا جو یونان کی دیو مالائی داستان تھی۔ اسے اس ناول کا ایک کردار



یاد آیا جس کا نام اوڈیس تھا۔ اوڈیس نے اپنے باپ کو قتل کر کے اپنی ماں کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ اُسے جب اس رشتے کے تقدس کا احساس ہوا تو گناہ کے احساس نے اُس کے ضمیر کو دبوچ لیا۔ اوڈیس نے خنجر سے اپنی آنکھیں نکال پھینکیں اور گناہ کا کفارہ ادا کیا۔

”کفارہ ادا کروں؟“ — شمع کو خیال آیا — ”لیکن کیسے؟“ .... باپ کے قدموں میں سر رکھ دوں؟ .... نہیں .... اس سے تو صرف باپ خوش ہوگا۔

باقی رات اسی سوچ میں گزر گئی کہ وہ کس طرح ثابت کرے کہ وہ گناہگار نہیں۔



جنگ کی ایک اور صبح طلوع ہوئی۔

محاذوں پر کوئی بھی نہیں سو سکا تھا۔ سونا تو نور کی بات ہے، کسی کو خیال ہی نہیں آیا تھا کہ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ رات کو سو جا کر تے ہیں۔ محاذوں پر لڑنے والے تو ۱۶ ستمبر کی صبح سے جاگ رہے تھے، اور وہ اس لیے جاگ رہے تھے کہ قوم آرام کی نیند سو سکے۔ وہ اپنی نیند ہی نہیں، اپنا حوال اور اپنی جانیں جن قربان کر رہے تھے۔

دشمن کا ہر حملہ بڑی طرح ناکام ہو چکا تھا۔ اب وہ ان ڈوٹیرنوں کو آگے لے آیا تھا جو اُس نے یلغار میں جان ڈالنے کے لیے تیجھے رکھے ہوئے تھے۔ ہمارے دشمن نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ انہوں نے ایک صدی جنگ آزادی لڑ کر اور لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر یہ خطہ حاصل کیا ہے جسے وہ پاکستان کہتے ہیں، اس کی آن پر وہ اس طرح مڑیں گے کہ اقوام عالم دنگ رہ جائیں گی۔

گذشتہ رات پاک بحریہ نے دور مار توپوں کی گولا باری سے دشمن کا ایک بہت بڑا اور بڑا ہی اہم اڈہ، دوار کا تباہ کر دیا تھا۔ یہ انڈین نیوی کا بارود خانہ تھا اور وہاں اور بھی بہت کچھ تھا۔ دوار کا کی تباہی سے انڈین نیوی کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ دوار کا سونمات کے قریب واقع تھا۔ وہ سونمات جس کے بُت غزنی کے بُت شکن نے توڑے تھے۔ یہ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر ستر ہواں حملہ تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں مسلمانوں نے اٹھا رھواں حملہ کیا اور انڈین نیوی کا بُت توڑ ڈالا۔ پاک بحریہ کا تھر دیکھ کر بھارت کے جنگی دیوتاؤں نے انڈین نیوی کے جنگی جہازوں کو بندر گاہوں سے باہر نہ آنے دیا۔

ملتِ پاکستان اگر سو گئی تو بھی بیدار تھی۔ شمع کا نور آں روآں بیدار تھا لیکن اُس کی بیداری قوم اور اپنی فوج کی بیداری سے بہت مختلف تھی۔ ادیت ناک تھی۔ شمع اس صبح کے اُجالے سے ڈر رہی تھی وہ کمرے سے نکلی تو وہ یوں جھینپ اور سکھ گئی جیسے بھرے بازار میں اُس کے کپڑے اتار دیئے گئے ہوں۔

”پانی کا ایک گلاس دینا مجھے“ — شمع کو ایک کمرے سے باپ کی آواز سنائی دی۔

باپ کو خوش کرنے کے لیے وہ پانی کا گلاس اٹھا لے کر باپ کو دینے چلی گئی۔ باپ نے اُسے دیکھا تو باپ کے ہونٹ کانپنے لگے۔

”کسی اور کو دے“ — باپ نے کہا — ”جا، کچھ میرے سامنے نہ آنا“

اگر شمع گلاس کو مضبوطی سے پکڑ نہ لیتی تو اُس کے ہاتھ سے گھر کمر ٹوٹ جاتا۔ یہی باپ کل شام

تک اُس کے ساتھ اسی طرح پیار کرتا تھا جیسے وہ ابھی ڈیڑھ دو سال کی بچی ہو۔ وہ باپ اب اُس سے اتنی نفرت کرنے لگا تھا کہ اُس کے ہاتھ سے پانی پینا بھی اُسے گوارا نہ تھا۔ وہ کمرے سے نکل آئی اور گلاس ہجرہ کو دے کر کہا کہ ابا جان کو دے آؤ۔

”جا باورچی خانے میں! — ماں کی سخت کڑوی آواز آئی — “ناشتہ کر لے۔“

اگر ماں اُسے کہتی کہ جا باورچی خانے میں زہر کی پڑیا رکھی ہے، جا کے کھا لے تو وہ دوڑ کر جاتی اور زہر کھا لیتی لیکن ناشتے میں اُس کے لیے ذرا بھی رغبت اور کشش نہیں تھی۔ وہ صرف اس لیے باورچی خانے میں چلی گئی کہ اُس سے روٹنے کا حق چھین لیا گیا تھا۔ وہ باورچی خانے میں نہ جاتی تو ماں اپنی حکم عدولی کبھی برداشت نہ کرتی۔ ہجرہ اُس کے پیچھے باورچی خانے میں گئی۔

”شمع بی بی! — ہجرہ نے کہا — “آپ جائیں، میں چائے گرم کر کے کمرے میں لے آؤں گی۔“

شمع نے ہجرہ کے منہ کی طرف دیکھا۔ اُسے یوں لگا جیسے ہجرہ کو وہ پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ اُس نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ یہ کشمیر کی اتنی خوبصورت ہے۔

”ہٹو نا بی بی! — ہجرہ نے اُسے پیار سے ایک طرف کرتے ہوئے کہا — “میں تو آپ سے ناراض نہیں ہوں .... میں ناراض ہو بھی کیسے سکتی ہوں — وہ دودھ کی دیکھی چولیسے پر رکھ کر کہنے لگی — “ول نہ کر بی بی جی! خدا ناراض نہیں ہونا چاہیے۔“ ہجرہ چپ ہو گئی اور شمع کو دیکھنے لگی —

”آپ روتی ہیں شمع بی بی! .... نہ روتیں نا!“

ہجرہ کی تسلیاں، اُس کی ہمدردی اور اُس کا پیار اُس کی دستگیری نہیں کر سکتا تھا۔ اس گھر کے درو دیوار بھی اُس کے دشمن ہو گئے تھے۔



ہر گھر میں، محل میں، مسجد میں، گرجے میں، بازاروں میں، بسوں اور ریل گاڑیوں میں لوگ صرف جنگ کی باتیں کرتے تھے۔ ان باتوں میں ڈر اور خوف نہیں جوش اور دلولہ ہوتا تھا۔ کوئی نہیں کہتا تھا کہ جنگ بہت بڑی چیز ہے، امن ہونا چاہیے یا یہ کہ ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ صلح صفائی کی اور پُر امن طریقوں سے تنازعے ختم کرنے کی بات ہونی چاہیے۔ وہ بوڑھے سابق فوجی بھی جنہوں نے دوسری جنگ عظیم میں سمندر پار جا کر جنگ کی ہولناکی اور تباہ کاری دیکھی تھی، اس جنگ کے خلاف بات نہیں کرتے تھے جو پاکستان اور ہندوستان لڑ رہے تھے اور جو جنگ ستمبر کے نام سے تاریخِ پاکستان کا ایک قابلِ فخر اور ایمان افروز باب بن گئی تھی۔

”اب فیصلہ ہو ہی جائے۔“

”لالہ بڑی تیاریاں کر کے آیا ہے، اپنا زور آزما لے۔“

”اٹھارہ سال جی، اٹھارہ سال .... ہم نے اٹھارہ سال بہمن کی دھمکیاں سنی ہیں۔“

”اٹھارہ سال نہیں جی! سینکڑوں سالوں کی بات ہے۔ پنڈت اُس روز سے مسلمانوں کو ہندوستان

سے نکالنے یا انہیں ہندو بنانے کے جن کر رہے ہیں جب محمد بن قاسم نے ہندوستان کا پہلا قلعہ توڑا تھا۔“



بنالیا تھا۔ ایک تو وہ فوجیوں کے لیے سویٹس بن رہی تھیں دوسرے یہ کہ گھر گھر جا کر کہتی تھیں کہ پاکستان اور پاک افواج کی سلامتی کے لیے گھروں میں ختم قرآن کو آئیں۔  
اُس روز جب شمع گھر والوں کے لیے اچھوت بن گئی تھی اور وہ فرار کے راستے ڈھونڈ رہی تھی، اُس کی دوہیلیاں اُسے ملنے آئیں۔ شمع انہیں دیکھ کر بہت گھبرائی کہ انہیں بھی پتہ چل چکا ہو گا کہ وہ رشید کے ساتھ پکڑی گئی تھی اور اُسے بھانسنے لے گئے تھے لیکن لڑکیوں کے کھلے ہوئے چہرے دیکھ کر اور اُن کی زبان سے حسب معمول مذاق کی ایک دو باتیں سن کر اُسے اطمینان ہو گیا کہ انہیں رات کی بات معلوم نہیں شمع کی ہیلیاں جب اکٹھی ہوئی تھیں تو وہ صرف جنگ کی باتیں نہیں کرتی تھیں بلکہ کچھ کرنے کی باتیں کرتی تھیں۔

”میں تو پکڑے اور دفاعی فنڈ کے لیے پیسے اکٹھے کر کر کے تنگ آ گئی ہوں۔“ ایک سہیلی نے کہا۔ ”خدا کی قسم! میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ اپنا آپ اپنے ملک پر کس طرح قربان کر دوں۔“  
”مجھے تو اپنی یہ جوانی بیکار نظر آتی ہے۔“ دوسری سہیلی نے کہا۔ ”اگر یہ جوانی ایک لڑکے کے لیے ہی وقف ہے تو میں اس جوانی پر لعنت بھیجتی ہوں۔“  
”میں نے ابو سے کہا تھا کہ مجھے لاہور یا کھاریاں بھیج دیں۔“ سہیلی نے کہا اور آہ لے کر بولی۔  
”وہ نہیں مانتے۔“  
”لاہور یا کھاریاں جا کر کیا کروں گی؟“ شمع نے پوچھا۔

”محاذوں کے زخمی انہی دوشیزوں کے فوجی ہسپتالوں میں آتے ہیں۔“ سہیلی نے کہا۔ ”میرے بھائی جان لاہور گئے اور وہ لاہور چھاؤنی کے سی۔ ایم۔ ایچ میں بھی گئے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ شہر کی لڑکیاں سی۔ ایم ایچ میں چلی جاتی ہیں اور محاذ کے زخمیوں کی دیکھ بھال بھی کرتی ہیں اور اُن کی خدمت لینے گئے بھائیوں کی طرح کرتی ہیں۔ بھائی جان بتاتے ہیں کہ شدید زخمی فوجی جو پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہوتے، وہ جب ان لڑکیوں کو اپنی خدمت کو تادیکھتے ہیں تو اُن میں نیا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ڈاکٹروں سے کہتے ہیں کہ انہیں فوراً محاذ پر بھیج دیا جائے۔“

اس لڑکی نے اپنے بھائی سے سنی ہوئی ساری باتیں اپنی سہیلیوں کو سنا دیں اور کہنے لگی کہ فوجی ہسپتال ایک ایسی جگہ ہے جہاں جا کر ہم اپنی روح کو مطمئن کر سکتی ہیں۔ بہت دیرینوں سہیلیاں فوجی ہسپتالوں، زخمیوں اور ان کی دیکھ بھال کرنے والی لڑکیوں کے متعلق باتیں کرتی رہیں شمع کے ہونٹوں پر اپنے دل کا دکھ آ گیا، لیکن بات ایسی تھی کہ وہ اُسے زبان پر نہ لاتی۔ اُس کے اندر غبار بھر گیا تھا جسے وہ نکالنا چاہتی تھی لیکن اس میں جرم کا جو عنصر تھا وہ اُسے بولنے نہیں دیتا تھا۔ اُس نے بناوٹی ہنسی اور مسکراہٹوں سے رات کی واردات پر پردہ ڈال رکھا۔ اُس نے ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ بہت پریشان ہے۔

★

رشید ابھی تھانے میں تھا۔ کپٹن طارق نے رات کو ہی اُسے حوالات میں بند کر دیا تھا۔ حوالات میں تین آدمی بند تھے۔ ان میں ایک نیم پاگل سا آدمی تھا اور دوسرے دو چوری اور جیب تراشی کے عادی مجرم تھے۔ اب دونوں ایک اور واردات میں پکڑے گئے تھے۔ حوالات میں سگریٹ پینے کی بھی اجازت نہیں

”جانتے ہو مقابلے کی پوزیشن کیا ہے؟“  
”جانتے ہیں جی! ہمارا ایک جوان دشمن کے چپے جوان!“  
”اور سرحدوں پر جا کر دیکھو۔ ہمارے شیروں نے مقابلے کی پوزیشن برابر کر لی ہے۔“  
”ہم تو اپنا آپ لٹا دیں گے۔“  
”قربان کر دیں گے سب کچھ!“

جوش اور جذبہ ایسا جیسے دق سے مرتے ہوئے مریض بھی صحت یاب ہو گئے ہوں۔ دیہات میں لوگوں نے خاندانی دشمنیاں ختم کر دی تھیں۔ یہی لوگ جو شجاعت اور شہادت کی باتیں کرتے تھے محاذوں پر اپنے جیالے جاننازوں کی شجاعت کے واقعات سن کر حیران رہ جاتے تھے۔ یہی شجاعت ناقابل یقین لگتی تھی کہ دشمن کے ٹینکوں کا مقابلہ انفنٹری کے جوانوں نے کیا اور ٹینکوں کا حملہ سہا کر دیا۔ تھی یہ بھی حقیقت ہی لیکن لوگ ماننے سے جھجکتے تھے کہ چونڈہ میں دشمن کی بکتر بند اور دیگر نفری سچاس ہزار تھی اور ہماری فوج کی نفری صرف نو ہزار تھی جس نے دشمن کو ایک انچ آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔  
پاکستان کے لوگ جب اپنے جوانوں کی شجاعت اور فرض کی دیوانگی کے یہ مافوق الفطرت واقعات سنتے تھے تو اُس تو ہم پرستی کو سامنے لے آتے تھے جو ہمارے ہاں پر پرستی۔ مزار پرستی اور پس ماندگی نے پیدا کر رکھی ہے۔ انہوں نے اس قسم کے مفروضے گھڑ لیے کہ لاہور کی کھڑکیوں سے آسمان سے سبز پوش مخلوق اتری تھی۔ اور یہ کہ ایک مسافر سیالکوٹ کے دیہاتی علاقے میں کہیں جا رہا تھا۔ اُسے حضرت علیؑ راستے میں ملے اور کہنے لگے کہ وہ چونڈہ جا رہے ہیں۔ وہاں کھارا تھے ٹینک لے آئے ہیں جن کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستانیوں کے پاس ٹینک بہت تھوڑے ہیں۔ جب۔ ایسے ہوا کہ دشمن کے جٹ ٹینک آگے آتے تھے وہ اپنے آپ بھٹ کر چل جاتے تھے۔  
لوگوں نے ایک سبز پوش راوی کے دونوں ہونٹوں کے درمیان بھی کھڑا کر دیا تھا۔ دشمن کے طیارے ان ہونٹوں کو تباہ کرنے کے لیے بم گراتے تھے تو۔۔۔ سبز پوش پھونک مارتا اور بم دریا میں جا گرتے تھے۔

لوگوں کی سمجھ میں جو کچھ آتا تھا وہ ویسی ہی باتیں کرتے تھے۔ وہ نہیں مانتے تھے کہ دشمن کے ٹینکوں کو تباہ کرنے والے سبز پوش نہیں خاکی پوش ہیں اور جس خاک کی وہ پیداوار ہیں اُس خاک کی حرمت پر وہ جانیں قربان کر رہے ہیں۔ ان خاکی پوشوں کے پاس کوئی پراسرار طاقت نہیں تھی یہ ایمان کی قوت تھی اور خدا اپنے اس فرمان کو پورا کر رہا تھا۔ ”تم میں اگر میں ایمان والے ہوں گے تو دوسروں کو کفار پر غالب آئیں گے۔“ وہ سب کے سب ایمان والے تھے۔

★

عورتیں اپنی گلی میں یا کسی کے گھر اکٹھی ہو جاتیں اور جنگ کی باتیں کرتی تھیں۔ وہ باتوں میں بڑی محنت سے سننی پیدا کرتی تھیں۔ بھارتی جاسوسوں کی کہانیاں تو مرد بھی سنتے سنا تے تھے جو محض سنی سنائی تھیں لیکن عورتیں ان میں اپنا رنگ بھرتی اور ایک دوسری کو سنائی دیتیں۔

نوجوان اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مجلسیں الگ تھیں۔ ایسی تین چار لڑکیاں شمع کے گھر آ جاتی تھیں۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ وہ خدا سے گلہ کرتی تھیں کہ انہیں مرد بنا کر پیدا نہ کیا۔ ان لڑکیوں نے اپنا ایک محاذ



ہوتی لیکن یہ دونوں حالات میں سگریٹوں میں چرس بھر کر پیتے رہتے تھے۔ تھانے والوں نے انہیں یہ خصوصی سہولت دے رکھی تھی۔ ان دونوں نے اور میرے نیم پگل حوالاتی نے ساری رات علی حیدر کے فرے لگا لگا کر رشید کو سونے نہ دیا ایک تو ان کی شکلیں ڈراؤنی تھیں، دوسرے وہ رشید کو اوٹ پٹانگ باتیں سنا کر ڈراتے بھی رہے۔

”کیپٹن طارق صاحب!“ صبح کے وقت تھانیدار نے کیپٹن سے ہنس کر کہا۔ ”آپ کا جاکو تو رور کو برا حال کر رہا ہے۔ جا کر دیکھیں، وہ کس طرح سلاخوں کے ساتھ چپکا ہوا پگول کی طرح رور رہا ہے اور سنتری کی فٹیں کرتا ہے کہ اسے حالات سے نکال دے.... جانے دو کیپٹن طارق صاحب!“

”آج کا دن اسے یہیں رہنے دو۔ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”شام کو چھوڑ دیں گے۔ میں اس کی ایسی حالت کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ اپنے یاروں دوستوں سے بھی جا کر کہے کہ کسی سے محبت نہ کرنا۔“

رشید ان نوجوانوں میں سے تھا جو سینا گھروں کی چھانوں میں پل کر جوان ہوتے ہیں اور جن کے کردار اور قومی وقار کو پاکستان اور بھارت کے فلسفہ فکری گیتوں کی لوریاں دے دے کر سلاتے رکھتے ہیں پھر کردار اور قومی وقار میں ہی دم توڑ جاتے ہیں۔ ان نوجوانوں کی نظریں ان سرحدوں پر لگی رہتی ہیں جو ان کے اور ملکوں پر گھومنے پھرنے والی لڑکیوں کے درمیان حامل ہوتی ہیں۔ قوم کے یہ نونہال تصوروں میں یہ سرحدیں پھاند جاتے ہیں اور اپنی مردانگی کا رس پھوڑتے رہتے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے کاجوں کے سامنے منڈلا کر پھرتے ہیں۔ کاغذوں کے یہ گھوڑے ذہنی عیاشی کے بحر غمات میں کود جاتے ہیں۔ ان کی نظروں میں اپنے پرانے کی اور اپنی اور پرانی بہنوں کی بھی تمیز نہیں رہتی۔ پاکستان میں رہتے ہوئے لاغر اور مرل سے یہ لڑکے امریکن بن جاتے ہیں۔ ان کے جسموں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ذرا سی ٹھنڈ ہو تو انہیں نزلہ اور زکام ہو جاتا ہے اور دھوپ ذرا سی تیز ہو جائے تو انہیں بخار چڑھ جاتا ہے۔

رشید اس نوجوان طبقے کا بڑا اچھا نمونہ تھا۔ چھ ستمبر کے پہلے دھماکے کے ساتھ ہی قوم کے یہ نونہال بھٹکتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر شاہراہ پاکستان پر آ گئے۔ پہلا دھماکہ ان کے لیے خضر راہ ثابت ہوا۔ ان کے خون میں صدیوں پرانی جو روایات رچی بسی چلی آ رہی تھیں، اس چشمے کی طرح ابل آئیں جس پر کسی نے آوارہ خیالی اور ذہنی لذت پرستی کے پتھر رکھ کر اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ وہی چھوڑے اور فٹن کے مارے ہوئے لڑکے جو غلوں کے ہیر و بے پھرتے تھے، ہر اس جگہ پہنچ گئے جہاں وہ سمجھتے تھے کہ ان کی ضرورت ہے۔

قوم کے ان نونہالوں نے ثابت کر دیا کہ ”ذرا کم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے سانی!“ قوم نے تو انہیں دل سے اتار دیا تھا۔ یہ لڑکے کسی کام کے نہیں رہ گئے تھے اور یہ پاکستان کے پاسان کھلانے کے قابل نہیں تھے، لیکن جنگ ستمبر کے ابتدائی دنوں میں یالکوٹ کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے ایسا مظاہرہ کیا کہ لوگوں نے ان کے متعلق اپنی راتے بدل لی۔ یالکوٹ کے ٹرنک بازار میں رات کے وقت بھارت کے بمباریادوں نے بم گراتے۔ یہ طیارے رات کی بمباری کے لیے آئے تھے اور ان کا تارگیٹ یقیناً یالکوٹ کا ٹرنک بازار نہیں تھا۔ ان کا تارگیٹ پاک فوج کے اگلے مورچے ہو سکتا تھا، لیکن طیارہ نگینوں سے بچنے کا طریقہ یہی تھا کہ وہ شہری آبادی پر بم گرا دیتے اور واپس جا کر رپورٹ دیتے کہ وہ پاک فوج کے اگلے مورچے تباہ کر آتے ہیں۔

ٹرنک بازار سے ملحق گنجان آبادی تھی بمباری سے کئی مکان گر پڑے اور ان میں رہنے والے بے تلے دب گئے۔ لوگ ڈر کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔ کسی کو ہوش نہ تھا کہ وہ لوگوں کو روک کر کہتا کہ بے تلے سے زخمیوں اور لاشوں کو نکالنا ہے۔ اس کام کے لیے جو پہنچے وہ یہی بے تلے، امریکن ازم، ٹیڈی ازم اور فلمی گیتوں کے مارے ہوئے تھے۔ ان میں انہی جیسی نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ انہوں نے تباہ شدہ مکالوں کا ملبہ بڑی تیزی سے ہٹانا شروع کر دیا۔ بے تلے سے لاشیں نکلیں اور زخمی بھی۔ زخمیوں کو بروقت نکال لینے سے ان کی جانیں بچ گئیں۔ ان نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کے کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے۔ جن بالوں کو وہ ہر وقت سنوار کر رکھتے تھے، ان پر مٹی جم گئی تھی۔ یہ ان کی کوششیں تھیں کہ کئی زخمیوں کو فوراً اسپتال پہنچا دیا گیا اور انہیں بچا لیا گیا۔ لاہور کے مریضوں میں تو ان نوجوانوں نے وہاں کے ڈویژن کمانڈر کے لیے مشکل پیدا کر دی تھی۔ وہ فوجی کمانڈروں سے کہتے تھے کہ انہیں آگے بھیجا جاتے، لیکن وہ جنگ تھی، کوئی کھیل نہیں تھا۔ انہیں آگے نہیں بھیجا جاسکتا تھا۔ ڈویژن کمانڈر نے انہیں کہا کہ ٹرنک سامان سے بھرے ہوئے آتے ہیں اور ان سے سامان اتارنے کے لیے کوئی نہیں ہوتا۔ ڈویژن کمانڈر نے لڑکوں سے کہا کہ وہ ٹرنکوں سے سامان اتار دیا کریں۔

پھر بھی رشید جیسے کچھ نوجوان تھے جو اپنے پراگندہ ذہنوں کے غلام ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی قوم سے تعلق توڑ رکھا تھا۔ ان پر شک کیا جاسکتا تھا کہ جاسوس ہیں لیکن ان میں اتنی ہمت اور جرات نہیں تھی۔ البتہ انہیں غدار کہنا غلط نہ تھا۔ غدار انہی لوگوں میں سے ہوتے ہیں جو اپنی خواہشات اور ذہنی آوارگی کے غلام ہوتے ہیں۔

کیپٹن طارق حالات کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ رشید نے ہاتھ جوڑ کر اور رور کو اسے کہا کہ اُسے چھوڑ دیا جاتے۔

”آپ میرے جسم سے جتنا خون نکالنا چاہیں نکال لیں۔“ رشید نے کہا۔ ”اور فوجیوں کو دیں۔“

”تمہارے خون میں ملاوٹ ہے۔“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”تم جیسے نوجوان سرحدوں پر پہنچے ہو تو میں اور تم یہاں فلی محبت کے ڈرامے کر رہے ہو۔“

”اب نہیں کروں گا۔“ رشید نے روتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ جو حکم دیں گے پورا کروں گا۔“

”شاہ صاحب!“ کیپٹن نے دفتر میں آ کر تھانیدار سے کہا۔ ”آج رات کو کسی وقت اسے چھوڑ دیں گے.... اور آج ایک کام کرنا ہے۔ اپنے تمام مجزوں کو بلا لیں۔ ابھی ابھی فوج پر مجھے بتایا گیا ہے کہ وزیر آباد بڑا حساس مقام بن گیا ہے میرے شعبے نے وارنٹس پر کوڈ الفا میں کوئی پیغام سنے ہیں۔ یہ سرحد پار سے پاکستان میں کسی کو دیتے جا رہے ہیں۔ خیال یہی ظاہر کیا جاتا ہے کہ جنہیں یہ پیغام دیتے جا رہے ہیں وہ وزیر آباد کے اندر یا مضافات میں ہیں۔“

”میرے لیے جو حکم ہے، مجھے وہ بتائیں۔“ تھانیدار نے کہا۔

”ہماری فلی جنس وزیر آباد کو اپنی نگرانی اور گرفت میں لے رہی ہے۔“ کیپٹن نے کہا۔ ”میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ہمارے انتظامات کیا ہیں۔ میں آپ کے انتظامات استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے تمام مجزوں کو بلا لیں۔“

”ابھی آتے ہیں۔“ تھانیدار نے کہا۔



یہ ستمبر کا مہینہ تھا۔ ابھی گرمی تھی۔ لوگ صحنوں اور چھتوں پر سوتے تھے۔ شمع کی حویلی خاموشی تھی اور اس کا صحن کشادہ تھا۔ شمع نے سارا دن کمرے میں گزار دیا تھا۔ اُس کی ذہنی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اُس نے سہیلیوں کے ساتھ باتیں کی تھیں۔ وہ چلی گئیں تو شمع کمرے میں جا کر اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی تھی۔ گھر کے کسی فرد نے اُس کے ساتھ بات نہیں کی تھی۔ یہ دن اُس کی زندگی کا سب سے زیادہ لمبا دن تھا۔

سورج غروب ہو گیا تھا اور شام تیزی سے تاریک ہو رہی تھی۔ لوگ شام سے پہلے کھانا پکانا اور دیگر کام ختم کر لیتے تھے کیونکہ شام کے بعد مٹی نہیں جلاتی جاسکتی تھی۔ ہاجرہ نے صحن میں چار پائیاں رکھ کر سب کے بستر بچھا دیے تھے۔ سب اپنے اپنے بستر پر آگئے۔ کسی نے کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ اس گھر میں تو ماتم کا سماں تھا۔ ایک تو ان کا جوان اور اکلوتہ بیٹا محاذ پر تھا اور اب بیٹی نے یہ گل کھلایا تھا۔ شمع کی ماں نے ہاجرہ سے سرگوشی میں کہا کہ شمع سے کہنے کے لئے نکل آتے اور لیٹ جاتے۔

”بی بی جی!“ ہاجرہ نے شمع کے کمرے سے آکر شمع کی ماں سے کہا۔ ”شمع بی بی کمرے میں نہیں ہیں۔“

”عمل خانے میں ہوگی۔“ ماں نے کہا۔ ”جا دیکھ۔“

شمع کہیں بھی نہیں تھی۔ اوپر جا کے دیکھا۔ تمام کمروں میں دیکھا۔ ماں اور شمع کی چھوٹی بہن شمع کی سہیلیوں کے گھروں میں باری باری گئیں شمع کہیں نہ ملی۔ ماں نے سرپیٹ لیا۔ باپ کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

”امی!“ شمع کی چھوٹی بہن نے کہا۔ ”شیدے کے ساتھ نہ چلی گئی ہو۔ ابو سے کہیں وہاں سے پتہ کر لیں۔“

چوہدری کرامت سے شمع کی ماں نے کہا کہ شیدے کے گھر سے پوچھے۔

”کیا میں وہاں جا کر یہ کہوں کہ میری بیٹی تمہارے بیٹے کے ساتھ چلی گئی ہے؟“ چوہدری کرامت نے کہا۔ ”میں اپنی بے عزتی اور رسوائی کہاں تک برداشت کروں گا؟“

”تھانے چلے جائیں۔“ شمع کی ماں نے کہا۔

”تم نہیں جانتیں میں اُسے تھانے سے لایا کس طرح تھا۔“ چوہدری کرامت نے کہا۔ ”وہ کیپٹن کہتا تھا کہ یہ بد بخت لڑکی جاسوس ہے۔ اب اُسے بتاؤں گا کہ وہ لاپتہ ہو گئی ہے تو وہ لفظین سے کہے گا کہ تمہاری بیٹی ہے ہی جاسوس اور جاسوسی کے سلسلے میں غائب ہوتی ہے۔“

”تو کیا ہم چپ کر کے بیٹھ جائیں؟“ ماں نے کہا اور اُس نے رونا شروع کر دیا۔

”ماں!“ چوہدری کرامت نے کہا۔ ”چپ کر کے لیٹ جاؤ اور بھول جاؤ کہ وہ ہماری بیٹی ہے۔“ اُس نے سوچ کر کہا۔ ”صبح تک دیکھ لو۔“

رات خاموشی سے گزرتی جا رہی تھی۔ شمع کے گھر وقت جیسے رُک گیا تھا۔ ایک سیکنڈ بھی آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ کھاریاں چھاؤنی تاریکی اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف ایک جگہ تھی جہاں سرگرمی اور بھاگ دوڑ تھی۔ یہ کھاریاں کا فوجی ہسپتال تھا۔ اپریشن تھیٹر میں بے پناہ سرگرمی تھی۔ اس عمارت کی فضا خون اور دوا تیوں کی بو سے بوجھل تھی۔ محاذ کے زخمیوں کے وارڈوں میں زندگی کی گھمگھمی تھی۔ کبھی کبھی کوئی زخمی ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ لگاتا تھا۔ ”یا علی“ کا اکاؤ کا نعرہ بھی گونجتا تھا۔

وارڈ کے اندر نرسیں، زنگ اردلی اور شہری لڑکیاں زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ وارڈ زخمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اپریشن تھیٹر کا یہ عالم تھا کہ باہر بھی سڑک پر پڑے تھے جن پر زخمی لیٹے ہوئے تھے۔ ہزاروں میں ہسپتال کے شاف کے علاوہ بہت سے لوگ موجود تھے۔

ہر وارڈ کے ساتھ نرسیں کا ایک ایک کمرہ تھا۔ تمام کمروں میں روشنی تھی۔ کچھ کمپوں، دروازوں اور روشنائیوں کے شیشوں پر سیاہ رنگ کے موٹے کاغذ لگے ہوئے تھے۔ ایسے ایک کمرے میں لڑکی زنگ سروس کی ایک کیپٹن ابھی ابھی آکر بیٹھی تھی۔ اُس کی وردی پر خون کے تہ دبھے تھے۔ کچھ بڑے اور کچھ چھوٹے۔ اُس کے بال بے ترتیب تھے اور چہرے پر ٹھنکن کے گہرے آثار تھے۔ وہ ۶ ستمبر سے یہیں تھی۔ اُسے یونیفارم بدلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ سب سے تین دن اور تین راتیں اپریشن تھیٹر میں رہی تھی۔ محاذوں سے زخمی آنے شروع ہوئے تو آتے ہی چلے جا رہے تھے۔ محاذوں پر انہیں صرف سنٹ ایڈل تھی۔ صبح مرسم ہٹی چھاؤنی کے ہسپتال میں ہوتی تھی۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ہسپتال میں جڑتی تھیں۔

زنگ سروس کی کیپٹن عصمت ابھی ابھی کمرے میں آکر بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شب بیداری کا خمار تھا۔ اُسے ایک شاف نرس نے بتایا کہ ایک جوان لڑکی گھٹنے ڈیڑھ سے اُس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ”کون ہے؟“ کیپٹن عصمت نے پوچھا۔ ”کیا کہتی ہے؟ اس کا فوج میں کوئی ہوگا۔“

”نہیں۔“ شاف نرس نے جواب دیا۔ ”وزیر آباد سے آتی ہے شمع نام بتاتی ہے۔ بڑی خوبصورت لڑکی ہے کہتی ہے میں زخمیوں کی خدمت کے لیے آئی ہوں لیکن کسی انسر سے میرا ملنا بہت ضروری ہے۔ بات کرتی ہے تو اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔“

”لوگ ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو گئے ہیں۔“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”نوجوان لڑکیوں میں یہ جذبہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوتا ہے۔ امیروں کی بیٹیاں اور کالجوں کی لڑکیاں تو بالکل ہی گمراہ ہو گئی تھیں۔ اللہ نے انہیں بیدار کر دیا ہے لیکن انہیں جذباتی ہو جانا بھی ٹھیک نہیں۔“

”انہیں گائیڈ کرنے والا کوئی نہیں۔“ شاف نرس نے کہا۔ ”گمراہ کرنے والے بہت ہیں۔“

”اُسے میرے پاس بھیج دو۔“ کیپٹن عصمت نے جماتی لے کر کہا۔ ”مجھے اپریشن تھیٹر میں جانا ہے۔“

★

ایک بڑی خوبصورت لڑکی کمرے میں آتی۔ کیپٹن عصمت اس لڑکی سے کم خوبصورت نہیں تھی اور وہ اس لڑکی جیسی جوان بھی تھی۔

”او شمع!“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”اس کمرے پر بیٹھ جاؤ۔۔۔ وزیر آباد سے آتی ہو؟“

”ہاں!“ شمع نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا۔ ”میں تمہارے کسی انسر سے ملنا چاہتی ہوں۔ میرا ایک مسئلہ ہے۔“



”میں تمہیں انسر نہیں لگتی؟“ کیپٹن عصمت نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نرسوں کی انسر ہوں۔ میں کیپٹن ہوں۔۔۔ کیپٹن عصمت۔۔۔ کہو کیا بات ہے؟“  
 ”واقعی میں آپ کو انسر نہیں سمجھتی تھی۔“ شمع نے کہا۔ ”انسر بڑی عمر کے آدمی ہوتے ہیں۔ آپ تو شاید میری عمر کی ہوں گی!“  
 ”فوج میں چھوٹی عمر کے انسر بھی ہوتے ہیں۔“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”لیفٹیننٹ، کیپٹن عموماً نوجوان ہوتے ہیں۔“

”یہ تو میں جانتی ہوں۔“ شمع نے کہا۔ ”میرا بھائی بھی لیفٹیننٹ ہے۔ ابھی کینڈ لیفٹیننٹ ہے۔“  
 ”کہاں ہے؟“ کیپٹن عصمت نے پوچھا۔ ”کون سی رجمنٹ میں ہے؟“  
 ”ایسٹ بنگال رجمنٹ میں!“ شمع نے جواب دیا۔ ”لاہور کے محاذ پر کسی جگہ ہے۔ ابھی تک اُس کی کوئی خبر نہیں ملی۔“  
 ”تم شاید اُسے ہسپتالوں میں ڈھونڈتی پھر رہی ہو۔“ کیپٹن عصمت نے کہا۔  
 ”نہیں۔“ شمع بولی۔ ”اُسے تو ہم نے اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ میری بات کچھ اور ہے۔“  
 ”کیا نام ہے تمہارے بھائی کا؟“

”اقبال!“ شمع نے جواب دیا۔ ”محمد اقبال۔“  
 ”اقبال؟“ کیپٹن عصمت چونک پڑی اور شمع کی طرف جھک کر بولی۔ ”اقبال۔۔۔ وزیر آباد کا رہنے والا۔۔۔ تم اُس کی بہن ہو؟ تمہارے والد صاحب کا نام چوہدری کرامت علی ہے نا۔۔۔ ہاں، وہی اقبال۔۔۔ میں اُس کے ساتھ لاہور گورنمنٹ کالج میں پڑھتی تھی۔“ کیپٹن عصمت نے اپنی جیب سے کچھ نکالا۔ یہ باریک پلاسٹک کا چار ساڑھے چار انچ لمبا اور تین انچ کے لگ بھگ چوڑا فولڈر سا تھا۔ اس میں سے اُس نے اپنا فوجی شناختی کارڈ نکالا اور اس فولڈر میں سے ایک پاسپورٹ سائز فوٹو نکال کر شمع کو دکھایا اور پوچھا۔ ”یہ اقبال؟“

”ہاں ہاں!“ شمع نے اذیت سے کہا۔ ”یہ میرے بھائی جان کا فوٹو ہے۔ اس کی ایک کاپی میرے پاس بھی ہے۔۔۔ آپ نے یہ فوٹو کیوں اپنے پاس رکھا ہوا ہے؟“  
 ”یہ بھلا پوچھنے والی بات ہے؟“ کیپٹن عصمت نے ایسے لہجے میں کہا جو کیپٹن اور میجر کا لہجہ نہیں ہوتا۔ عصمت اب شمع کی طرح جوان لڑکی تھی، کیپٹن نہیں تھی۔ جذباتی سے لہجے میں بولی۔ ”ہم اکٹھے پڑھتے تھے۔“ کیپٹن عصمت نے نظریں اقبال کے فوٹو پر مرکوز کر کے جذباتی سی سرگوشی میں کہا۔ ”ہم اب بھی اکٹھے ہی ہیں۔“  
 ”میں سمجھ گئی ہوں۔“ شمع نے کہا اور اُس نے سر جھکالیا۔

”کیا بات ہے شمع؟“  
 ”میں نے بھی کبھی کا فوٹو اسی طرح اپنے پاس رکھا تھا۔“ شمع نے بوجھل آواز میں کہا۔ ”لیکن اس محبت نے مجھے۔۔۔ شمع کی آواز بھر گئی۔ گھونٹ سا نگل کے بولی۔ ”میں ڈھتکار می ہوتی لڑکی ہوں۔ اقبال بھائی جان تو آپ سے وفا کریں گے مگر مجھے دھوکہ ہوا ہے۔۔۔ میں تو خود کشی کے ارادے

سے گھر سے نکلی تھی۔“  
 شاف نرس کمرے میں آتی۔ اُس کے چہرے پر بھی شب بیداری اور تھکن کے گہرے سائے تھے۔ اب وہ پریشان بھی لگتی تھی۔ وہ دھڑام سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے رومال نکالا اور پھیلا کر اُنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ رو رہی تھی۔

”کیا ہوا شاف!“ کیپٹن عصمت نے اُس سے پوچھا۔ ”کوئی زخمی شہید ہو گیا ہے؟“  
 شاف نرس نے اپنی آنکھوں سے رومال ہٹاتے بغیر سر ہلایا کہ نہیں، کوئی شہید نہیں ہوا۔  
 ”پھر کیا ہوا؟“

”وہی مشکل!“ شاف نرس نے آنسو پونچھ کر کہا۔ ”زخمی جوان محاذوں پر واپس جانے کی ضد کرتے ہیں۔ اس وارڈ میں تین جوان ہیں۔ اُنہوں نے تو مجھے اور نرسوں کو پریشان کر دیا ہے۔۔۔ آپ نعرے نہیں سن رہیں؟۔۔۔ یہ اُن تینوں کے نعرے ہیں۔ دو نامک ہیں اور ایک پایا ہے۔ پایا کے دائیں بازو کی ہڈی دو جگہوں سے ٹوٹی ہوئی ہے اور گرنیٹ کے دو ٹکڑے اُس کے سینے پر لگے تھے۔ ایک سے تو زخم آیا ہے اور دوسرے ٹکڑے نے ایک سلی کو نقصان پہنچایا ہے۔۔۔ اور یہ جو دو نامک ہیں، ان کے زخم ایک جیسے ہیں۔ دونوں کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور دونوں کی دائیں ٹانگوں کی ہڈیاں گھٹنوں کے پتھے سے ٹوٹی ہوئی ہیں۔ تینوں کی ہڈیاں ٹھیک جڑی میں اور پلاسٹر چڑھا دیئے گئے ہیں۔ کل شاہ پلاسٹر چڑھاتے گئے تھے۔“

”اب کہتے ہیں کہ ہمیں محاذوں پر بھیجو؟“ کیپٹن عصمت نے پوچھا۔  
 ”یہ تو تمام زخمی کہتے ہیں کہ مرہم پٹی کرو اور ہمیں جانے دو۔“ شاف نرس نے کہا۔ ”لیکن ان تینوں نے کل شام سے ہمارا نامک میں دم کر رکھا ہے۔ میں تو اسی پر عیران ہوں کہ اتنا زیادہ خون نکل جانے سے ہر اسنے گہرے زخموں کے باوجود وہ پوری طرح ہوش میں ہیں۔۔۔ جو نرس ان کا ٹمپر ٹکرا اور بلڈ پریشر دیکھنے جاتی ہے اُسے تینوں تنگ کرتے ہیں کہ سی۔ ایم۔ ایچ کے کمانڈنٹ کو بلاؤ، ہم یہاں نہیں رہیں گے۔۔۔“  
 ”میں آج چار پانچ بار اُن کے پاس جا چکی ہوں اور انہیں سمجھایا ہے لیکن وہ نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ تم نے ہماری ہڈیاں جوڑ دی ہیں اور ٹپیاں باندھ دی ہیں۔ تم لوگوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے ہمیں اپنا فرض ادا کرنے دو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دوست آگے لڑ رہے ہیں اور کمٹ رہے ہیں۔ تم نہیں جانتیں آگے کیا حال ہو رہا ہے۔ دشمن کی طاقت اور انفری بہت زیادہ ہے۔ یہ تو ٹینکوں اور انسائون کا مقابلہ ہے سسٹر صاحبہ! آپ نہیں جانتیں۔ آپ ہم پر ظلم کر رہی ہیں۔ ہم یہاں لیٹے رہے تو معلوم نہیں آگے کیا ہو جائے۔ ہم ہسپتال میں لیٹنے کے لیے فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے۔۔۔“

”میں انہیں کہتی ہوں کہ منہاری ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سوال پاکستان کا ہے ہماری ہڈیوں کا نہیں۔ پاکستان ہی نہ رہا تو ہم اپنی ہڈیاں جوڑ کر کیا کریں گے ہمیں جانے دو۔ ہم اپنے دوستوں سے دھوکہ کر رہے ہیں۔ ہم اُن کے ساتھ مرنا چاہتے ہیں ہمیں مورچوں میں جا کر مرنے دو۔ بولتے بولتے شاف نرس کچھ سی آئی اور اُس نے پھر رومال اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

”انہیں ایک ایک انجکشن دے دو۔“ کیپٹن عصمت نے انجکشن کا نام بتا کر شاف نرس سے کہا۔ جس



قوم کے جوازوں میں یہ جذبہ ہوا سے کون تسکوت دے سکتا ہے!

"لیکن... لیکن اتنا جذبہ؟ — سٹاف نرس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ "کن ماؤں کے یہ بیٹے ہیں؟ کن بہنوں کے یہ بھائی ہیں؟ انہیں اپنی جان کی پروا نہ تھی، اتنی زیادہ کلیف میں یہ اپنی ماؤں کو اپنے باپوں اور اپنے عزیزوں کو یاد نہیں کرتے۔ یہ نہیں کہتے کہ ان کے گھروں کو اطلاع دی جائے۔"

ان دو ٹائیکوں اور ایک جوان کے جذبہ حب الوطنی کا یہ طریقہ اظہار کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ زخمیوں کو محاذوں سے پیچھے لانا ایک مسئلہ تھا۔ وہ پیچھے آنے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان کا جذبہ جنوں کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ جو فوجی ہسپتال محاذوں کے قریب تھے وہاں تو زخمی ہسپتالوں کے سٹاف کو تنگ کیے رکھتے تھے کہ انہیں آگے بھیجا جائے۔ لاہور سیکڑ کے دو زخمی رات کو ہسپتال سے بھاگ گئے اور اپنی بٹالین سے جا ملے تھے۔

یہی وہ جذبہ تھا جس نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں لاہور کو بچا لیا تھا اور نہ جنگوں کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں کہ اکیس ایسے ڈویژنوں کا حملہ جن کے پاس ہزاروں توپیں اور ٹینک ہوں اور جو بدمذہب ہتھیاروں سے لیس ہوں اور جن کے پاس پھونکنے اور ضائع کرنے کے لیے ایمونیشن کے انبار ہوں اور جنہیں فضائی سپورٹ دینے کے لیے لڑاکا بمبار طیاروں کی بھی کمی نہ ہو، صرف پانچ ڈویژنوں نے نہ صرف روک لیا ہو بلکہ سپاہیوں کے دشمن کا سارا پلان تباہ کر دیا ہو۔

یہ اس جذبے کا کرشمہ تھا جسے جذبہ ستمبر کے نام سے تاریخ پاکستان کے ایک رخشاں باب کا عنوان بننا تھا۔ اس باب کا عنوان جو قوم کے سرخفت جانبازوں نے اپنے خون سے لکھا تھا۔

★

"میں ان جانبازوں کی خدمت کرنے آئی ہوں" — شمع نے کہا۔

"واردوں میں دیکھا نہیں تم نے؟ — کیپٹن عصمت نے کہا۔ "تم جیسی بہت سی لڑکیاں رضا کارانہ طور پر آئی ہوئی ہیں۔ کئی لڑکیاں گجرات سے آئی ہیں۔ شاید وزیر آباد کی بھی ہوں۔" ذرا سوتح کر اس نے کہا۔ "جتنے دن یہاں رہو گی میرے پاس ٹھہرنا۔ تم اقبال کی بہن ہو شمع... اور اقبال..." اس نے نظریں اقبال کے فوٹو پر جمادیں۔

"میری ایک پریشانی ہے عصمت صاحبہ!"

"مجھے عصمت صاحبہ نہ کہو شمع! — کیپٹن عصمت نے کہا۔ "عصمت کو۔ اقبال مجھے عصمتی کہا کرتا تھا۔"

"ہاں عصمت! — شمع جگے سے تنہم سے بولی۔ "میری پریشانی یہ ہے کہ میں گھر والوں کو بتا کر نہیں آئی۔ میں گھر سے بھاگ آئی ہوں۔"

"بتا دیتیں تو کیا وہ تمہیں نہ آنے دیتے؟"

"یہ معاملہ کچھ اور ہے عصمت! — شمع نے کہا۔ "میرا رشتہ ایک لیفٹیننٹ کو دیا جاتا ہے۔"

مجھے یہ رشتہ پسند نہیں تھا۔ ایک اس لیے کہ مجھے فوجی ویسے ہی اچھے نہیں لگتے تھے، دوسرے اس لیے کہ میں کسی اور کو چاہتی تھی۔"

"تم نے اس لیفٹیننٹ کو دیکھا ہوگا۔"

"نہیں۔" — شمع نے جواب دیا۔ "اس کی ماں اور بڑی بہن آئی تھیں۔ میں نے ماں سے کہا تھا کہ میں اس کے ساتھ شادی کروں گی جسے میں چاہتی ہوں۔ وہ وزیر آباد کا رہنے والا ہے۔ اس کے ماں باپ نے اس کے لیے میرا رشتہ مانگا تھا لیکن میرے ابو اور امی نے انہیں صاف جواب دے دیا تھا۔ میں نے اور اس نے گھر سے بھاگ جانے اور کورٹ میں شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہم ملتے ملا تے رہے مگر جوابات مجھے اپنے ماں باپ سے تھے اور میں سمجھ نہیں رہی تھی۔ وہ خدا نے مجھے ایسے طریقے سے سمجھائی کہ میں گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔"

"اس کی شادی کہیں اور کر دی گئی ہے؟"

"نہیں عصمت! — شمع نے بڑی لمبی آہ لے کر کہا۔ "وہ بزدل نکلا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ اس میں مردانگی نام کو نہیں۔ ہوا یوں کہ... شمع نے کیپٹن عصمت کو سارا واقعہ سنایا کہ وہ کس طرح ریلوے لائن پر پکڑ لی گئی اور اسے تھانے سے کس طرح رہائی ملی۔ ایک ہی دن میں گھر میں اس کے ساتھ ماں باپ نے جو رویہ رکھا اور اس نے جو کچھ محسوس کیا وہ بھی سنایا۔ اس کے آنسو بہتے رہے اور وہ سناتی رہی۔"

"میرے سامنے دو راستے تھے۔" شمع نے کیپٹن عصمت کو سنایا۔ "خودکشی کر لوں یا کسی طرح ثابت کروں کہ میں بڑے چال چین کی لڑکی نہیں۔ صرف تم ہو عصمت، جس کے ساتھ میں یہ باتیں کر رہی ہوں۔ یہ باتیں تو میں نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ بھی نہیں کی تھیں۔ میرا ہمدرد کوئی بھی نہیں۔ اس کھینے رشید کا خیال آتا ہے تو خون کھولنے لگتا ہے۔ تھانے کا اور اپنے باپ کی عزت کا خیال آتا ہے تو گناہ کا احساس شرمسار کرتا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں شمع! — کیپٹن عصمت نے کہا۔ "میں سمجھتی ہوں تمہیں تو پاگل ہو جانا چاہیے تھا۔ اس صورت حال میں اور اس ذہنی کیفیت میں خودکشی ہی نجات کا راستہ دکھائی دیتا ہے۔"

"میں خودکشی کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی۔" شمع نے کہا۔ "باہر آئی اور ریلوے لائن کی طرف چل پڑی مگر یہ خیال آ گیا کہ میں تو اس دنیا سے اٹھ جاؤں گی، میرا باپ اور میرا سارا خاندان بے نام ہو جائے گا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کروں۔ تم تو کہتی ہو کہ مجھے پاگل ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں پاگل ہو چکی تھی۔ میں گھر سے خودکشی کے ارادے سے نکلی تھی لیکن راستے میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں چھوٹا سا پرس تھا۔ اس نے یہ پرس کیپٹن عصمت کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں کچھ پیسے پڑے تھے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے خدا مجھے زندہ رکھنا چاہتا ہے۔"

"ہاں شمع! — عصمت نے کہا۔ "بہتر کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔ تمہارا ذہن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک حصہ تمہیں موت کی طرف دھکیلتا تھا، دوسرا حصہ اس کی طرف دھکیلتا تھا۔ یہ خدائی اشارہ تھا کہ تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔"



”قرب ہی سڑک تھی“ شمع نے کہا۔ ایک مسافر بس رکی کھڑی تھی جس کا منہ کھاریاں کی طرف تھا۔ دن کو مجھے سہیلیاں سناتی رہی تھیں کہ ہم جیسی نوجوان لڑکیاں فوجی اسپتالوں میں جا کر زخمی فوجیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ یہ سوج تو مجھے پہلے بھی آتی تھی کہ میں گناہ کا کفارہ ادا کروں۔ میں نے کبھی اکیلے سفر نہیں کیا تھا لیکن میں نے اپنے لیے ایسی صورت حال پیدا کر لی تھی کہ مجھے مرنا بھی اکیلے تھا اور جینا بھی اکیلے ہی تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کھاریاں چھاؤنی کے سی۔ ایم۔ ایچ میں بھی فوجی زخمی ہو کر آتے ہیں۔ میں اس طرح بس کی طرف چل پڑی کہ میں چلتی بھی تھی اور رکتی بھی تھی۔ میں اسی کیفیت میں بس میں جا گھسی اور بس نے مجھے کھاریاں پہنچا دیا۔۔۔

”بس والوں نے مجھے سڑک پر اتار دیا اور بس چلی گئی۔ وہاں میں نے دیکھا کہ میں تاریک دیرانے میں کھڑی ہوں اور مجھے معلوم ہی نہیں کہ سی۔ ایم۔ ایچ کہاں ہے اور جی۔ ٹی روڈ سے کتنی دور ہے۔ میں تنہا کھڑی تھی۔ کوئی میری طرف آرہا تھا۔ میری توجہ ان ہی نکل گئی۔ وہ قریب آیا تو دیکھا کہ وہ فوجی تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے پوچھتا کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں کھڑی ہوں، میں نے اُسے کہا کہ یہاں بھائی زخمی ہو کر یہاں سی۔ ایم۔ ایچ میں آیا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ سی۔ ایم۔ ایچ کس طرف ہے مجھے امید تھی کہ وہ فوراً مان جائے گا۔ میں مجھے پہلی بار تپہ چلا کہ فوجی کتنے محتاط ہوتے ہیں۔ اس نے مجھ سے ایسے ایسے سوال پوچھے کہ میں چکر اٹھی۔ اُسے شک تو اس بات پر ہو رہا تھا کہ میں اس وقت اکیلی کس طرح آئی ہوں؟

”یہ بھی تمہاری خوش نصیبی ہے شمع؟“ عصمت نے کہا۔ ”وہ ملٹری پولیس کا آدمی تھا جو تمہیں ملا تھا۔ وہ اپنا شک رفع کرنے کے لیے تمہیں اپنے افسروں کے پاس بھیج سکتا تھا۔ یہ رات تو تمہاری جانچ پڑتال میں ہی گزر جاتی۔ تمہاری خوش قسمتی یہ ہے کہ آج کل زخمی فوجیوں کے متعلق ہر کوئی ضرورت سے زیادہ جذباتی ہے۔ ملٹری پولیس کا یہ جوان بھی جذبات میں آگیا ہو گا کہ تم ایک زخمی فوجی کی بہن ہو۔“

”جذبات کے علاوہ میرا جھوٹ کام کر گیا تھا“ شمع نے کہا۔ ”وہ پوچھتا تھا کہ اس وقت تم اکیلی کیوں آئی ہو۔ میں رو پڑی۔ میں نے کہا کہ میری امی اور میرے ابا جان دن کو آگئے تھے وہ مجھے ساتھ نہیں لانا چاہتے تھے۔ مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں اکیلی بس میں بیٹھی اور آگئی۔ یہاں آکر مجھے احساں ہوا کہ میں تو یہاں بھائی کی محبت کی ماری ہوئی آگئی ہوں۔ اب کہاں جاؤں؟ یہ کہہ کر میں اور زیادہ روئی۔ میرا رونا بناؤنی نہیں تھا۔ اُس پر ایسا اثر ہوا کہ اُس نے مجھے کہا کہ تھوڑی سی دیر بٹھ جاؤ۔ ہماری ایک گاڑی آرہی ہے۔ اُس پر ہمیں بھیج دیں گے۔ تھوڑی دیر بعد ایک فوجی گاڑی باہر سے آئی جو اندر آرہی تھی۔ اسے روک کر اُس فوجی نے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے سی۔ ایم۔ ایچ میں اتار دے۔ اس طرح میں یہاں پہنچ گئی۔“

”یہ خیال رکھنا شمع؟“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”اگر کسی فوجی افسر کے ساتھ بھی تمہاری ملاقات ہو گئی تو اُسے یہ نہ بتانا کہ تمہیں ملٹری پولیس والے نے اس طرح سی۔ ایم۔ ایچ تک پہنچایا تھا۔“

”کیوں؟“ شمع نے پوچھا۔ ”ایسی احتیاط کیوں؟“

”اُسے پوری چھان بین کرنی چاہیے تھی“ عصمت نے جواب دیا۔ ”تمہارا رونا تو بناؤنی نہیں تھا لیکن جاسوس لڑکیوں کا رونا بھی قدرتی لگتا ہے۔ جنگ کے دوران ملٹری پولیس والوں کو اور کسی بھی فوجی کو کسی لڑکی کے آنسوؤں سے اتنی جلدی متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ تمہاری جگہ اگر جاسوس کے گروہ کی کوئی لڑکی ہوتی تو معلوم نہیں وہ ہماری فوج کو کیسا نقصان پہنچا جاتی۔ جاسوس لڑکیاں تمہاری طرح خوبصورت ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ بہر حال تم یہاں آگئی ہو۔ اب بتاؤ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“

”میرا مسئلہ یہ ہے“ شمع نے کہا۔ ”کہ میرے گھر اطلاع پہنچ جائے کہ میں یہاں ہوں اور میں اس مقصد کے لیے یہاں آئی ہوں۔“

”تمہارے گھر میں یا پڑوس میں کسی کا ٹیلیفون ہے؟“

”نہیں“ شمع نے جواب دیا۔ ”آپ اگر فون کر سکتی ہیں تو تمہانے میں ایک کیپٹن طارق

ہے۔ انہیں کہیں کہ میرے والد صاحب کو بتادیں۔“

”ہاں“ عصمت نے کہا۔ ”میں یہ کر سکتی ہوں۔“

”کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کیپٹن طارق کو تم اچھی طرح سمجھا دو کہ میرے جذبات کیا ہیں؟“ شمع نے کہا۔ ”کیپٹن طارق نے ہم پر بڑا احسان کیا تھا۔ اگر وہ تمہانے میں نہ ہوتا تو تمہارا نیا معلوم نہیں ہمیں کتنا خراب کرتا۔“

”شمع! کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں کیونکہ تم اقبال کی بہن ہو، ورنہ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہاری اتنی لمبی کہانی سن سکتی۔ میں تین چار دنوں اور اتوں سے اپریشن تھیلر میں ہوں۔ میرا ایک ایک لمحہ ان زخمیوں کے لیے وقف ہے۔ میری حالت شاید تم دیکھ رہی ہو۔ جسمانی تھکان الگ ہے اور جذباتی کیفیت الگ ہے۔ ان زخمیوں کا جوش اور ان کا دلولہ دیکھتی ہوں تو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا۔ شاف نرس کو تم نے روتے دیکھا تھا نا! میری حالت بھی ایسی ہی ہے۔۔۔۔۔ اور وزیر آباد فون کرنے کا تو میرے پاس وقت ہی نہیں۔ اپریٹر سے کہہ کر نمبر بک کرانا پڑے گا۔ یہ میں صرف تمہارے لیے کر رہی ہوں۔“

”اقبال بھائی جان کو تم اس قدر چاہتی ہو؟“

”شاید اس سے بھی زیادہ“ عصمت نے کہا۔ ”اقبال شہزادہ ہے۔ تمہارا خاندان خاصا امیر کبیر معلوم ہوتا ہے۔“ وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی۔ ”اقبال ہے شیطان لڑکیوں کا ناک میں دم کیے رکھتا تھا۔ کالج سے نکالا بھی اسی لیے گیا تھا لیکن وہ ہمیشہ میرا رٹا اور میرا ہی رہے گا۔ اُس کے ساتھ میری خط و کتابت رہی ہے۔ اگر جنگ شروع نہ ہو جاتی تو میں تمہاری بھابی بن چکی ہوتی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ ”میں ابھی فون کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا تو کیپٹن عصمت آئی۔ شمع کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

”بات ہو گئی ہے شمع!“ عصمت نے کہا۔ ”کیپٹن طارق فون پر مل گیا تھا۔ میں نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ اُس نے مجھے تمہارے متعلق وہی بات سنائی ہے جو تم مجھے پہلے ہی سنا



چکی تھیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اُس نے تمہارے مجنوں رشید کو ابھی تک حوالات میں بند کیا ہوا ہے۔۔۔ میں تمہیں سٹاف نرس کے حوالے کر دیتی ہوں۔ وہ تمہیں میرے کمرے میں پہنچا دے گی صبح تم ہمیں آجانا۔

”کل صبح میرے ابو پہنچ جائیں گے۔“ شمع نے کہا۔ ”اُن کے سامنے تم میرا ساتھ دینا۔“

★

”میں نہیں جاؤں گا۔“ وزیر آباد میں شمع کا باپ اُس کی ماں سے کہہ رہا تھا۔ ”میرے لیے

وہ مرگئی ہے۔“

کیٹن طارق کو کیٹن عصمت کا فون ملا تو اس نے بات کر کے ایک کاسٹیل کو چھڑی کراست کو بلا لے کے لیے بیچ دیا تھا۔ اسی رات کے بعد کا وقت تھا۔ شمع کے گھر سب جاگ رہے تھے۔ اور فضا ماتم کی سی بنی ہوئی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو چوہدری کراست دوڑا گیا اور اس اُمید پر دروازہ کھولا کہ شمع آئی ہوگی۔ شمع کی بال اور چھوٹی بہن بھی ڈوڑھی گئیں اور دروازے کے ساتھ جا کھڑی ہوئیں۔

”تمہارے سے آیا ہوں چوہدری صاحب!۔“ کاسٹیل نے کہا۔ ”آپ کو تمہارے میں طلب

کیا گیا ہے۔“

چوہدری کراست کو یوں لگا جیسے انڈین ایئرفورس کے طیارے نے اُس کے گھر پر بم گرایا ہو۔ اُس نے کواڑ کا سہارا لے لیا۔

”ہماری بیٹی تمہارے میں ہے؟“ شمع کی ماں نے پوچھا۔

”میں نے تو نہیں دیکھی جی!۔“ کاسٹیل نے کہا۔ ”شاید نہیں۔“ وہاں ہوتی تو مجھے ضرور پتہ

ہوتا۔۔۔ آجائیں چوہدری جی!

چوہدری کراست اس طرح تمہارے تک گیا تھا جیسے کوئی نیند میں یا نیم غشی کی حالت میں چلتا ہے کیٹن طارق نے اُسے بٹھایا اور بتایا کہ اُس کی بیٹی کھاریاں چھاؤنی میں سی۔ ایم۔ ایچ میں ہے کیٹن نے اُسے یہ بھی بتایا کہ وہ وہاں کیا کر رہی ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُسے کس سے اطلاع ملی ہے اور اُس نے چوہدری کراست کو تسلی دی تھی کہ گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔

چوہدری کراست کے بوجھ میں کچھ کمی آگئی تھی لیکن اپنی بیٹی کی یہ حرکت کہ وہ بتاتے بغیر چلی گئی تھی، بہت بُری لگی تھی۔ گھر آکر اُس نے بتایا کہ شمع کہاں ہے شمع کی ماں نے کہا تھا کہ ابھی چلے جاتیں یا صبح چلے جائیں اور اُسے سے آئیں۔

”میں نہیں جاؤں گا۔“ چوہدری کراست نے کہا۔ ”میرے لیے وہ مرگئی ہے۔ اُس کے

لیے اس گھر کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔“

چوہدری کراست نے کہہ تو دیا تھا کہ وہ شمع کو دیکھنے نہیں جائے گا۔ اُس کے خیالوں ہی خیالوں میں اپنی بیٹی کے لیے گھر کے دروازے بند کر دیتے تھے لیکن رات کو خیالوں کا جوریلہ آہ اُسے اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ وہ باپ تھا۔ شمع اُس کی گود میں کھیلی تھی۔ شمع بڑی پیاری بچی ہوا کرتی تھی۔ چوہدری کراست دن بھر کا تھکا ماندہ شام کو گھر آکر لیٹتا تو یہ بچی اُس کے پیٹ پر کودا کرتی تھی۔ چوہدری کراست کو اس بچی کے ساتھ کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔ وہ اس بچی کی ہر ضد اور ہر فرمائش پوری کیا کرتا اور اس کی مصحوم سی شرارتوں پر قہقہے لگایا کرتا تھا۔

شمع جوان ہو گئی تھی مگر اُس کی اپنی ضد پر قائم رہنے کی عادت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ پہلے تو وہ اپنے ایک چاہنے والے کے ساتھ پڑھتی تھی لیکن اب وہ ایسی جگہ چلی گئی تھی جس پر کوئی بھی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ چوہدری کراست کو یہ شکایت تھی کہ وہ اُس سے پوچھ کر نہیں گئی تھی۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ چوہدری کراست کا ذہن کبھی تو بالکل خالی ہو جاتا اور تھوڑی ہی دیر بعد سوچوں اور خیالوں کے جھکڑ سے چلنے لگتے۔ چوہدری کراست اپنے آپ کو ڈولتا ڈمکاتا محسوس کرتا۔ غصے سے اُس کا وجود تپ جاتا، پھر غصہ اپنے آپ ہی سرد پڑ جاتا اور وہ دکھ کی ہلکی سی ٹیس محسوس کرتا۔

”خدا دے تو بیٹی نہ دے۔“ اُس کی آواز گل گئی۔

”اب آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“ چوہدری کراست کو کیٹن طارق کی آواز سنائی دی۔ کچھ ہی وقت پہلے کیٹن طارق تمہارے میں چوہدری کراست سے کہہ رہا تھا۔ ”وہ محاذ کے زخمیوں کی خدمت کے لیے گئی ہے۔۔۔ آپ فکر نہ کریں چوہدری صاحب! اب وہ آپ کا نام ڈبولے نہیں اس نام کو روشن کرنے گئی ہے۔۔۔ کھاریاں چھاؤنی میں جا کر اُسے دیکھ آئیں۔ اس کام میں اُس کی حوصلہ افزائی کریں۔“

چوہدری کراست کو یاد آیا کہ لیفٹیننٹ اقبال بھی اُس سے پوچھے بغیر فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اُسے اپنا بیٹا یاد آتا تو اسے پاکستان یاد آ گیا۔ ذہن اُسے ۱۹۴۶/۴۷ء کے دور میں لے گیا۔ وہ بھی ایک جنگ تھی جس میں چوہدری کراست خود شریک تھا۔ وہ جہاد آزادی کا غازی تھا۔ اُسے دُعا

یاد آئے جنہوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کے اسلام دشمن اتحاد میں شکاف ڈالے تھے۔

وزیر آباد کی تاریک فضا ایک گونج سے مٹش ہونے لگی اور فوراً بعد دل دلا دینے والی گرج سے فضا کانپ اٹھی۔ پاک فضا یہ کے دو بمبار طیارے بڑی کم بلندی پر اڑتے ہوئے ہوا کی رفتار سے وزیر آباد کے اوپر سے گزر گئے تھے۔ چوہدری کراست اٹھ بیٹھا۔ طیارے دُور چلے گئے تھے۔ اُن کا ہولناک زلزلہ دہلی دہلی گونج بن گیا تھا اور یہ گونج رات کی تیرگی میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی لیکن چوہدری کراست کا



وجود یوں لرز رہا تھا جیسے اُس کے سینے میں طیارے اڑ رہے ہوں یا جیسے وہ ان طیاروں کے پیچھے اڑنا چاہتا ہو۔

”کیوں؟“ اُسے اپنے گھر کی تاریکی میں قریب سے آواز سنائی دی۔ ”جہازوں کی آواز سے آنکھ کھل گئی ہے؟“

”ہوں۔“ اُس کے منہ سے جیسے بے خیالی میں آہ نکل گئی ہو۔ جذبات کے رعبہ پر اُس نے قابو پایا اور تھکی تھکی آواز میں بولا۔ ”میری تو آنکھ لگی ہی نہیں۔ اس لڑکی نے۔۔۔“

”دل کو ایسا پتھر بھی نہ کریں۔“ اُس کی بیوی نے کہا جو ساتھ والی چائے پانی پر لیٹی ہوئی تھی۔ ”آپ کو اگر یقین آگیا ہے کہ وہ فوجی ہسپتال میں زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال کے لیے چلی گئی ہے تو اس میں برائی کیا ہے۔ ہمارا بیٹا بھی فوجی ہے۔ وہ بھی کسی روز۔۔۔ ماں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔“

چوہدری کرامت جیسے اسی انتظار میں تھا کہ اُس کی بیوی ایک بار پھر اسے کہے کہ وہ اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لیے آگیا ہے۔ وہ غصے میں اعلان کر چکا تھا۔ ”میرے لیے وہ مرنے والی ہے۔“ اُس کی مرنے والی مان نہیں رہی تھی کہ اس اعلان کے بعد وہ اپنے آپ چل پڑے۔

”لیکن میں اُسے اپنے ساتھ لے نہیں آؤں گا۔“ اُس نے کہا۔ ”نہ لانا۔“ اُن کی بیوی نے کہا۔ ”اُسے دیکھ تو آؤ۔ مل آؤ اُسے۔ یہ بھی دیکھ لینا کہ اُس کے رہنے سہنے کا انتظام کیا ہے۔“ اُس نے چوہدری کرامت کے قریب ہو کر سرگوشی میں پوچھا۔ ”اُس صراہ کی اولاد رشید سے کو آپ نے کہیں دیکھا ہے؟ سنا ہے لڑکے بھی فوجی ہسپتالوں میں کام کرنے چلے گئے ہیں۔“

”وہ حالات میں بند ہے۔“ چوہدری کرامت نے کہا۔ ”میں نے کمیٹن طارق سے پوچھا تھا۔ اُسے ابھی نہیں چھوڑیں گے۔“

”میں تو کستی ہوں اُسے پھانسی دے دیں۔“ شمع کی ماں نے کہا۔ ”آپ صبح کھاریاں چلے جائیں۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔ ”اللہ بڑا غرق کرے ان ہندوؤں کا۔ میں نے نذر مانی ہے کہ جنگ ختم ہوتے ہی شمع کی شادی کر دیں گے۔۔۔ لڑکا بھی آگے ہی ہو گا کہیں؟ اللہ اُسے زندہ اور سلامت رکھے۔“

”ہمارے اقبال کی طرح لیفٹیننٹ ہے۔ معلوم نہیں وہ کون سے محاذ پر ہو گا۔ ادھر جنگ ختم ہوئی ادھر میں انہیں پیغام بھیج دوں گی کہ آکر نکاح کر لیں، پھر رخصتی بھی جلدی کر دیں گے۔۔۔ معلوم نہیں ہماری بیٹی کو یہ رشتہ کیوں پسند نہیں۔“

”اگر شمع لڑکے کو دیکھ لیتی تو اس نامراد رشید سے کو بھول جاتی۔“ شمع کے باپ نے کہا۔ ”ہمارا زمانہ کچھ اور تھا۔ آج کی نسل کے دماغ تو کاجوں اور انگریزی نے غراب کر دیئے ہیں۔ میں ان باتوں کا قائل تو نہیں تھا لیکن زمانے کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ موقع پیدا کر کے شمع کو لڑکا دکھا دیں گے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ شمع کی ماں نے کہا۔ ”موقع پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔۔۔ آپ کھاریاں سے ہو آئیں۔“



کھاریاں کے فوجی ہسپتال میں محاذوں جیسی سرگرمی اور بھاگ دوڑ تھی۔ ایمبولینس گاڑیوں اور دوسری گاڑیوں پر بھی زخمی چلے آرہے تھے۔ یہ سب شدید زخمی تھے۔ یہ جہاز، چونڈہ اور سیالکوٹ کے محاذوں سے آرہے تھے۔ اہل جنگ تو چونڈہ کے محاذ پر لڑی جا رہی تھی جہاں دشمن نے اپنی پوری کی پوری بکتر بند قوت جھونک دی تھی۔ یہ اُس کا بکتر بند ڈوئین تھا جس میں پہلے روز چھ سو ٹینک تھے اور فائر بندی تک دشمن نے ایک ہزار سے زائد ٹینک چونڈہ کے میدان میں استعمال کیے تھے۔ بکتر بند ڈوئین اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ توٹین اور انفنٹری ڈوئین بھی تھے۔ توپ خانے اور مارٹر بیٹریوں کا کوئی حساب نہیں تھا۔ ان سب کے علاوہ دشمن کے بکتر بند ڈوئین کوروس، فرانس اور برطانیہ کے دیئے ہوئے جدید لڑاکا بمباریوں کا چھاتہ حامل تھا۔ یہ طیارے پاک فوج کے اگلے مورچوں پر آگ برساتے رہتے تھے۔

اس ہیبت ناک جنگی قوت کے مقابلے میں ادھر صرف ڈیڑھ سو ٹینک تھے جو کم ہوتے گئے ان میں اضافہ نہیں ہوا۔ پاکستان کے بادشاہوں نے جو اٹھارہ برسوں میں ایک دوسرے کے بعد تخت نشین ہوئے تھے۔ اپنی جنگی طاقت میں اضافے کی کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے تخت تاج کے تحفظ کے لیے ملک کے ذرائع اور وسائل کو استعمال کرتے رہے تھے۔ اُن کا دشمن سرحد پار نہیں سرحد کے اندر تھا۔ وہ اپنے سیاسی مخالفین کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور اس دشمن کے قلع قمع میں مصروف رہتے تھے۔ ان بادشاہوں کی دوسری سرگرمیاں تقریر اور بیان بازی تک محدود تھیں، اور وہ اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کے دوروں میں شب و روز کا چکر پورا کر رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام اور پاکستان کا دشمن اپنے ملک کو اسلحہ و بارود خانہ بنانا چلا جا رہا ہے وہ سن رہے تھے کہ دشمن پاکستان کو ختم کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اُس کی دھمکیاں کیدڑ بھجکیاں نہیں بلکہ یہ اُس کے عزائم ہیں جن پر وہ باقاعدہ منصوبہ بندی سے عمل کر رہا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندو قیادت نے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا اور پاکستان کو وہ ہندوستان کا نہیں بلکہ مہابھارت کا حصہ کہہ رہے ہیں۔ وہ ہندو قیادت کے اس دعوے سے بھی بے ناواقف نہیں تھے کہ ہندوستان مہابھارت ہے جس میں انڈونیشیا سے لے کر جبلہ و فرات تک کے علاقے شامل ہیں اور افغانستان بھی مہابھارت میں شامل ہے۔

ہمارے بادشاہ جانتے تھے۔ اقتدار کے بجاری سب کچھ جانتے تھے لیکن ان کی دو مجبوریاں تھیں۔ ایک یہ کہ ملک و ملت اور مذہب کے دشمن کی طرف توجہ دینے سے مکرسی سے توجہ ہٹتی تھی جس سے مکرسی کو خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ دوسری مجبوری یہ تھی کہ انہوں نے امریکہ کو اُن دانا بنالیا تھا اور قومی وقار، قومی پالیسیاں اور خود ارادیت گروی رکھ کر قوم کا بال بال امریکہ کے قرضے میں بھندھ پاتھ۔ ملت پاکستان اپنے دشمن کو دشمن کہنے میں اور اپنے ملک کے دفاع میں بھی آزاد نہیں رہی تھی۔ پاکستان اپنے قدرتی وسائل اور اپنی زمین سے معذریات نکالنے میں بھی آزاد نہیں رہ گیا تھا۔ ملک کے دفاع کا انحصار ان چند ایک ہتھیاروں پر تھا جو امریکہ نے دیئے تھے۔

بھارت کی حکومت اپنا دفاعی بجٹ بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کا بجٹ وہی تھا جو کبھی ابتداء میں منظور کیا گیا تھا۔ اپنے خزانے میں تھا ہی کیا اہمکت کے بادشاہوں

بھارت کی حکومت اپنا دفاعی بجٹ بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کا بجٹ وہی تھا جو کبھی ابتداء میں منظور کیا گیا تھا۔ اپنے خزانے میں تھا ہی کیا اہمکت کے بادشاہوں



اور وزیروں کے دورے۔ ان کے جٹن، دیگر عیاشیاں، خوشامدیوں کے نقد انعامات اور کرپشن ملک کا پیسہ پیسہ چاٹ رہی تھی۔ دفاع کے لیے پیسہ کہاں سے آتا؟

ستمبر ۱۹۶۵ء کی سترہ روز جنگ میں کئی محاذوں پر دشمن کے جدید ٹینکوں کے مقابلے میں قدیم شرم ٹینک لڑے تھے جن کے انجن چلتے چلتے ٹک جاتے اور ٹینک توپ خانے کی توپ بن کر رہ جاتے تھے۔

فوج کی نفری کا یہ تناسب تھا کہ دشمن کے اکیس ڈوٹریوں کا حملہ روکنے کے لیے پاکستان کے پاس پورے پانچ ڈوٹریں بھی نہیں تھے۔

اسلحہ اور ایمونیشن کی کمی کو دیگر جنگی ساز و سامان اور نفری کی کمی کو خاکی وردی میں ملبوس ان انسانوں کے خون سے اور ان کی جانوں سے پورا کیا جا رہا تھا جن کے دوٹوں سے بادشاہوں نے اقتدار کی کرسی حاصل کی تھی۔

عوام کے بیٹے قربان ہو رہے تھے اور لیکچر یہ دیتے جا رہے تھے کہ مسلمان بر میدان میں تھوڑے رہتے ہیں۔ بدر کی مثالیں دی جا رہی تھیں لیکن یہ نہیں بتایا جا رہا تھا کہ اُس وقت مسلمان تھے ہی اتنے کچھ۔ ان کی آبادی آٹھ دس کروڑ نہیں تھی۔ یہ بھی نہیں بتایا جا رہا تھا کہ ان تین سو تیس لاکھ سرفروشنوں کے قاعدین نے اپنے آپ کو غیر ملکی امداد کا محتاج نہیں بنایا تھا اور انہوں نے کسی ملک سے قرضے بھی نہیں لیے تھے۔ وہ قوم کے جذباتوں سے کھیلنے والے نہیں تھے۔

چودہ سو سال بعد، ستمبر ۱۹۶۵ء میں قوم اپنے حکمرانوں کی عیاشیوں اور کوتاہیوں کی پیدا کی ہوئی کمی اور کمزوریوں کو اپنی جان اور اپنے لہو کے نذرانے دے کر پورا کر رہی تھی۔

★

شمع کا باپ چوہدری کرامت علی جب کھاریاں چھاؤنی کے سی۔ ایم۔ ایچ میں داخل ہوا تو قوم کے دیتے ہوئے نذرانے ایمبولینس گاڑیوں اور دوسری گاڑیوں میں چلے ہی آ رہے تھے۔ ان کی خاکی وردیاں گہرے سرخ رنگ کی ہو گئی تھیں ہسپتال کے برآمدوں اور وارڈوں میں نرسیں نرسنگ سپاہی، کابجوں کے طلباء طالبات اور دیگر نوجوان بھاگ دوڑ رہے تھے۔ فضا خون کی بوسے بوجھل تھی رنجیوں میں ایسے بھی تھے جو بازوؤں، ٹانگوں یا آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے محسوس ہو چکے تھے۔

چوہدری کرامت برآمدے میں آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ سب اتنے مصروف تھے کہ کسی کو روک کر اپنی بیٹی کے متعلق پوچھنے سے جھجک رہا تھا۔ اُسے اس جوم میں ایک نرس آتی نظر آئی جو ذرا آہستہ چل رہی تھی۔

”ذرا سنا سنا سنا“ اُس نے نرس کو روک کر کہا۔ ”میری بیٹی وزیر آباد سے آئی ہے۔ وہ وزیروں کا ہاتھ بٹانے آئی ہے۔ اُس کا نام شمع ہے۔ آپ کو معلوم ہے وہ کہاں ہوگی؟“

”یہاں سب آپ کی بیٹیاں ہیں۔“ نرس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہم صرف رنجیوں کو پہچانتی ہیں۔ ایک دوسری کو دیکھنے کا ہوش کہاں ہے۔ وارڈوں میں گھوم پھر کر دیکھ لیں۔“ اور نرس تھکی تھکی سی چال چلتی آگے نکل گئی۔

”اباجان!“ اچانک چوہدری کرامت کو مانوس آواز سنائی دی۔

اُس کی بیٹی شمع اُس کے پہلو کی طرف سے آئی اور اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ چوہدری کرامت نے دیکھا، شمع کے کپڑوں پر خون کے دھبے تھے اور اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چوہدری کرامت کا ہاتھ اپنے آپ شمع کے سر پر چلا گیا۔

”تم ہٹا کر نہیں آئیں۔“ چوہدری کرامت نے کہا۔

”میں نے فون کر دیا تھا۔“ شمع نے دکھاری سی آواز سے کہا۔ ”یہاں نرسوں کی ایک کمیٹین ہے۔... کمیٹین عصمت۔... اقبال بھائی کو جانتی ہے۔ کالج میں ان کی کلاس فیلو تھی۔ اتفاق سے مل گئی۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ وزیر آباد تھا نے میں کمیٹین طارق کو فون کر دے اور وہ آپ کو اطلاع دے دے گا۔“

”تم نے یہاں آکر برا تو نہیں کیا۔“ چوہدری کرامت نے ایسے انداز سے کہا جس میں شفقت تھی۔

”مجھے بتائیں تو میں نہیں روک تو نہ لیتا۔ خود تھارے ساتھ آجاتا۔“

”آپ سے پوچھنے کی جرأت نہ کر سکی تھی اباجان!“ شمع نے کہا۔ ”اور یہ ڈر بھی تھا کہ آپ مجھے گھر سے باہر قدم نہیں رکھنے دیں گے۔“

”پھر بھی۔“ چوہدری کرامت نے کہا۔ ”بتا کر آنا بہتر تھا۔“

★

برآمدے میں رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر کوئی دوڑنے کی رفتار سے چلتا تھا۔ وہاں کھڑے رہ کر باتیں کرنا بڑا مشکل تھا۔ شمع اپنے باپ کو برآمدے سے نکال کر لان میں لے گئی۔ وہاں بعض رنجیوں کے لواحقین ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ شمع اور اُس کا باپ لان کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ شمع اپنے آپ میں تغیر محسوس کر رہی تھی۔ اُس میں جرأت پیدا ہو گئی تھی۔

”اباجان!“ اُس نے بڑی لمبی آواز بھری اور بولی۔ ”میں اُن سب سے رشتہ توڑ کر گھر سے نکلی تھی جنہیں بنا کر گھر سے نکلنا ضروری تھا۔ مجھ سے ایک لغزش ہوئی تھی رگتا ہنگام تو میں پھر بھی نہیں تھی لیکن کسی لڑکے کے ساتھ ایک جوان لڑکی کا رات کو باہر نکل جانا ایک گناہ ہی ہوتا ہے۔ وہ چپ ہو گئی۔ اُس کے ہونٹ کا پینے لگے۔ ان پر قابو پانے کے لیے اُس نے نیچے والے ہونٹ کو دائیں میں جکڑ لیا۔ اُس نے کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔ ”میں نے وہ گناہ نہیں کیا جس کے گناہگار کو شنگار کر دیا جانا چاہیے۔... میں کنواری ہوں اباجان! میری عصمت محفوظ ہے۔“

”بھول جاؤ اُسے بیٹی!“ شمع کے باپ نے کہا۔ ”اس عمر میں عجیب عجیب غلطیاں ہو جاتی ہیں۔“

”مگر بخشتا کوئی نہیں اباجان!“ شمع نے کہا۔ ”خدا معاف کر دیتا ہے۔ خدا کے بندے معاف نہیں کرتے۔... میں گھر میں اچھوت بن گئی تھی۔ ماں نے مجھے طعنے دیتے، جھپوٹی ہنسنے مجھے کہا، آپ شرم کرو۔ نوکرانی نے مجھے نصیحتیں کیں۔... اور آپ نے میرے ہاتھ سے پانی قبول نہ کیا اور کہا کہ کسی اور کو بھیجو۔ مجھ سے تو وہ نوکرانی اچھی ہے جس کے ہاتھ سے آپ نے پانی پی لیا تھا۔“

”شمع بیٹی!“ چوہدری کرامت نے بڑے پیار سے کہا۔ ”تم تھارے سینے میں جو کچھ بھی ہے



کے لوتھرے لٹک رہے تھے۔ انٹریاں باہر آئی ہوئی تھیں۔ ان میں ایسے بھی تھے جن کی ایک ایک ٹانگ یا ایک ایک بازو محاذ پر ہی رہ گیا تھا۔

”مگر چوہدری صاحب! — کیپٹن عصمت چوہدری کرامت کو سنا ہی تھی — ان میں کئی ایسے زخمی آئے ہیں اور آ رہے ہیں جنہیں دو چار گھنٹے پہلے مرجانا چاہیے تھا لیکن وہ آپریشن ٹیبل پر زندہ پہنچے بلکہ وہ ہوش میں تھے۔ یہ معجزے ہو رہے ہیں چوہدری صاحب! انہوں نے میڈیکل سائنس کو جھٹلادیا ہے۔“

”اسے ایمان کی قوت کہتے ہیں عصمت بیٹی! — چوہدری کرامت نے کہا — ”مسلمان کا جسم نہیں رُوح لڑا کرتی ہے۔“

”میں حیران ہوں — کیپٹن عصمت نے کہا — ”اتنی زیادہ تکلیف اور نزع کے عالم میں بھی یہ اپنی ماؤں کو اپنی بہنوں کو، اپنے باپوں اور بچوں کو یاد نہیں کرتے۔ کہتے ہیں ہیں مورچوں میں چھوڑ آؤ۔ جہاں ہمارے ساتھی کھڑے رہے ہیں ہم وہاں مریں گے۔ یہ اللہ اور پاکستان کی باتیں کھتے ہیں۔“ پھر شمع کی باتیں ہونے لگیں کیپٹن عصمت نے چوہدری کرامت کو تسلی دی کہ وہ شمع کا فخر نہ کرے اور واپس چلا جائے۔

”یہ میرے کمرے میں رہے گی — کیپٹن عصمت نے کہا — ”اس کے کپڑوں کے دو تین جوڑے اسے دے جائیں.... اقبال میرا کلاس فیلو تھا۔ معلوم نہیں کون سے سیکٹر میں ہے۔“ کیپٹن عصمت نے چوہدری کرامت کے ساتھ اتنی زیادہ باتیں کرنے کا وقت صرف اس لیے نکال لیا تھا کہ وہ اقبال کو چاہتی تھی اور اقبال نے اُس کے ساتھ کبھی شادی کا وعدہ کیا تھا۔

چوہدری کرامت پورے اطمینان سے واپس آیا۔ اب اُس کے ضمیر اور اعصاب پر کوئی بوجھ نہیں تھا مگر اُسے جب رشید یاد آتا تھا جس کے ساتھ شمع پکڑی گئی تھی تو وہ اپنے سینے میں چھین سی محسوس کرتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ اسے برداشت کرنا تھا اور اس واقعہ کو ذہن سے اتارنا تھا لیکن چوہدری کرامت کو اس واقعہ کا پہلو پریشان کر رہا تھا کہ رشید اچھا اور چھپھورا لڑکا ہے، وہ سارے شہر میں مشہور کر دے گا کہ شمع اُس کے ساتھ پکڑی گئی تھی۔



اُسے معلوم نہیں تھا کہ تھانے میں رشید کا اوجھاپن ختم ہو چکا تھا۔ اسپیکٹر شاہ نے کیپٹن طارق کو کئی بار کہا تھا کہ اس لڑکے کے خلاف کوئی الزام نہیں نہ اس پر کوئی شک ہے اور اس میں اتنی ہمت بھی نظر نہیں آتی کہ یہ جاسوسوں کے گروہ میں شامل ہو جاتا لہذا اسے چھوڑ دیا جائے لیکن کیپٹن طارق کو اُس پر یہ غصہ تھا کہ اُن دنوں نوجوان اور بچے بھی جنگی جذبے سے دیوانے ہوئے

جار رہے ہیں اور یہ لڑکا عشق بازی میں لگا ہوا ہے کیپٹن طارق کو رشید پر یہ غصہ بھی تھا کہ اُس نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ شمع کے ساتھ نہیں تھا۔ اُس نے رشید کو حوالات میں بند کر دیا تھا۔

رشید حوالات میں روتا تھا۔ اسپیکٹر شاہ اور کیپٹن طارق کو دیکھ کر وہ دھاڑیں مارنے لگتا تھا۔ اُس کا باپ، بھائی اور لواحقین تھانے آئے اور اُس کے جرم کے متعلق پوچھتے اور منّت سماجت کرتے تھے کہ اُسے چھوڑ دیا جائے۔

جتنا غبار رکا ہوا ہے نکال دو۔ میں سنوں گا لیکن ایک بات میری بھی سُن لو۔ تم نے اور تمہاری ماں نے ہجرہ پر بدعتی کا الزام لگایا تھا اور تم نے اُسے ایسی باتیں کہ دی تھیں جو وہ مجرم بھی برداشت نہیں کر سکتے جو اپنے جرم کا اقبال کو لیا کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ معصوم ہے، بے قصور ہے اس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ جوان ہے، خوبصورت ہے اور وہ نوکرائی ہے.... غریب کی آہ سے بچو بیٹی!

میں نے اپنی اتنی زیادہ عمر میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ آگے چل کر یہ سب کچھ تم بھی دیکھو گی.... جو بول نہیں سکتا اُسے یہ نہ کہو کہ وہ کچھ محسوس نہیں کر سکتا۔ جذبات اور احساسات اُس کے بھی ہوتے ہیں جو گونگا اور بہرہ ہوتا ہے۔ ہم مجبور اور مقہور کی زبان بند کر سکتے ہیں، اُس کی آہوں اور خاموش فریادوں کو نہیں روک سکتے۔“

”آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھ پر ہجرہ کی آہ پڑی ہے؟ — شمع نے پوچھا۔“

”ہاں بیٹی! — چوہدری کرامت نے کہا — ”میں یہی کہنا چاہتا ہوں میں تمہیں یہی سمجھانا چاہتا ہوں.... اب کو، تم کیا کہہ رہی تھیں!“

”مجھے اپنی غلطی کا احساس اُس وقت ہوا تھا جب اُس لڑکے نے تھانے میں کہا تھا کہ میں اُس کے ساتھ تھی ہی نہیں۔“ شمع نے کہا۔ ”میں نے اُسے اپنے دل سے دھنکار دیا تھا لیکن آپ نے مجھے دھنکار دیا۔ میں تو گھر سے اپنے اس وجود کو جس کے لیے باپ کا پیار ختم ہو گیا تھا ختم کرنے نکلی تھی اللہ کو کچھ اور منظور تھا ورنہ اس وقت آپ ریل گاڑی سے کٹی ہوئی میری لاش کا جنازہ پڑھ رہے ہوتے.... گھر سے نکل کر کچھ ایسا خیال آیا جو میرا اپنا نہیں تھا۔ یہ خداوند تعالیٰ نے مجھے روشنی دکھائی تھی میں تو کہتی ہوں کہ خدا نے نہ صرف یہ کہ مجھے بخش دیا ہے بلکہ مجھے روشنی دکھا کر اُس راستے پر ڈال دیا ہے جس پر میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر سکتی ہوں۔“

شمع نے باپ کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کھاریاں کس طرح پہنچی تھی اور کس طرح اُس کی ملاقات نرسنگ سروس کی کیپٹن عصمت سے ہو گئی۔

”آپ کیپٹن عصمت سے مل لیں۔“ شمع نے کہا۔ ”وہ مشکل سے ہی ملے گی۔ وہ آپریشن تھیٹر میں ہو گی۔ میں اُس کے کمرے میں رہوں گی۔“



چوہدری کرامت کو کیپٹن عصمت شام چار بجے کے قریب ملی۔ اُس کی دردی زخمیوں کے خون سے سرخ تھی۔ اُس کی اتنی خوبصورت آنکھیں بھی سرخ تھیں اور وہ جیسے اپنے آپ میں بھی ہی نہیں۔ اُس کی رات آپریشن تھیٹر میں گزاری تھی صبح وہیں ہوئی تھی۔ دن بھی وہیں گزرا تھا اور اب ذرا استنا نے باہر نکلی تھی۔ ڈاکٹر محاذ کے زخمیوں کے مسلسل آپریشن کر رہے تھے کیپٹن عصمت ڈاکٹر نہیں تھی لیکن اُسے آپریشن تھیٹر میں رہنا پڑتا تھا۔

زخمیوں کے زخم کھلاڑیوں اور تلواروں کے سیدھے زخم نہیں تھے جنہیں ٹانگے لگا کر اوپر پٹیاں باندھ دی جاتیں۔ یہ توپوں کے گولوں اور گرنیڈوں کے ٹکڑوں کے زخم تھے۔ بعض زخمیوں کے چہرے اڑے ہوئے تھے۔ پیٹ پھٹے ہوئے تھے۔ ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ جسموں سے گوشت



جب چوہدری کرامت علی کھاریاں سے واپس اپنے گھر آیا اُس وقت تھانے میں کیپٹن طارق حوالات کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ رشید کا باپ برآمدے میں کھڑا تھا۔ آج اُس نے کیپٹن طارق اور انسپکٹر شاہ کی اتنی زیادہ منت سماجت کی تھی کہ روڑا تھا کیپٹن طارق اٹھا اور حوالات کے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ رشید حوالات میں فرش پر گھٹنوں میں سر دیتے بیٹھا تھا۔ ایک حوالاتی نے اُسے ٹھوکر مار کر بتایا کہ کپتان صاحب آتے ہیں۔ رشید تیزی سے اٹھا اور حوالات کی سلاخوں سے جا لگا اور روزمرہ کی طرح رونے اور بلبلانے لگا۔ کیپٹن طارق کچھ کہنے بغیر اُسے دیکھتا رہا۔ رشید بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ باہر نکال کر اُس نے کیپٹن طارق کے پاؤں پکڑ لیے۔ کیپٹن طارق پیچھے ہٹ گیا۔

کیپٹن طارق نے اسے۔ ایس۔ آئی کو بلا کر کہا کہ اسے باہر نکالو۔ اسے۔ ایس۔ آئی چابی لایا اور رشید کو باہر نکالا۔ کیپٹن طارق اُسے اپنے ساتھ تھانے کے دفتر میں لے گیا اور اُس کے باپ کو بلایا۔

”میری بات غور سے سنیں محترم!“ کیپٹن طارق نے رشید کے باپ سے کہا۔ ”میرے صرف اشارے پر آپ کے اس بیٹے کو جیل میں بند کر دیں گے اور دو سال۔ تین سال۔ شاید اس سے بھی زیادہ عرصہ یہ بغیر مقدمے کے جیل میں پڑا رہے گا۔ اس کی ساری عمر تباہ ہو جائے گی۔ آپ اس کے غم میں بی۔ بی کے مریض ہو جائیں گے۔۔۔ میں آپ پر رحم کرتا ہوں لیکن ہم نے اس لڑکے کا نام تھانے کے ریکارڈ میں لکھ لیا ہے اور اس کا نام اور پتہ ملٹری انیلی جنس اور ملٹری پولیس کو بھی دے دیا ہے۔“

”کیپٹن صاحب!“ رشید کے باپ نے کہا۔ ”میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ آپ حکم دیں تو میں شہر کے چار پانچ معززین کی ضمانتیں لے آؤں گا۔“

”آپ کا یہ بیٹا اس قابل نہیں کہ کوئی معزز شخص یہ کہہ دے کہ وہ اس کی ضمانت دیتا ہے۔“ کیپٹن طارق نے کہا۔

”جناب کیپٹن صاحب!“ باپ نے منت کی۔ ”اس کی ماں روز دگر پگل ہو رہی ہے۔“

”یہ ہے ہی اس قابل کہ اپنی ماں کے گھٹنے کے ساتھ لگا بیٹھا رہا کرے۔“ کیپٹن طارق نے کہا۔

”میری پوری بات سن لیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج کل نوجوانوں میں کیسا جذبہ ہے اور وہ کیا کر رہے ہیں لیکن آپ کا یہ بیٹا فلمی ڈرامے کیل رہا ہے۔ ایک شریف باپ کی بیٹی کو ورغلا کر باہر لے گیا تھا، پھر اس نے جھوٹ بولا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ نہیں تھا۔“

”کیپٹن صاحب!“ رشید کے باپ نے کہا۔ ”میرے دوسرے دونوں بیٹے دن رات جنگی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ خدا کی قسم دو دو مرتبہ خون دے چکے ہیں لیکن میرا یہ بیٹا۔۔۔“

”اس کے جسم میں خون رہ ہی کہاں گیا ہے جو یہ فوج کو دے دے۔“ انسپکٹر شاہ نے کہا۔

”اس کی مروت نے اس کا خون چوس لیا ہے۔ آپ کیپٹن صاحب کا حکم سن لیں بیچ میں نہ بولیں۔“

”آپ کے بیٹے کے کیریکٹر کے لڑکے جھوٹے قصے سنا کر ہیر دہننے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”اس لڑکے نے اگر کہیں یہ ذکر کر دیا کہ فلاں لڑکی اس کے ساتھ باہر گئی تھی تو میں اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دوں گا۔ آپ بھی اس سے نہیں پوچھیں گے کہ وہ لڑکی

کون تھی۔ کس کی بیٹی تھی۔۔۔ آپ کو معلوم تھا کہ آپ کا یہ بیٹا آپ کے دوسرے بیٹوں سے مختلف ہے پھر بھی آپ نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب ہم اسے سیدھا کریں گے۔“

”کیپٹن صاحب!“

”میری بات سن لیں۔“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”وہ جو سرحدوں پر خون میں نہا رہے ہیں اور جن کی لاشیں ٹینکوں تلے پھلی جا رہی ہیں وہ بھی کسی کے بیٹے ہیں۔ آپ کے اس بیٹے کو بھی سرحد پر ہونا چاہیے۔“

”تھا سگر یہ لڑکا مسلمان کی اولاد معلوم نہیں ہوتا۔ میں اب یہ چاہتا ہوں کہ یہ ہوش میں آجائے اور انسان کا بیٹہ بن جائے۔۔۔ اور سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ یہ اپنی زبان بند رکھتے۔“

”کیپٹن طارق نے جھوٹ بولا۔“ ہر وقت سی۔ آئی۔ ڈی کے ایک وہ آدمی اسے دیکھتے رہیں گے۔ جوں ہی اس کے منہ سے اُس لڑکی کے متعلق کوئی بات نکلی، یہ وہیں پکڑا جائے گا۔ اسے لے جائیں اور اس پر سختی کریں، اس کا دماغ درست کریں۔“

”اجازت ہے صاحب!“ رشید کے باپ نے پوچھا۔

”لے جائیں اسے!“ کیپٹن طارق نے کہا۔

رشید اپنے باپ کے ساتھ کھڑا تھا۔ باپ ایک قدم پیچھے ہٹا اور پیشتر اس کے کہ کسی کو تپ چلتا کہ وہ کیا کرنے لگا ہے۔ اُس نے اپنے ایک پاؤں کا جوتا اتارا۔ رشید ننگے سر تھا اور وہ کیپٹن طارق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے باپ نے بڑے زور سے رشید کے سر پر جوتا مارا اور بولا۔ ”چل میرے بیٹے!“

”رشید بدک کر پرے ہو گیا اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر رونے لگا۔ کیپٹن طارق اور انسپکٹر شاہ ہنس پڑے۔“

باپ نے رشید کو بازو سے پکڑا اور اُسے دروازے کی طرف کر کے ایک جوتا اور اُس کے سر پر مارا اور بولا۔ ”آگے چل۔“

”رشید آگے کو چل پڑا۔ برآمدے سے نکلتے باپ نے اُس کے سر پر ایک جوتا مارا اور جہاں تک باپ بیٹا تھا نے والوں کو نظر آتے رہے۔ باپ آٹھ دس قدم بعد اُسے جوڑے مارتا رہا۔“

”میں صرف یہ چاہتا تھا کہ لڑکی کے باپ کی رسوائی نہ ہو۔“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”اسی لیے میں اس لڑکے اور اس کے باپ کو ڈرا رہا تھا۔“

”یہ تو آنے والی نسلوں کو بھی کہہ جائیں گے کہ زبان بند رکھنا۔“ انسپکٹر شاہ نے کہا۔

★

ماجدہ بڑا کڑا مٹھی اور باورچی خانے میں برسٹو گھورنے لگی۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ وہ کام دھندے سے فارغ ہو کر باورچی خانے میں فرش پر لیٹی تو اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ سوئے ذرا ہی دیر گزری ہو گی کہ وہ ڈر کر جاگ اٹھی۔ اُسے لگا تھا جیسے قریب ہی کہیں دھماکہ ہوا ہو۔ وہ اسے خواب کا دھماکہ سمجھ رہی تھی۔ اُس کا دل گھبراہٹ سے دھاک دھاک کر رہا تھا۔ اُس نے کھکی تھکی سی آنکھیں لی اور پھر سو جانے کی کوشش کرنے لگی لیکن سینے میں گھٹن سی بڑھتی گئی۔ شام کی چائے میں ابھی خاصا وقت تھا۔ وہ اٹھی اور اقبال کی ماں سے پھر وہی بہانہ کیا جو پہلے بھی کر چکی تھی کہ وہ اپنے گاؤں کی ایک سہیلی سے ملنے جا رہی ہے۔ اجازت لے کر باہر نکل گئی۔



ہوائی حملے کا سائرین چیخ رہا تھا۔ بعض لوگ کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے۔ اے آر پی کے ساتھ کام کرنے والے لڑکے گلیوں میں ولسیں بجاتے بھاگ دوڑ رہے تھے اور اکثر لوگ چپٹوں پہ کھڑے دشمن کے بمباریوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہجرہ سائرین کے واویلے سے بے نیاز افضل کے گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ افضل کسے محبت اور اُس کی باتوں نے اُسے اور زیادہ نڈر بنا دیا تھا۔ اُسے پرواہ ہی نہیں تھی کہ چوہڑی کمرات نے اُسے افضل کے کمرے میں جانے سے روکا تھا اور اقبال کی ماں اور بہنوں نے اُسے بڑی گھٹیا باتیں کہہ دی تھیں۔ یہ اُس کی سادگی اور نیک چلنی کی انتہا تھی کچھلی ملاقات میں اُس نے افضل کو بتایا تھا کہ چوہڑی کمرات نے اُسے کیا کہا تھا۔

”نہ آیا کرو ہاجو!۔ افضل نے کہا تھا۔“ ”تمہاری عزت پر میں اپنی محبت کو قربان کر سکتا ہوں۔“ ”ایسا نہ کہو افضل جی!۔“ ہجرہ نے افضل کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا تھا۔ ”تمہارے پاس آکر میں اپنے آپ کو بے آسرا نہیں سمجھتی۔ میرے دل کے پرانے زخم مل گئے ہیں۔۔۔ مجھے اپنے پاس رکھ لو افضل جی! لوگ جو کچھ کہتے ہیں کہتے ہیں۔“

”تم آخر میرے ہی پاس آؤ گی ہاجو!۔ افضل نے بڑے پیار سے کہا تھا۔“ ”مجھے ذرا تعلیم سے فارغ ہو لینے دو۔“

ہجرہ نے افضل کا گال اپنے رخسار سے لگا کر بڑی زور سے بھینچا تھا اور کتنی ہی دیر سکیا لے لے کے روتی رہی تھی۔ افضل نے اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور اُس کے گال اور بال سہلا تارہا تھا۔ آج بھی دوپہر کے بعد وہ نیند میں ڈر کے جاگ اٹھی تو دل کی گھبراہٹ سے اُکٹا کر افضل کے ہاں چل دی۔

راستے میں اسے صوبیدار اکبر علی مل گیا۔ وہ بہت تیز چلا آ رہا تھا۔ ہجرہ خوش تھی کہ وہ لڑائی پر چلا گیا ہے، مگر وہ پھر وزیر آباد کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ ہجرہ اسے خواب سمجھنے لگی۔ وہ تو کہتی تھی کہ اکبر علی لڑائی پر چلا گیا ہے تو ادھر ہی مارا جائے مگر وہ زندہ اور سلامت واپس آ گیا تھا۔ اُس نے وردی نہیں پہن رکھی تھی۔ وہاں اور کوئی راستہ نہ تھا ورنہ وہ راستہ بدل لیتی۔ دونوں کے درمیان فاصلہ کم ہوتے ہوئے ختم ہو گیا۔

اکبر علی ہجرہ کے قریب آ کر۔ ہجرہ کو توقع تھی کہ وہ آج پھر کسے گا کہ ہاجو! میرے ساتھ شادی کر لو۔ سونے سے لادووں گا۔ لیکن اکبر علی کی چال ڈھال میں عجیب سی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ ہجرہ کے پاس اس طرح رکا جیسے رکنا نہیں چاہتا تھا۔ جب ہجرہ سے مخاطب ہوا تو اُس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے اُسے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

”اوہ! تم۔۔۔ ہاجو!۔ اُس نے پوچھا۔“ ”کہاں جا رہی ہو؟“

”اپنے کام سے۔“ ہجرہ نے بے رخی سے کہا اور اُس کے دل سے نفرت اُٹھ آئی۔ اُس نے طنز یہ کہا۔ ”تم تو لڑائی پر گئے تھے۔ بھاگ آتے؟۔۔۔ میدان میں مردہ ہی ٹھہر سکتے ہیں۔“

صوبیدار اکبر علی نہ ہنسا، نہ مسکرایا جیسے اُس نے ہجرہ کی بات سنی ہی نہ ہو۔ ہوائی حملے کے

سائرین چپ ہو گئے تھے۔ دوسرے لمحے ”آل کلیئر کی لمبی لے“ بجنے لگی۔

”وزیر آباد کے ارد گرد یہ تیسرا ہوائی حملہ ہے۔“ اکبر علی نے اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز میں کہا۔ ”تینوں حملے ریل گاڑیوں پر ہوئے ہیں۔“ وہ بولتے بولتے اس طرح چپ ہو گیا جیسے اپنی آواز سے چونک اٹھا ہو۔ اُس کے سامنے ہجرہ کھڑی تھی۔ وہ تو جیسے ہجرہ کی موجودگی سے ہی بے خبر تھا۔ قدرے بوکھلا کر بولا۔ ”ہجرہ! میں نے تمہیں اس لیے روک لیا تھا کہ ہوائی حملے کے وقت باہر نہ نکلا کرو۔“ اور وہ تیز قدم آگے نکل گیا۔

اُس کے انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے اُسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو۔ ہجرہ وہیں کھڑی رہی۔ اُسے اکبر علی کا رنگ ڈھنگ بدلنا نظر آ رہا تھا۔ پاکستان پر بھارتی حملے کے بعد ساری دنیا بدل گئی تھی لیکن ہجرہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی کہ اکبر علی بھی بدل سکتا ہے۔ اس شخص کو اُس نے ہمیشہ قابلِ نفرت اور گھناؤنے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ اب سمجھ رہی تھی کہ اکبر علی لڑائی سے بھاگ آیا ہے۔ ہجرہ کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ کوئی فوجی لڑائی سے بھاگ نہیں سکتا اور پاک فوج کا غازی تو بھاگنے کے نام سے ہی واقف نہیں۔ ہجرہ کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ محاذوں پر پاک فوج کے کمانڈروں کے لیے مسئلہ یہ نہیں کہ جوانوں کو لڑائیں کیسے بلکہ مشکل یہ پیش آرہی ہے کہ انہیں لڑنے سے کیسے کیسے؟ مثلاً لاہور کی دفاعی لائن بی آر پی کا اس طرف کا کنارہ تھا مگر پاک فوج کے جوان نہر پھلانگ کر دشمن سے دست بردست لڑنے کے لیے منہ زور ہوتے جا رہے تھے۔

★

صوبیدار اکبر علی نے تمام تر سروس ملٹری پولیس میں کی تھی۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں لانس ٹانک کے عہدے پر بریگیڈ کی انٹیلی جنس سیکشن میں رہا تھا اور اُس نے برما فرنٹ پر پُر خطر حالات میں بڑی قیمتی رپورٹیں فراہم کی تھیں۔ پاک فوج میں وہ صوبیداری کے عہدے تک پہنچا تھا اور جنگ ستمبر شروع ہونے سے پہلے ہی نیشنل پر آ گیا تھا۔ وہ انٹیلی جنس کا انسٹرکٹر رہ چکا تھا۔ جوان شریف پر بھارتی گولہ باری کے تیسرے چوتھے روز اُسے فوج میں واپس بلا لیا گیا تھا۔ بھارت نے لاہور پر حملہ کر دیا تو یکے بعد دیگرے بھارتی طیارے دھونکل اور راہوالی ریلوے سٹیشنوں پر حملہ کر گئے۔ پھر اسی علاقے میں ایک اور ہوائی حملہ ہوا۔ جب بھی دشمن کا ہوائی حملہ ہوتا تھا تو کوئی نہ کوئی مال گاڑی اس علاقے سے گزر رہی ہوتی تھی۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ اس علاقے میں بھارت کے جاسوس سرگرم عمل ہیں۔ وزیر آباد ڈپٹی ایس ایس اور نازک مقام بن گیا تھا۔ صوبیدار اکبر علی کو بھارتی جاسوسوں کی سرنگرانی کے لیے وزیر آباد بھیج دیا گیا تھا۔ یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ جنگ کی دوسری رات بھارتی پیراشوٹوں کے ذریعے دو تین جاسوس یا تحریب کار وزیر آباد کے علاقے میں اتارے ہیں۔ اکبر علی وزیر آباد واپس آ گیا تھا لیکن وہ وردی میں نہیں سادہ کپڑوں میں گھومتا پھرتا اور لوگوں کو بتاتا تھا کہ اُسے فوج والوں نے عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے واپس بھیج دیا ہے۔

اکبر علی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کس قدر خطرناک اور اہم ترین محاذ پر لڑ رہا ہے۔ وہ اپنے مد مقابل کو بھی خوب جانتا تھا جو جالندھر میں بیٹھا وزیر آباد میں پھیلے ہوئے جاسوسوں کو لمحہ بلمحہ ہدایات



دے رہا تھا اور ان کی رپورٹیں سن رہا تھا۔ جالندھر کی سرگوشیاں وزیر آباد میں سنائی دے رہی تھیں اور وزیر آباد کی آواز جالندھر پہنچ رہی تھی۔ ان آوازوں کو سننے والے نہیں سمجھ سکتے تھے کہ کوئی کسی کو کیا کہہ رہا ہے۔ یہ باتیں خفیہ زبان (کوڈ) میں ہوتی تھیں۔

کرنل پی سی گپتا انڈین آرمی انٹیلی جنس کا گھما گھما افسر تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ بٹالین انٹیلی جنس سیکشن میں نامک تھا۔ صوبیدار اکبر علی بھی اسی بٹالین میں لانس نامک تھا اور گپتا کے ساتھ بریگیڈ انٹیلی جنس میں کام کیا کرتا تھا۔ اُس وقت دونوں کی سروس ابھی تین تین چار چار برس تھی۔ آج صوبیدار اکبر علی کو اپنی انٹیلی جنس کے زور پر علم ہو گیا تھا کہ اُس کا مد مقابل اُس کا پرانا ساتھی گپتا ہے جو اُس وقت نائیک ہوا کرتا تھا اور آج کل کرنل ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں گپتا نے برما فرنٹ پر بریگیڈ انٹیلی جنس میں برطانوی افسروں کے ساتھ کام کیا تھا۔ اُس نے وہ دھنک بکھ لیے تھے جو انڈین آرمی میں کم ہی کسی نے سیکھے ہوں گے۔ جاپانیوں کو جنگل کی لڑائی کا ماسٹر سیم کیا جاتا تھا اور ان کا گوریل آپریشن، برطانوی، ہندوستانی اور امریکی ڈوٹریوں کے لیے ایسی مصیبت بن گیا تھا کہ ان کا کوئی مورچہ جتنا ہی نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدرتی والے جاپانی سپاہی چوہوں کی طرح جنگل میں رہتے سرکتے اتحادی فوج کے اگلے مورچوں کے پیچھے آجاتے اور ان کا بے تحاشہ نقصان کر کے جنگل میں غائب ہو جاتے تھے۔

جاپانیوں کا جاسوسی کا نظام بڑا ہی کارگر تھا۔ برما کے مقامی لوگوں میں جاپانیوں کے جاسوس اور تحریک کار تھے۔ یہ لوگ جاپانی کوریوں کی پوری پوری مدد کرتے تھے۔

یہ نامک گپتا تھا جس نے جاپانی کوریوں کی راہیں بند کر دی تھیں۔ جاپانی اپنی کوئی حرکت کوئی پوزیشن اور کوئی سکیم گپتا سے نہیں چھپا سکتے تھے۔ ایک اس لیے کہ وہ نڈر تھا اور جان پر کھیل کر دوز آگے نکل جایا کرتا تھا۔ دوسرے اس لیے کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین تھا۔ جنگل میں چھوٹے چھوٹے ندی نالے تھے جن پر چھوٹے چھوٹے پل تھے۔ ان کی طرف اتحادیوں نے کبھی دھیان ہی نہ دیا تھا لیکن یہ پل عظیم جنگی اہمیت کے حامل تھے۔ جاپانی کوریوں کے لیے یہ پل بڑے کام کے تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ گپتا نے جاپانیوں کا مواصلاتی اور رسد و رسال کا نظام بھی دیکھ لیا تھا۔ اُس نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو برطانوی ہمارٹیا روں کے لیے بہت سے تارکیت بتائے تھے جب ہماروں نے اُس کی نشاندہی پر ہماری کی تو جاپانی کوریوں نے چھوٹے چھوٹے پل تباہ ہو جانے سے بے بس ہو گئے۔ اس کے علاوہ جاپانیوں کا پہلائی سسٹم بیکار ہو کے رہ گیا۔ ان میں سے بعض جان جو کھول کی مہموں میں اکبر علی بھی گپتا کے ساتھ تھا۔ یہ ایک گروپ تھا جس کا کمانڈر ایک انگریز میجر تھا۔ اس گروپ میں برما کے چند ایک مقامی آدمی بھی تھے جو گاؤں گاؤں میں اکبر علی اور گپتا بہت تیز اور عقل مند تھے۔

گپتا کو جنگ کے دوران ہی کمشن مل گیا تھا مگر اکبر علی لانس نامک ہی رہا تھا۔ دونوں رہتک کے ایک ہی قصبے کے رہنے والے تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو گپتا گپتان تھا اور اکبر علی نامک۔ پھر پاکستان بن گیا تو اکبر علی پاکستان آنے کی تیاری کرنے لگا۔

”تم ہندوستانی ہو اکبر علی!“ گپتا نے اکبر علی سے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ ”میں تمہیں انڈین آرمی میں کمشنر دلا دوں گا۔ پاکستان جا کر اپنی سروس تباہ نہ کرو۔ پاکستان کی نہ کوئی فوج ہے نہ آئندہ ہوگی اور تمہاری قابلیت کی کوئی قدر نہیں کرے گا۔ پاکستان نہ جاؤ۔“

اکبر علی سلمان ہو کر انڈین آرمی میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ مسلمانوں کا قتل عام دیکھ رہا تھا چند ہی روز پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی۔ اُسے اپنی بیوی، اُس کے رشتہ داروں اور اپنے مال باب کے متعلق بڑی پریشانی تھی۔ رہتک کے اس قصبے سے کسی کا بھی بچ کے پاکستان آجانا ممکن نظر آ رہا تھا۔

”اکبر دوست!“ ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت گپتا نے ایک بار پھر اُسے کہا تھا۔ ”فرنٹ پر ہم دونوں اکٹھے موت سے کھیلنے رہے ہیں۔ مجھے اُس دوستی کا پاس ہے۔ ایک بار تم نے میری جان بچائی تھی۔ میں تمہیں اس کا صلہ دینا چاہتا ہوں۔ انڈین آرمی میں رہ جاؤ۔ نامک سے لیفٹیننٹ بنادینا میرا کام ہے۔“

”گپتا صاحب!“ اکبر علی نے اُسے کہا تھا۔ ”اگر آپ کو دوستی کا اس قدر خیال ہے تو میرے خاندان کو حفاظت سے لاہور تک پہنچا دو۔ تمام عمر احسان نہ بھولوں گا۔“

گپتا گہری سوتح میں کھو گیا پھر مسکرا کر بولا۔ ”آج رُکے رہو۔ کل ایک ٹرک تم سب کو پاکستان پہنچا دے گا۔“

دوسری صبح ایک ٹوٹا پھوٹا پریویٹ ٹرک اکبر علی کے خاندان کے لیے آگیا۔ اکبر علی گپتا سے بغل گیر ہو گیا اور اُس کے آنسو ٹپک آتے تھے۔ اُس کے تمام عزیز و اقارب ایک جگہ جمع تھے۔ اُس نے سب کو ٹرک میں بھرا۔ اس قافلے میں تین معصوم بچے بھی تھے، جوان سال لڑکیاں، عورتیں اور دو بوڑھے بھی اور اسی میں اکبر علی کی بیوی بھی تھی۔ گپتا نے دو ہندو سپاہی ٹین گنوں سے مسلح ٹرک میں بٹھا دیتے تھے۔ ڈرائیور بھی مسلح فوجی تھا۔ ٹرک شام کے وقت چل پڑا۔

اکبر علی گپتا کا بہت مشکور تھا مگر بھول گیا تھا کہ گپتا ہندو ہے۔ تین سارے تین گھنٹوں کے بعد ٹرک دیرانے میں اچانک رک گیا اور انجن بند ہو گیا۔ اکبر علی ڈرائیور کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اتفاق سے اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ڈرائیور نے ٹرک کا انجن خود ہی بند کر دیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ انجن بند ہو گیا ہے۔ اُس نے بلاوجہ سیٹ سے اٹھ کر انجن کھول لیا تھا۔ اکبر علی کو شک گزرا۔ اُس نے دیکھا کہ ٹرک ڈرائیور اپنی سیٹ گن سیٹ پر چھوڑ گیا تھا۔ میگزین گن میں لگی ہوئی تھی۔ اکبر علی نے سیٹ گن اٹھالی۔ عین اُس وقت ٹرک میں بیٹھے ہوئے دونوں ہندوستانی سپاہیوں نے ٹرک کے مسافروں پر سیٹ گن کا فائر کھول دیا۔ اکبر علی کو دھوکہ دینے سے باہر آیا لیکن اپنے پیچھے چلائے، سرتے اور گرتے رشتہ داروں میں اُسے ہندو سپاہی نظر نہیں آتے تھے۔ وہ فارتیے جا رہے تھے۔

کل پانچ منٹ گزرے ہوں گے۔ اکبر علی کے لیے صورت حال بڑی مشکل تھی۔ اُس نے دیکھا کہ ڈرائیور سیٹ پر اپنی سیٹ گن تلاش کر رہا تھا۔ اکبر علی نے چھوٹا سا برسٹ فائر کر کے ڈرائیور کو ٹھنڈا کر دیا۔ اتنے میں دونوں سپاہی ٹرک سے کودے۔ اکبر علی اوٹ میں تھا۔ اُس نے دونوں کو شین گن کی ایک ہی بوجھاڑ میں لے لیا۔



آگے بھیجتا ہوں.... ذرا سوچیں، کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے؟ آپ صوبیدار ہیں۔ جذبات کو قابو میں رکھیں۔ اُدھر گپتا کرنل تھا اور ملٹری انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر۔ وہ ایک مدت انٹیلی جنس سکول میں چیف انسٹرکٹر رہا تھا۔ اُس وقت تک انڈین آرمی کی انٹیلی جنس سروس گپتا کے ہاتھوں تربیت یافتہ تھی۔ وہ ٹریننگ سکول میں آنے والی ہرنی کلاس کو پہلے لیکچر میں کہا کرتا تھا۔ ”تمام کی تمام انڈین آرمی، آرمی، آرمی، نیوی اور ایئر فورس مل کر بھی دشمن کا اتنا نقصان نہیں کر سکتی جتنا صرف ایک کمانڈو یا ایک جاسوس کر سکتا ہے۔ اگر انٹیلی جنس صحیح ہو تو دشمن اپنی کوئی رگ نہیں چھپا سکتا۔“

وہ ایک واقعہ ہر کلاس کو سنایا کرتا تھا۔ ”برائیں آر۔ اے۔ ایف (برطانوی فضائی بیڑے کے بمبارسل پندرہ دن بیس بیس سارٹی (اڈانیں) بمباری کرتے رہے مگر جاپانیوں کی پہلائی نہ توڑ سکے لیکن میں نے صرف ایک پاؤڈر آنا میٹ سے جاپانیوں کی کمر توڑ دی تھی۔ جانتے ہو میں نے کیا کیا تھا؟.... ایک سیلابی ندی پر لکڑی کا ایک پل تھا جو میں نے ایک کمانڈو سے اُڑوا دیا تھا۔“

وہ واقعات تو برما فرنٹ کے سنایا کرتا تھا لیکن مثالیں پاکستان کی دیا کرتا تھا مثلاً۔ ”دشمن کی ڈیفینس لائن سیالکوٹ سے قصور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ دشمن کی پہلائی لائن کا سسٹم کیا ہے اور رستے کون کون سے ہیں۔ پہلائی کا منیع کیا ہے اور اگر معلوم نہیں تو کون ذرائع سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔“ وہ اپنے سبق کو ہمیشہ پاکستان کے نقشے سے واضح کیا کرتا تھا اور اُس کی چھڑی اکثر وزیر آباد کی نشاندہی کیا کرتی تھی یا گو جالولہ کی۔

”یاد رکھو۔“ اُس نے ٹریننگ سکول میں اکثر کہا تھا۔ ”ہمارے دو دشمن ہیں... چین اور پاکستان.... چین سے ہمارا مقابلہ میدان جنگ میں ہو گا لیکن پاکستان کو ہم فیلڈ سے دُور پیچھے جاسوسوں اور کمانڈوز سے مار لیں گے۔“

رن کچھ کے معرکے کے وقت گپتا کا ہیڈ کوارٹر دہلی میں تھا۔ اُسے توقع تھی کہ پاکستانی ایک روز بھی نہیں ٹک سکیں گے مگر پاکستانی ایسے ٹکے کہ ایک پاکستانی بریگیڈ نے پورے بھارتی ڈویژن کو گھیر لیا اور بھارتیوں نے سفید جھنڈا اکھڑا کر دیا۔ پاک فوج کی قوت کے متعلق اُس نے بڑا ہی غلط اندازہ لگایا تھا۔ شاستری نے اپنی مرضی کا محاذ کھولنے کا اعلان کر دیا، اور کرنل گپتا نے اپنے پُختے ہوئے جاسوس پاکستان میں داخل کر دیے۔ یہ اُن جاسوسوں میں اضافہ تھا جو پہلے ہی اس علاقے میں موجود تھے۔ اُدھر انڈین آرمی رن کچھ میں پاک فوج کے ہاتھ دیکھ کر اس کے مطابق تربیت پانے لگی۔ اُدھر پاکستان سے بھارتی جاسوسوں نے خبریں بھیجی شروع کر دیں۔

۲۲ اگست ۱۹۴۵ء کو کرنل گپتا نے اپنا ہیڈ کوارٹر جالندھر میں آ بیٹا اور انٹیلیجنس کے تجربہ کار افسر اور جوان اس ہیڈ کوارٹر میں جمع کر لیے۔ وہاں اُس نے نہایت حساس اور بہت دُور بینا پہنچا والے وائرلیس سیٹ اور ٹرانسمیٹر نصب کیے۔ اُس نے پاکستان میں اتارنے کے لیے جاسوسوں کی ایک اور جماعت تیار کر رکھی تھی۔ ۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کی رات جب انڈین آرمی پاکستان پر لیٹا کرنے کے لیے سرحدوں پر ڈھیلا تے ہوئی تھی تو گپتا نے جنرل چوہدری کو ان الفاظ میں لکھیں دلا دیا کہ پاک آرمی ہمارے فارو ڈٹروپس کے مقابلے میں جہم گئی تو میں جالندھر میں بیٹھے بیٹھے ان کی پہلائی لائن چند منٹوں

انڈین آرمی کے تین سپاہیوں کو چھوڑ دے اگر اب ساری انڈین آرمی کو مار دیتا تو بھی اُس کے اور اُس کی بیوی کے عزیز رشتہ دار اس دنیا میں لوٹ کے نہیں آ سکتے تھے۔ اُس نے ٹک کے اندر دیکھا۔ تمام کے تمام افراد شہید ہو چکے تھے سوائے اُس کی بیوی اور گاتوں کے ایک آدمی کے۔ وہ دونوں لاشوں کے نیچے دب کر ہندو سپاہیوں کی ٹین گنوں سے بچ گئے تھے۔

اکبر علی پاگل ہو گیا اور پاگل پن میں واپس چل پڑا۔ بیوی نے اُسے روک لیا اور پوچھا کہاں جاسکتا ہے؟ ”کپتان گپتا سے بلے لینے۔“ اُس نے دھیمی مگر قہر آلود آواز میں کہا تھا بلے لینے۔ ”تم دونوں چلو، میں آجاتوں گا۔“

بیوی اُس سے لپٹ گئی اور اُسے پیچھے نہ جانے دیا تھا۔

لاش ایک ہوتی تو اُسے دفنا دیتے، وہاں اٹھارہ لاشیں تھیں۔ اکبر علی نے دل پر پھڑکھا اور اپنی بیوی اور گاتوں کے بچے بڑے آدمی کو ساتھ لیے پاکستان کی طرف پایادہ چل پڑا۔ بڑی لمبی مسافت تھی۔ دل پر ٹم کا بوجھ اور سینے پر انتقام کی آگ۔ ایک میل آگے وسیع اور گہری نہر بہے جا رہی تھی۔ اکبر علی واپس چلا گیا اور لاشوں سے بھرا ہوا رگ مارٹ کوڑے کے نہر کے کنارے لاکھڑا کیا۔ خود سیٹ سے لکڑی اور بیوی اور اُس آدمی کی مدد سے ٹرک کو دھکا لگا کر نہر میں پھینک دیا۔ نہر بہت گہری تھی۔ ٹرک لاشوں سمیت غائب ہو گیا۔

یہ ستمبر ۱۹۴۷ء کا المیہ تھا۔

اب ستمبر ۱۹۴۷ء تھا۔

★

وہ تینوں پاکستان پہنچ گئے تھے اور اکبر علی پاک آرمی میں اپنی یونٹ میں چلا گیا لیکن رن کچھ کے معرکے اپریل ۱۹۴۵ء تک لاشوں سے بھرا ہوا ٹرک اُس کے ذہن میں گھومتا پھرتا رہا۔ اُسے وزیر آباد میں مکان اور شہر سے باہر کچھ زمین بھی مل گئی تھی۔ پاک فوج میں اُسے انڈین آرمی کے ریکارڈ کی وجہ سے ملٹری پولیس میں بھیج دیا گیا پھر وہ ملٹری انٹیلیجنس کا ماہر بن گیا تھا لیکن وہ انفنٹری میں جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ کبھی تو خدا ہندو کو میدان میں لاتے گا مگر وہ ملٹری انٹیلیجنس کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ ”حضور!“ رن کچھ کے معرکے کے وقت اُس نے اپنے بریگیڈیئر سے غیر فوجی انداز سے کہا تھا۔ ”کسی بنالین کے ساتھ ایچ کر کے رن کچھ میں آگے جانے کی اجازت دے دو۔“ اُس کے آنسو نکل آتے تھے اور وہ دانت پیس کر بولا۔ ”حضور! سینے میں اٹھارہ بے گناہوں کا خون جما ہوا ہے۔ ہندو پہلی بار میدان میں آیا ہے حضور! فرنٹ پر جانے دو شاید ہندو پھر سامنے نہ آئے۔“

اُس وقت اکبر علی صوبیدار تھا۔ فوج میں اس انداز سے بات نہیں کی جاتی نہ کوئی بریگیڈیئر کسی صوبیدار سے ایسی غیر فوجی بات کی توقع رکھتا ہے لیکن بریگیڈیئر بھی مسلمان تھا، پاکستانی مسلمان۔ اُس کے اپنے سینے میں جانے کتنے بے گناہوں کا خون جما ہوا تھا۔ ”صوبیدار صاحب!“ بریگیڈیئر نے اکبر علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے کہا تھا۔ ”اگر آپ کی ڈیوٹی کوئی اور کر سکتا ہے تو میں آپ کو



میں تباہ کر کے ان سے ہتھیار ڈالوا لوں گا۔  
اُس کے جاسوس پاکستان میں کتنی اہم جگہوں پر مصروف تھے۔ پانچ ستمبر کی شام اسے جالندھر ہیڈ کوارٹر میں وائرلیس پر پاکستان کے کئی گوشوں سے پیغامات موصول ہو رہے تھے۔ کرنل گپتا کا منصوبہ بے عیب تھا جس کے ناکام ہونے کا شبہ تک نہ کیا جاسکتا تھا۔ بھارت کا ہر ایک جاسوس پاکستان کے اندر سے پیغام دے رہا تھا۔ اُن کی رپورٹیں صحیح تھیں۔ جاسوسوں نے انڈین ایئر فورس کے لیے نہایت اہم تاہم گیمٹ بنادیے تھے۔ پٹھانکوٹ، آدم پور، بٹوالہ، جام نگر اور انبالہ کے جوائی اڈوں کے آپریشن روموں میں پاکستان کے نقشوں پر ان ٹارگیٹوں پر نشان لگا دیے گئے تھے۔

ان رپورٹوں اور اپنے تجربے کی بنا پر کرنل گپتا نے پاکستان کے اندر سابلٹار (تباہی بجانے کی) جو سکیم بنائی تھی، اُسے دیکھتے ہوئے اُس کا یہ دعویٰ غلط نہ تھا کہ وہ جالندھر میں بیٹھے بیٹھے پاک فوج سے ہتھیار ڈالوائے گا لیکن پاکستان کی تباہی کا منصوبہ تیار کرتے وقت کرنل گپتا نے اس بات کا خیال نہ رکھا تھا کہ اُس نے انڈینی جنس، جاسوسی اور سابلٹار کی ٹریننگ اور تجربہ برما کی وادیوں میں جاپانیوں کے خلاف لڑتے حاصل کیا تھا اور اب سامنا پاکستانیوں سے ہے۔ برما جاپانیوں کا نہیں تھا۔ وہ اس خطے سے دست بردار ہو سکتے تھے۔ برما انگریزوں کا بھی نہیں تھا اسی لیے وہ بھی برما جاپانیوں کے حوالے کر کے بھاگ آئے تھے لیکن کرنل گپتا بھول گیا تھا کہ پاکستان پاکستانیوں کا اپنا وطن ہے جس

کے ایک ایک اپنے کے لیے وہ کٹ مریں گے بھاگیں گے نہیں۔

یہی ذرا سی خامی انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل چوہدری کے ایک پلان (حملے کی سکیم) میں رہ گئی تھی۔ اُس کے ڈویژنل کے ڈیپلاٹے سے اُس کی جتنی مہارت کا پتہ چلتا تھا اور چونڈہ کے میدان کو بکتر بند حملے کے لیے منتخب کرنا اُس کی جتنی سوجھ بوجھ کا مکمل ثبوت تھا۔ ٹینکوں کی جنگ کے لیے اس سے بہتر اور کوئی میدان نہیں ہو سکتا تھا۔ حملے کا وقت، انداز اور آرٹلری اور ایئر فورس کا استعمال اُس کی جنگی اہلیت کا پتہ دیتا تھا لیکن اس بے مثال سکیم میں صرف یہ خامی رہ گئی تھی کہ جنرل چوہدری یہ بھول گیا تھا کہ پاکستانی بھی لڑنا جانتے ہیں۔ غالباً اُسے بھی کرنل گپتا کے سابلٹار پلان اور جاسوسی کے جال پر اتنا ہی بھروسہ تھا جتنا خود گپتا کو تھا۔

دونوں کو یقین تھا کہ سامنے سے حملہ آور فوجیں اور عقب میں جاسوسوں اور تباہ کاروں کی تباہ کاری پاک فوج کو بی آرمی میں ڈوب مرنے پر مجبور کر دے گی اور انڈین آرمی کا سپریم ہیڈ ہانا پور سے ایک ہی ہتے میں لاہور سے بھی آگے نکل جائے گا۔ ادھر سیالکوٹ سے آرمڈ فٹرسٹ (بکتر بند حملہ) گوجرانوالہ تک کا علاقہ صاف کر دے گا اور ادھر قصور، بیدیاں، برکی مور کے حملے اور دسے سیالکوٹ اور بانا پور کے فاتح کالوں سے گوجرانوالہ میں جا ملیں گے۔ کرنل گپتا کو یقین تھا کہ ایسے ہی ہو گا۔ اُسے اُن جاسوسوں پر مکمل اعتماد تھا جن کے سپرد اُن ریل گاڑیوں کو تباہ کرنے کا کام تھا جنہیں اینڈیشن لے کے محاذوں تک پہنچنا تھا۔ ان کی تباہی کا مرکز وزیر آباد تھا تاکہ لاہور اور سیالکوٹ کی پہلائی بیک وقت کھٹ جائے۔

یہ جاسوس کہاں تھے؟ — پاکستان کے شہریوں کو اسی قدر معلوم تھا کہ یہاں بھارت کے جاسوس موجود ہیں لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔ پاکستانیوں کی کم فہمی کو وہ تسلیم کرنے سے جھجکتے تھے کہ دشمن کے جاسوس مسجد میں بھی ہو سکتے ہیں اور گرجے میں پادری کے روپ میں بھی، درس گاہوں میں بھی اور پیروں فقیروں کے مزاروں پر مجاوروں کے بہروپ میں بھی۔ وہ رفاہی اداروں میں بھی ہو سکتے ہیں اور پروفیسروں کے بھیس میں کالجوں میں بھی۔ وہ معزز شہری کے لباس میں بھی ستور ہو سکتے ہیں اور ڈاکٹروں کے روپ میں بھی کسی ریلوے سٹیشن پر کانا بد لنے والا بھی جاسوس ہو سکتا ہے اور کسی مشنری سکول کا راہب استاد بھی ٹیلیفون ایکسچینج میں بھی جاسوس ہو سکتے ہیں ڈاک خانوں میں بھی۔ جاسوس قرآن کی تلاوت سے بھی لوگوں کو محو کر سکتے ہیں اور سفید لباس اور زرد کراچی مل متھس سے بھی شہریوں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہیں۔ جاسوس مداری کا تماشہ بھی دکھایا کرتے ہیں اور چھادنیوں میں بیروں، خانساموں اور چوکیداروں کا کامیاب روپ

بھی دھاریتے ہیں۔ وہ گلی گلی خواہنے اٹھاتے کھیل گجک بھی بیچ لیتے ہیں اور انشورنس کے ایجنٹ بھی بن سکتے ہیں۔ دشمن کے جاسوس ننگ دھڑنگ کچیر میں تھڑے ہوتے پاگل بھی بن جاتے ہیں اور فوجی افسر بن کر بھی اپنا کام کر جاتے ہیں۔

پاکستانی شہری ابھی اس بھیانک تجربے سے نا آشنا تھے۔ ان کے عمل کی راہ میں جذبات حائل تھے۔ اگر کسی پادری سے پوچھ گچھ ہوتی تو عیسائی بلبلا اٹھ کر کسی مسجد کے مولوی پر سرکاری انگلی اٹھتی تو مسلمان چلا اٹھے کسی ڈاکٹر پر ہاتھ رکھا تو اُس کے مریض داویلا کرنے لگے کہ یہ تو فرشتہ ہے جاسوس نہیں اور اگر کسی لڑکی کو پولیس نے شک میں پکڑ لیا تو لوگوں نے کالوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ”لوجی، ہو بیٹی کی بھی عزت محفوظ نہیں رہی۔ دیکھو کیسی بھولی بھالی کسی اچھے گھرانے کی لڑکی کو پکڑ لیا ہے۔“

کرنل گپتا نے رن کچھ کی شکست کے بعد جو دس لڑکیاں پاکستان کی سرحد میں داخل کی تھیں وہ بھی بڑی ہی بھولی بھالی اور کسی پڑے ہی اچھے گھرانے کی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ کہیں پرتیویٹ بکریٹری یا ہندوستان سے بھاگی ہوئی لٹی پٹی عورت کے بھیس میں یا کچراریا قاصمہ یا ایڈریس کے روپ میں طلسم ہوش رہا بن کر پاکستان کی جانے کوں کون سی رگ میں سما گئی تھیں۔ ان میں سے ایک نے یہ کمال کر دکھایا تھا کہ ۲۴ اگست ۱۹۴۵ء کو جب بھارتی مارٹر گنوں اور مشین گنوں نے اعوان شریف میں تباہی مچاتی تھی تو اُس نے اُسی رات کرنل گپتا کے ہیڈ کوارٹر کو دارالریس مفصل رپورٹ دے دی تھی کہ پاکستان آرمی کا رد عمل کیا ہے اور کون کون سی یونٹیں کس کس جگہ موبو کر گئی ہیں۔

یہ رپورٹ انڈین آرمی کے لیے بہت قیمتی تھی جس کا تجزیہ کر کے جنرل چوہدری نے گجرات کی طرف سے پاکستان پر حملے کی سکیم پر نظر ثانی شروع کر دی تھی اور چھب کے پچھ بکروں کو اور زیادہ مضبوط کر کے وہاں توپخانے کی ایک اور یونٹ بھیج دی تھی اور پٹانکوٹ کے ہوائی اڈے پر ایک لڑاکا بمبار سکواڈرن کا اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کرنل گپتا نے سرحدی دیہات میں جاسوس بھیج دیتے تھے۔ یہ جاسوس دیہاتیوں یا غریب اور مظلوم کشمیریوں کے روپ میں اپنی اپنی پوسٹ پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں میٹر جاسوس توپخانے کے ’او۔ پی‘ کا کام کر سکتے تھے۔



۵/۴ ستمبر کی درمیانی شب کرنل گپتا کے ہیڈ کوارٹر میں وائس سیٹوں نے ہنگامہ مچا کر رکھا تھا۔ پاکستان میں پھیلے ہوئے بھارتی جاسوس وائس سے اپنے ہیڈ کوارٹر سے ملاپ کر کے اپنی اپنی پوزیشن بتا رہے تھے، رپورٹیں دے رہے تھے اور ہدایات لے رہے تھے۔ کرنل گپتا پسینے سے ٹراپورنگ کی جگہ کی ادھی بوتل خالی کر چکا تھا اور اس قدر مصروف کھینکے ڈویشن ہیڈ کوارٹر سے فون آیا تو اُس نے کہہ دیا۔ ”کہہ دو مصروف ہوں۔“

چھب اور جوڑیاں سے انڈین آرمی کی پسائی کو وہ شرمناک اور ذاتی شکست سمجھ رہا تھا۔ اُسے انڈین آرمی پر رہ رہ کے غصہ آ رہا تھا۔ اُس کے جاسوسوں نے بھارتی توپخانے کو پاک آرمی کی ایک ایک توپ کی صحیح پوزیشن، فاصلہ اور زاویہ بتا دیا تھا مگر بھارتی توپ خانہ ایک بھی پاکستانی پوزیشن کو ہٹ نہ کر سکا۔ یہی حال انڈین آئرفورس کے ہوابازوں کا تھا کہ ستمبر کو پٹانکوٹ سے چھ ہنر طیارے بالکل صحیح تارگیٹ پر بھیجے گئے مگر ان میں سے دو واپس آئے اور باقی چار کو دو پاکستانی شاہبازوں نے چھب میں مار گرایا۔ اس کے بعد انڈین آئرفورس کرنل گپتا کے دیے ہوئے کسی بھی تارگیٹ کو ہٹ نہ کر سکی اور پاک آرمی آؤٹ رینج چھب اور جوڑیاں کو روندتی اکھنور بلکہ کشمیر کے دروازے پر جا پہنچی۔ کرنل گپتا خوش تھا کہ بھارتی تحریکوں نے پاکستان پر کھلا حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور انڈین آرمی پاکستانی حدود پر پہنچ چکی تھی۔ حملہ شروع ہونے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی۔

کرنل گپتا نے انڈین آئرفورس کو پاکستان کے اندر بہت سے تارگیٹ بتا دیے تھے۔ وہ ابھی اپنے جاسوسوں کے پیغامات کے مطابق اپنی بری اور فضائی فوج کے لیے مزید ہدایات تیار کر رہا تھا کہ اُسے مخصوص وائس سیٹ پر ایک اور پیغام ملا۔ ”راجہ کالنگ .... بھری نائن ٹو ....“

گپتا نے تمام پیغامات الگ بھینک کر ایک پیغام اپنے ہاتھ سے لکھا اور وائس آفیسر کو دے کر کہا۔ ”ارجنٹ .... پٹانکوٹ، ہواڑہ۔“

اُس نے پیغام میں انڈین آئرفورس کے پٹانکوٹ اور ہواڑہ کے ہوائی اڈوں کو لکھا تھا کہ ایک ریل گاڑی راولپنڈی کی طرف سے لاہور آرہی ہے۔ نو اور دس بجے کے درمیان گاڑی وزیر آباد سٹیشن کے ادھر یا ادھر ہوگی۔ تباہ کر دو۔ یہ فوجی گاڑی ہے۔

اور یہ پیغام دھونکل ریلوے سٹیشن پر کھڑی گاڑی کے مسافروں کے لیے پیغام اجل بن گیا۔ اس کے بعد کرنل گپتا کی توجہ وزیر آباد کے علاقے پر مرکوز ہوئی اور اُس نے انڈین آئرفورس کو اسی علاقے میں گاڑیوں پر حملوں کی ہدایات دیں۔

جب اُس نے دیکھا کہ چھ ستمبر کی دوپہر تک پاک فوج نے جنرل چوہدری کے حملے کا پلان تباہ کر دیا ہے اور جب دوسرے روز اُس نے دیکھا کہ برکی اور بیدیاں کے دروازے بھی بند ہوئے ہیں اور پاک فوج کے ٹینک قصور کھیم کرن محرم میں سرحدیں پھلانگ کر کھیم کرن پہنچنے والے ہیں تو اُس نے اُسی رات جاسوسی اور ساہوکار کے وہ ماہر پاکستان میں اتار دیئے جنہیں اُس نے اپنے ہاتھوں، ٹریننگ دی تھی۔ اُسے توقع تھی کہ جو کمالپوری کی پوری انڈین آرمی اور انڈین آئرفورس سے نہیں

ہو سکا وہ اُس کے جاسوس کر لیں گے۔ اُس نے انہیں بڑے ہی نازک تارگیٹ بتاتے تھے اور پاکستان کی ایسی دکھتی رگھیں دکھاتی تھیں کہ اگر پاکستانی بیدار نہ ہوتے تو کرنل گپتا کا یہ زمین دوز وار بھی خالی نہ جاتا۔ اُس کے جاسوسوں کو چھپانے اور انہیں مدد دینے کے لیے پاکستان میں پہلے ہی جاسوس موجود تھے۔ پاکستان کرنل گپتا کے جنگل میں آتا دکھائی دیتا تھا۔

کرنل گپتا کے اس وار کو روکنے کے لیے پاکستان میں ایک مشینری کام کر رہی تھی اور اکبر علی ای مشینری کا ایک کل پُرزہ تھا۔ ایلی جنس رپورٹوں سے اکبر علی کو پتہ چل گیا تھا کہ اُس کی ٹکرا اپنے پرانے ساتھی کرنل گپتا سے ہے جو اُس کا ساتھی اور نمبر ہی نہیں بلکہ اُس کا گڑا تھا۔ اکبر علی کو یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ گپتا کا ہیڈ کوارٹر جالندھر میں ہے اور اُسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ یہ ہیڈ کوارٹر جالندھر کے کون سے حصے میں ہے۔ وہ پاک فضائیہ کا صرف ایک بمبار تھا۔ لیکن وہ جو اگر گپتا کے ہیڈ کوارٹر کو تباہ کر دیتا تھا تو مشکل یہ پیش آتی تھی کہ گپتا نے اپنا دفتر شہر کے سمجھان آباد محلے میں بنا رکھا تھا جہاں ہزار پونڈ کا ایک بم یا دو چار راکٹ گرتے تو سینکڑوں بے گناہ شہری عورتیں اور بچے بھی مارے جاتے۔ اکبر علی نے جب بھی گپتا کے ہیڈ کوارٹر پر ہوائی حملے کی سوچی اُسے اپنے خاندان کے وہ بچے اور عورتیں یاد آجاتی تھیں جنہیں گپتا نے دھوکے میں سزا دیا تھا۔ اکبر علی مسلمان تھا۔ وہ منتوں پر وار نہیں کرنا چاہتا تھا۔



بی آر بی بتے رہے گی

۱۱۳

اس لیے اکبر علی اس کوشش میں تھا کہ صرف ایک جاسوس اس کے ہاتھ آجائے۔  
صوبیدار اکبر علی کا رابطہ کمیٹی طارق کے ساتھ بھی تھا جو ہر وقت تھانے میں موجود رہتا تھا۔  
اکبر علی کے ساتھ اس کی ملاقاتیں خفیہ ہوتی تھیں۔

”صوبیدار صاحب! — ایک ملاقات میں کمیٹی طارق نے اکبر علی سے پوچھا تھا —  
”آپ اسی شہر کے رہنے والے ہیں لیٹیننٹ اقبال کے خاندان کے متعلق آپ کچھ بتا  
سکتے ہیں؟“

”آپ کیا جانا چاہتے ہیں سر؟ — اکبر علی نے پوچھا تھا — میں اس گھر کے بچے  
بچے کو جانتا ہوں۔“

”لیٹیننٹ اقبال کی بہن شمع رات کو ریلوے لائن پر ایک لڑکے کے ساتھ پکڑی گئی تھی۔  
— کمیٹی طارق نے اسے پورا واقعہ سن کر کہا تھا — ”کل سے یہ لڑکی کھاریاں سی۔ ایم۔ ایچ میں  
زخمیوں کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے چلی گئی ہے۔۔۔ کیا انہیں مشتبہ فہرست میں رکھنا چاہیے؟“  
”میرا خیال ہے نہیں۔“ اکبر علی نے کہا تھا — ”باپ شریف آدمی ہے۔ اولاد اچھی  
ہے۔ اقبال کسی نیک جذبے سے فوج میں نہیں گیا تھا۔ کج نعت آوارہ تھا۔ بہنیں شوباز میں  
اس لڑکے کو جانتا ہوں جسے آپ نے تھانے بٹھا رکھا ہے۔“ اکبر علی کی منہسی نکل گئی تھی۔  
کہنے لگا — ”اسے میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ معلوم نہیں یہ لڑکی شمع اس کے ساتھ کیوں  
محبت کرنے لگی تھی۔ یہ لڑکا تو خود لڑکی ہے۔ اس لڑکے کے ساتھ خاص قسم کے آدمی دوستی  
لگایا کرتے ہیں۔ اس نے کیا جاسوسی کرنی ہے۔ بہر حال شمع کو نظر میں رکھوں گا۔“  
صوبیدار اکبر علی نے اس لڑکے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ پولیس اور کمیٹی طارق  
کا کیس تھا۔

★

اکبر علی کو تو اب فرصت ہی نہیں تھی کہ کسی اور طرف توجہ دے سکتا۔ اس نے ہجرہ کو روک  
تولیا تھا لیکن وہ ایسے نمونہ میں نہیں تھا کہ ہجرہ کو پہلے کی طرح شادی بیاہ پر اکساتا۔ اسے تو جیسے  
یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ جس لڑکی کو اس نے گلی میں روکا تھا وہ ہجرہ تھی۔ وہ اب ہجرہ کے حسن جمال اور  
شادی بیاہ کی دنیا سے بہت دور نکل گیا تھا۔ اس کی سوت اور فکرا بھارتی جاسوسوں پر اس طرح  
مرکوز ہو گئی تھی جیسے وہ اسی مقصد کے لیے پیدا ہوا تھا۔ وزیر آباد کے گرد و نواح میں انڈین ایر فورس  
کے تین حملے اس کے لیے کرنل گپتا کا چیلنج بن گئے تھے، حالانکہ پاک فضائیہ کے شاہبازوں  
نے اس علاقے میں دشمن کے دو طیاروں کو مار بھی گرایا تھا لیکن اکبر علی کا مسئلہ اس کے سامنے  
روزِ اول کی طرح موجود تھا۔ پچھلی تین راتیں وہ سو با بھی نہیں تھا۔

وہ ہجرہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گلیوں میں ہوائی حملے کے بعد کا ہیجانی ہنگامہ بپا ہو  
گیا۔ اس ہنگامے سے افواہیں بھی ابھرنے لگیں — ”ریلوے سٹیشن پر بم گرے ہیں۔۔۔ چناب  
کے پل پر بم گرے ہیں۔۔۔ کنواے جا رہا تھا اس پر حملہ ہوا ہے۔“  
لوگوں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ بھارتی ہوا بازوں کے گراتے ہوئے چار بموں میں سے

آج صوبیدار اکبر علی وزیر آباد کے علاقے میں ہوائی حملے کے دوران گلیوں میں مارا مارا پھیر  
رہا تھا تو اسے ہجرہ مل گئی۔ اس نے ہجرہ کو بے خیالی سی میں روک لیا پھر تیز قدم آگے چلا گیا۔ اس  
نے وزیر آباد میں گمنام سی جگہ اپنا دفتر یا ٹھکانہ بنالیا تھا جہاں اس نے وائرلیس پیغامات پکڑنے  
کے لیے طاقت ور ادھر حواس سیٹ اس طرح رکھے ہوئے تھے کہ کوئی اسے ملنے آجائے  
وہاں چلا جاتا تو اسے وہاں کچھ بھی نظر نہ آتا نہ کچھ شک ہوتا۔ اس کے ساتھ دو تین آدمیوں کا شاف  
بھی تھا۔

اکبر علی کے وائرلیس سسٹم نے اسے اتنا بتا دیا تھا کہ وزیر آباد کے اندر یا قریب گرد و نواح  
میں دشمن کے جاسوس وائرلیس پر پیغامات دے رہے ہیں۔ یہ پیغامات نمبروں میں تھے یا خفیہ  
اصطلاحوں میں جنہیں وہ ڈیسیٹیفکر نے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ کوڈ کو ڈیسیٹیفکر نے کا کچھ تجربہ آتا  
تھا لیکن وہ اس میں مہارت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے انہیں ڈیسیٹیفکر نے کے لیے اپنے  
ہیڈ کوارٹر بھیج دیا تھا جو وزیر آباد سے دور تھا۔ اسے وہاں سے اتنا بتا دیا گیا تھا کہ وزیر آباد اور  
قریبی گرد و نواح میں دشمن کے جاسوس سرگرم ہیں۔

اکبر علی اس چکر میں گھوم رہا تھا کہ کہیں سے ایک جاسوس ہاتھ آجائے پھر وہ ساری کڑیاں  
ملا لے گا۔ اس کا انداز ڈیوٹی پوری کرنے والا نہیں بلکہ ایسا تھا جیسے یہ اس کا ذاتی معاملہ ہو اور  
بھارت کے ساتھ اس کی ذاتی دشمنی ہو۔ وہ اپنے آپ میں بڑی تکلیف دہ بے چینی محسوس  
کر رہا تھا۔

چھوٹا سا ایک وائرلیس سیٹ اس کی پتلون کی جیب میں تھا جو اسے بتا رہا تھا کہ جاسوسوں  
کا وائرلیس ابھی تک بول رہا ہے۔ ہجرہ کو اس نے روکا تو اسے اپنی جیب سے ٹیسٹ ٹیوب کی دھیمی  
سی آواز سنائی دی تھی جسے ہجرہ نہ سن سکتی تھی۔ اکبر علی دیوانہ سا ہو کے آگے نکل گیا۔ ذرا سی دیر  
میں اس نے اپنی ذہانت سے پتہ چلا لیا کہ جاسوس کون سے علاقے میں ہیں لیکن کسی ایک مقام  
کا تعین ابھی ممکن نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ پولیس کو بلا کر اس علاقے کو گھیرے ہیں لے لے  
اور گھر گھر کی تلاشی لے لیکن وہ جانتا تھا کہ کرنل گپتا کے جاسوس اتنے انارڈی نہیں ہو سکتے کہ  
اتنی آسانی سے پکڑے جائیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے سیٹ اس قدر چھوٹے ہوتے  
ہیں کہ سر ہٹتے رہو کہیں نظر نہیں آتے۔

وہ پولیس سے کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس سے جاسوسوں کو ایک تو یہ پتہ  
چل جاتا کہ صوبیدار اکبر علی وزیر آباد میں کیوں واپس آ گیا ہے اور وہ کیا کر رہا ہے۔ دوسرا خطرہ یہ  
تھا کہ ایک کھلی کارروائی سے جاسوسوں کا پورا گمروہ زمین کے نیچے چلا جاتا۔ پورا رنگ چوٹا ہو جاتا



صرف ایک بم پھٹا ہے اور وہ بھی بستیوں سے بہت دور کھیتوں میں اور پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے ایک بھارتی طیارے کو واپس نہیں جانے دیا۔ وزیر آباد کے لوگوں کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ان کے شہر کے قلبے اجنبی سی آوازیں اٹھ کر فضا میں گم ہو رہی ہیں جنہیں داکہ سے اس طائر ابھی کوئی نہیں سمجھ سکا۔ یہ پراسرار آوازیں جالندھر اور وزیر آباد کو اس قدر قریب لے آئی تھیں جیسے ایک ہی جھاڑی میں گھات لگاے دو آدمی کھنسر پکڑ رہے ہوں۔ وزیر آباد کی یہ آوازیں جالندھر کو تباہی تھیں کہ تارگیٹ ہٹ نہیں ہوا۔ صرف اکبر علی تھا جو ان آوازوں کو سن رہا تھا اور پاگل ہوا جا رہا تھا۔

★

ہاجرہ کی طرف پہلی سی توجہ دیتے بغیر وہ چلا گیا تو وہ سمجھی کہ اکبر علی جنگ سے خوفزدہ ہے ورنہ فوج والے اسے واپس نہ بھیج دیتے۔ وہ ہاجرہ کے لیے بالکل ہی حقیر انسان بن گیا اور اس کا سینہ فخر سے پھیل گیا کہ وہ جنگ سے خوفزدہ نہیں اور اس لحاظ سے وہ اکبر علی کے مقابلے میں سچی پاکستانی ہے۔

جنگ سے پہلے تو ہاجرہ نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ وہ پاکستانی ہے اور پاکستانی کس قدر قیمت کیا ہے۔ اس کا وطن اور اس کی ساری دنیا راولپنڈی ہو لی فیملی ہسپتال کے قریب ایک جھگی تھی جسے موت نے برسوں گزرے اجاڑ دیا تھا اور جس پر اب ڈور پھر گئے تھے اور اس پر اسبیل سٹاٹ ٹاؤن کا ایک پختہ مکان بن گیا تھا۔ پاکستان پر بم گریں اس کی بلا سے، اس کا تو پاکستانی مردوں نے گلیوں میں پھرنا دیکھ کر دیا تھا لیکن راہوالی اور دھونکل پر دشمن کا ایک ہی ہوائی حملہ

ان ہی گلیوں میں جو انقلاب لے آیا تھا اس کی برقی لہریں ہاجرہ کی رگ رگ میں کیا اس کی روح میں اتر گئی تھیں۔ اسے ان ہی گلیوں سے پیار سا ہو گیا تھا اور جو آوارہ لونڈ سے اور جو سال آدمی اسے بھونکی نظروں سے گھورتے رہتے اور جو اسے دیکھ کر فلمی گیت الاپنے لگتے تھے، اب اسے یوں دکھائی دینے لگے جیسے یہی پاکستان کی دولت میں۔ اگر یہ دولت دشمن کی نذر ہو گئی تو ہاجرہ زندہ نہ رہ سکے گی۔ صبح سے رات دس بجے تک وہ ریڈیو سے کئی بار خبریں اور جنگی ترانے سنا کرتی تھی۔ ان ترانوں نے آپ ہی آپ اس کی کوششوں کے بغیر ہی اس کی ذات میں ایسی قوت بیدار کر دی تھی جس نے اسے اپنے تابع کر لیا تھا۔

ایک روز باورچی خانے میں برتن دھوتے بے خبری میں ایک ترانہ گنگنانے لگی:

دھن بھاگ نہیں اُنہاں ماواں لے جھال ماواں لے لے جاتے ہیں

دھن بھاگ نہیں بھین بھراواں لے جھال گودی دیر کھڈا لے نہیں

ہاجرہ کی آواز رقت میں دب گئی اور اس کی آنکھیں پریم ہو گئی تھیں۔ وہ کسی کی ماں نہیں تھی، وہ کسی کی بہن نہیں تھی، اس کا کوئی ماں جایا نہیں تھا۔ اس نے کسی دیر کو گودی نہیں کھلایا تھا اسے ماں جنم دے کر اس دنیا میں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ برتن دھوتے اس کے ہاتھ رگ گئے اور وہ خلّوں میں کھو گئی تھی۔

اپنے ماں جانے کس طرح کے ہوتے ہیں؟  
دیر کیسے ہوتے ہیں؟

اسے کچھ علم نہ تھا لیکن معاوہ بڑی شدت سے محسوس کرنے لگی کہ وزیر آباد شہر سے پاک فوج کے جو جوان ٹرکوں میں یا علی کے نعرے لگاتے لاہور اور سیالکوٹ کی طرف گزر جاتے ہیں وہ اس کے ماں جانے اور سکے دیر ہیں۔ اس کے جی میں آتی کہ برتن پھینک کر ٹرک پر جا کھڑی ہو اور جب کوئی فوجی ٹرک گزرے تو وہ دوپٹہ پھیل کر اپنے دیروں کو دعائیں دے۔

اجنبی سا ایک تانتر اس کی رگ رگ میں سماتا چلا گیا تھا اور یہ احساس اور زیادہ بکھر آیا کہ وہ تنہا نہیں نہ دھنکاری ہوئی ہے بلکہ یہ جو جنگ چھڑ گئی ہے اس کے ساتھ اس کا بھی براہ راست تعلق ہے۔ بعض اوقات وہ تذبذب اور اضطراب میں کھو جاتی تھی تو افضال کے ماں جانے جتنی تھی افضال اس کے ذہن کے سارے معمے حل کر دیا کرتا تھا۔

★

آج بھی، ہوائی حملے کے بعد جب ضوبیدار اکبر علی اسے محل سی ایک بات کہہ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ افضال کے کمرے کے سامنے جا کر۔ اس کا دل نیند سے بڑبڑا کر جاگ اٹھنے کی وجہ سے پہلے ہی گھبرا ہوا تھا۔ اکبر علی کو دیکھ کر اس کا دل اور زیادہ گھبرانے لگا۔ افضال کا دروازہ بند تھا۔ ہاجرہ نے آہستہ سے دستک دی تو دروازہ کھلتے ذرا دیر لگی۔ افضال نماز پڑھ رہا تھا اور دروازہ ایک اجنبی صورت نے کھولا تھا۔ ہاجرہ ٹھٹھکی لیکن اندر چلی گئی اور چار پائی پر جا بیٹھی۔

خدا کے حضور جھکا ہوا افضال ہاجرہ کو فرشتوں کی طرح آسمان کے پانیوں سے دھلا ہوا نظر آیا۔ وہ تو خدا کے حضور سجدہ ریز تھا مگر ہاجرہ اس کے قدموں میں سر رکھ دینے کو بیتاب ہونے لگی۔ افضال نے سلام پھیرا، دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اجنبی سا آدمی جس نے دروازہ کھولا تھا باہر نکل گیا۔

”یہ میرا دوست ہے“ افضال نے ہاجرہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بڑا اچھا آدمی ہے“ ہاجرہ کو اس کے دوست کی یہی ایک بات بڑی اچھی لگی کہ وہ باہر نکل گیا تھا۔ افضال نے ہاجرہ کا ہاتھ وارفتگی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”افضال جی!“ ہاجرہ بجاتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”جی چاہتا ہے میں بھی نماز پڑھا کر دوں، پڑاتی نہیں۔“

”اوہ!“ افضال یوں چونکا جیسے دل میں خنجر اتر گیا ہو۔ ”تمہیں نماز نہیں آتی؟“ پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لیے میں بولا۔ ”آہی کیسے سکتی ہے جن کے تم برتن اور کپڑے دھوتی ہو انہیں تمہاری عاقبت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے!... ان کی نظر میں تو تم انسان بھی نہیں ہو... میں تمہیں نماز یاد کرا دوں گا۔“ اور اس نے بات کا رخ پھیر دیا۔

بات کا رخ ایسا پھر اکہ افضال کی انگلیاں ہاجرہ کے ریشمی بالوں میں پھرنے لگیں اور ہاجرہ



”آپ بیٹھیں گے نہیں؟“ — افضل نے پوچھا۔  
 ”شکر یہ عزیز بھائی! — اکبر علی نے کہا — ”خدا حافظ“ — اور وہ باہر نکل گیا۔

★

”یہ مرد دوسرے پیچھے آیا تھا“ — ہاجرہ نے پرفرت لہجے میں کہا — ”پکا بدعاش ہے کمبخت لڑائی پر چلا گیا تھا لیکن بھاگ آیا ہے۔ نامراد کو کافر کی گولی نے بھی منہ نہیں لگایا۔ مجھے کتنا رہتا ہے کہ مجھ سے بیاہ کر لو۔ دن بھر چوٹ کھیتا رہتا ہے“ — اور اُس نے افضل کو تفصیلاً سنا دیا کہ اکبر علی اُسے کس طرح راہ میں روک روک کر پریشان کرتا رہتا ہے اور اب سائے کی طرح اُس کے پیچھے بڑھ گیا ہے۔ کہنے لگی — ”میں ادھر آ رہی تھی تو اس نے مجھے راستے میں روک لیا۔ میں تمہارے پاس آ گئی تو یہ میرے پیچھے آ گیا“

”یہ شخص اگر اب تمہاری راہ روکے تو مجھے بتانا“ — افضل نے کہا۔ اُس کا چہرہ غصے سے لال سرخ ہو گیا۔ عتاب آلود آواز میں بولا — ”میں اسے قتل کر دوں تو یہ گناہ نہیں ہوگا۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مسلمان عورت کی آبرو کی خاطر خون بہانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میں تمہاری آبرو کا رکھوالا ہوں ہاجرہ! سینہ تان کر گلیوں میں پھرو“

ہاجرہ پر رقت طاری ہو گئی۔ اُسے کب کوئی آبرو کا رکھوالا ملا تھا۔ آج افضل نے اُسے پناہ میں لے لیا تو اُسے ماں یاد آ گئی جس نے اسے بے رحم سردی سے بچایا تھا۔ افضل کے سر پر اُسے خدا نظر آنے لگا۔ اُس نے بیک کر افضل کا ہاتھ تھاما اور دیوانہ وار ہاتھ کو چومنے لگی اور اُسے یوں عقیدت بھری نظروں سے دیکھنے لگی جیسے وہ اکیلا سارے پاکستان کی آبرو کا رکھوالا ہو۔

”تم اب گھر جاؤ“ — افضل نے اُسے کہا — ”بہت دیر ہو گئی ہے“  
 ہاجرہ اٹھی اور اس طرح چل پڑی جیسے قدم اٹھ نہ رہے ہوں۔ وہ اس کمرے سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ دروازے میں جا کر رک گئی اور پیچھے مڑی۔

”افضل جی! — اُس نے کہا — ”یہ بدبخت میرے گھر والوں کو بتا دے گا اور وہ لوگ مجھے بُری بُری باتیں کہیں گے۔ انہیں زیادہ غصہ آیا تو گھر سے نکال دیں گے“  
 ”گھر سے نکالا تو میرے پاس آ جانا“ — افضل نے کہا — ”اور اس اکبر علی کو تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا“

ہاجرہ کا سراونچا ہو گیا اور وہ نڈر ہو کر کمرے سے نکل گئی۔

★

اُس وقت جب ہاجرہ افضل کے کمرے سے نکلی تھی۔ بیدیاں سیکڑ میں سکوت سا طاری ہو گیا تھا۔ محاذوں پر اس قسم کا سکوت بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ بیدیاں کا محاذ اتنا سرگرم نہیں رہا تھا جتنے دوسرے محاذ تھے۔ بیدیاں، لاہور اور قصور کے سیکڑوں کا جنگیں پوٹنٹ بنا ہوا تھا۔ دشمن کی توجہ ایک تو لاہور پر مرکوز تھی جہاں وہ ریزرو کا ڈویژن بھی جھونک کر بی آ رہی پار کرنے کی سہ توڑ کوشش کر رہا تھا۔  
 اس سے زیادہ توجہ دشمن نے قصور کھیمہ کرن سیکڑ پر مرکوز کر رکھی تھی کیونکہ پاک فوج دشمن

کا سرا فضل کے کندھے پر جا پڑا۔ دونوں صوم و صلوة کی دنیا سے دور نکل گئے۔ افضل کی انگلیوں کے لمس اور اُس کے جسم کی بوباس سے محو ہو کر ہاجرہ ایسی دنیا میں جا پہنچی جہاں وہ غریب اور بے آسرا نوکرانی نہیں افضل کی مقدس دنیا کی ملکہ تھی۔  
 ”افضل جی! — ہاجرہ نے کہا — ”وہ لوگ مجھے کیوں اچھے نہیں لگتے جو مجھے بھوکے نظروں سے دیکھتے ہیں؟“

”اس لیے کہ اُن کی نظریں بھوکے ہیں“ — افضل نے کہا — ”اُن کی نظریں پاک نہیں.... میری آنکھوں میں دیکھو.... ان آنکھوں میں وہ بھوک نہیں“  
 ”تمہاری آنکھیں پاک ہیں افضل جی!“

دروازے پر دستک ہوئی پھر خود ہی دروازہ کھل گیا اور طلسم ٹوٹ گیا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا۔ دروازے میں صوبیدار اکبر علی کھڑا تھا۔ ہاجرہ کا دل بے طرح دھڑکنے لگا جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا دل نفرت اور خارت سے اٹ گیا۔ اُس نے اکبر علی سے ہمیشہ نفرت کی تھی لیکن اُس روز وہ اُس کی نگاہ میں بدی اور کفر کا جتنا جاگتا مجسمہ بن گیا۔ ہاجرہ نے اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ اُس نے اُسے بڑے ہی حسین خواب سے جگا دیا تھا۔ ہاجرہ کو یہ ڈر بھی لگا کہ اکبر علی اُس کے گھر والوں کو بتا دے گا کہ اُس نے ہاجرہ کو بڑی گندی حالت میں ایک آدمی کے ساتھ دیکھا ہے۔

”آپ رہتے ہیں یہاں؟“ — اکبر علی نے افضل سے پوچھا — ”معافی چاہتا ہوں بغیر اجازت اندر آ گیا ہوں.... آپ کیا کام کرتے ہیں؟“  
 ”میں طالب علم ہوں“ — افضل نے شائستگی سے کہا — ”مذہب کا طالب علم....“  
 آپ بغیر اجازت اندر چلے آئے ہیں تو کوئی گناہ نہیں کیا۔ آپ میرے والد ہیں۔ بیٹھئے نا! آپ تو کھڑے ہیں۔ میں یہاں جامع مسجد میں....“

وہ کہنے جا رہا تھا اور اکبر علی کی نظریں کمرے میں گھوم رہی تھیں۔ انجیلٹھی اور میز پر کتابیں اور کاپیاں رکھی تھیں۔ فرش پر جائے نماز اور اس پر سیج پڑی تھی اور بغیر کواڑوں کی ایک الماری میں دو قرآن رکھے تھے۔

ہاجرہ اکبر علی کو یوں گھور رہی تھی جیسے اُسے کچا چاٹا لالہ چاہتی ہو۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔  
 ”ہاجرہ! — اکبر علی نے مسکرا کے پوچھا — ”تم یہاں کیسے؟“

”یہ میرے پاس آیا کرتی ہے“ — افضل بول پڑا — ”نیک لڑکی ہے۔ میں اسے قرآن کا سبق دیا کروں گا۔ ابھی ابھی کہہ رہی تھی کہ نماز نہیں آتی۔ میں اسے نماز....“  
 ”ضروری ضرور“ — اکبر علی نے ہاجرہ کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا — ”اس سے بڑھ کر اور نیکی کیا ہوگی!“ — اُس نے ایک بار پھر گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور آہ سی لے کے بولا — ”مجھے اندر آنے کا کوئی حق نہ تھا۔ آپ کے متعلق یہی کچھ سنا تھا جو آپ نے بتایا ہے۔ بس آپ کو دیکھنے کا شوق تھا۔ خدا ہم سب کو خدا اور رسول کا علم حاصل کرنے کی توفیق دے“



پر کی اتنی شاید چندہ میں بھی نہ کی ہوگی جہاں ٹینکوں کی بہت بڑی جنگ لڑی گئی تھی۔ صرف ایک رات کے چار گھنٹوں میں دشمن کے توپ خانے نے پاکستانی مورچوں پر چھوٹی بڑی توپوں کے پینتالیس ہزار گولے فائر کیے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جنگ کے باقی دنوں میں دشمن نے کتنے لاکھ گولے فائر کیے ہوں گے لیکن پاکستانی ٹرولیس جہاں پہنچ گئے تھے وہاں سے ایک انچ بھی پیچھے نہ بیٹے۔

وہ تو ایک قیامت تھی یا وہ آتش مرود تھی جس میں عاشقانِ رسول کو دگتے تھے۔



لاہور اور کھیم کرن سیکٹر کے درمیان بیدیاں تھیں۔ بیشک وہاں کوئی قابل ذکر سرگرمی نہیں تھی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ پاکستانی ٹرولیس جو وہاں مورچہ بند تھے وہ چاق و چوبند نہ رہتے۔ ان کے دائیں بائیں خاصا علاقہ خالی تھا یعنی وہاں پاکستان کا کوئی دفاعی مورچہ نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نفزی بہت کم تھی۔ ان خالی جگہوں کو زیر کرنے کے لیے رات کو دس دس بارہ بارہ اور اس سے بھی زیادہ نفزی کی لڑاکا گشتی پارٹیاں بھیجی جاتی تھیں تاکہ دشمن ہائی پاس نہ کر سکے۔ یہ ذمہ داری لیفٹیننٹ اقبال کی بٹالین، ایسٹ بنگال رجمنٹ کی تھی کہ وہ سامنے کے علاوہ دائیں بائیں کا بھی خیال رکھے۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے جنگ کے دوران بریگیڈ ہیڈ کوارٹر یا ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے کوئی حکم نہیں آیا کرتا۔ یہ اس بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ اپنے علاقے کا دفاع کس طرح کرتا ہے۔

اس روز بیدیاں کے محاذ پر اچانک سکوت چھا گیا۔ اس سے پہلے وہاں بڑی مشین گنوں اور توپ خانوں کے فائر کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا جو دونوں طرف سے یہ اعلان ہوتا تھا کہ ہم موجود ہیں اور لڑنے کے لیے تیار۔ دن کے تیسرے پہر لیفٹیننٹ اقبال کے بٹالین کمانڈر نے تمام افسروں کی کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس میں پلاٹون کمانڈروں تک کو بلا لیا گیا۔ اس طرح لیفٹیننٹ اقبال بھی کانفرنس میں گیا۔

”آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ محاذ خاموش ہو گیا ہے۔“ کمانڈنگ آفیسر نے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سے آپ لوگ یہ تو نہیں سمجھ رہے ہوں گے کہ دشمن ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ اس خاموشی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دشمن بہت بڑے حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں نے دیہاتیوں کے ذریعے جو معلومات حاصل کی ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دشمن بہت بڑا حملہ کرے گا۔ دشمن کے لیے کھیم کرن کی صورت حال بڑی شرمناک ہو گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہاں دشمن ہمارے ٹرولیس کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ وہ یہ چال ضرور چلے گا کہ بیدیاں پر زور دار حملہ کر کے نہر پار کرے گا۔۔۔

”اس وقت تک آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ دشمن کے ہر حملے کا انداز ایک جیسا ہوتا ہے۔ ہمارا دشمن بڑی تیز اور شدید گولہ باری کا اور اس گولہ باری کے سائے میں ہجوم کی صورت میں حملہ کرنے کا قائل ہے۔ اس وقت تمام محاذوں کی صورت حال یہ ہے کہ دشمن کی اتنی طاقت و

کے علاقے میں خاصی آگے نکل گئی تھی اور کھیم کرن جیسا اہم قصبہ پاکستانی ٹرولیس کے قبضے میں تھا۔ دشمن ہمارے ٹرولیس کو پیچھے دھکیلنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ وہاں بھی دشمن نے اپنے ریزرو ڈویژن جھونک دیتے تھے جن میں نمبر دو انڈی پیڈنٹ (بکتر بند) بریگیڈ گروپ بھی تھا۔ کھیم کرن کی ایک اہمیت تو جنگی تھی۔ وہاں سے ایک سڑک امرتسر کو جاتی تھی۔ دشمن کو کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ پاک فوج اس سڑک پر امرتسر کی طرف پیش قدمی کرے گی۔ اس سے انڈین آرمی کے وہ ڈویژن جو لاہور سیکٹر میں لڑ رہے تھے گھیرے میں آجاتے تھے۔ دوسری اہمیت جذباتی تھی۔ بھارت کے عوام کو پتہ چل گیا تھا کہ پاکستانیوں نے کھیم کرن پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ آگے بڑھے آ رہے ہیں۔ اس سے اتنی دہشت پھیلی کہ فیروز پور شہر تو خالی ہو ہی چکا تھا، جالندھر بھی خالی ہو گیا۔ وہاں سے ہندوؤں اور سکھوں نے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

نہتے شہریوں کو تو بھاگنا ہی تھا، خود فوج بھاگ رہی تھی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جو انڈین آرمی کی ہائی کمانڈ کے ریکارڈ پر ہے کہ انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل چوہدری نے کھیم کرن کے محاذ پر لڑنے والی اپنی فورس کو حکم دے دیا تھا کہ پیچھے ہٹ آئیں اور دریائے بیاس کے بھارت والے کنارے پر دفاعی مورچے قائم کریں۔ پاکستانی توپ خانے کے گولے فیروز پور شہر میں گمر رہے تھے۔ ان حالات میں جنرل چوہدری نے غالباً اپنا یہ حکم واپس لے لیا تھا کہ اس کے اس محاذ والے ڈویژن اور بریگیڈ وغیرہ پیچھے ہٹ آئیں۔ وجہ یہ تھی کہ دلی کا سیکریٹریٹ یعنی مرکزی حکومت کے دفاتر الہ آباد کو منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اپنی قوم کے مورال کو سنبھال دینے کے لیے دشمن نے اس سیکٹر میں مزید ٹھک بھیج دی۔ وہاں جو ٹینک رجمنٹیں اور دیگر ٹرولیس دشمن نے لڑائے ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

نمبر ایک تالیس توٹین بریگیڈ۔ نمبر دو انڈی پیڈنٹ آرمڈ بریگیڈ گروپ۔ نمبر چار انڈین موٹیلین ڈویژن۔ نمبر دو رائل لانسرز (ٹینک رجمنٹ)۔ نمبر تین کیولری (ٹینک رجمنٹ)۔ نمبر چودہ سندھ ہارس (ٹینک رجمنٹ)۔ رائل دکن ہارس (ٹینک رجمنٹ)۔ نمبر آٹھ کیولری (ٹینک رجمنٹ)۔ نمبر باسٹھ کیولری (ٹینک رجمنٹ) جسے جموں سے بلا لیا گیا تھا، نمبر ایک سو چار انفنٹری بریگیڈ۔ نمبر سات گورکھا رجمنٹ۔ نمبر نو گورکھا رجمنٹ۔ نمبر تیرہ جاٹ رجمنٹ۔ نمبر تیرہ سکھ رجمنٹ۔ نمبر چار سکھ رجمنٹ۔ اس اتنے بڑے لشکر کی مدد کے لیے کور آرٹلری کے علاوہ نمبر چھیا سٹھ اور نمبر ستر سٹھ میڈیم ہیوی آرٹلری اور ان کے پیچھے نمبر ایک ہیوی آرٹلری بریگیڈ تھا۔

نمبر چار سکھ رجمنٹ جس کا کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل انت سنگھ تھا، جنگ کے تیسرے روز ہی پوری کی پوری اس طرح ختم ہو گئی تھی کہ پاکستان کی ایک بٹالین کے گھیرے میں آگئی۔

سکھوں کی اس رجمنٹ کی آدھی نفزی ماری گئی اور باقی نصف کو بچانے کے لیے کرنل انت سنگھ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح نمبر چار سکھ رجمنٹ کی آدھی نفزی اپنے کمانڈنگ آفیسر سمیت جنگی قیدی بن گئی اور جنگ کا باقی عرصہ قیدی کیمپ میں عیش موج کرتی رہی۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دشمن کے توپخانے نے جتنی گولہ باری اس محاذ پر پاکستانی ٹرولیس



پٹرولوں کی نفری زیادہ کریں گے اور اب پٹرولیں ذرا اور آگے جایا کریں گی۔ اپنے جوانوں کو اچھی طرح سمجھا دیں، خاص طور پر عیدیداردوں کو سمجھائیں کہ اب پٹرولیں اتنی آگے جایا کریں گی کہ دشمن کی پوزیشنوں کو دیکھ سکیں اور ضرورت سمجھیں تو دشمن کو تباہ کرنے کی کوشش کریں، لیکن اپنے آپ کو بچا کر۔ یہ تو عیدیداردوں کو معلوم ہی ہے کہ رات کو دشمن کی کوئی نقل و حرکت دیکھیں تو اس کی پوری رپورٹ دیں۔

کمانڈنگ آفیسر نے اس ضمن میں تمام ہدایات دے کر آخر میں پوچھا۔ ”کوئی شک؟ کوئی سوال؟“

”یس سر!“ لیفٹیننٹ اقبال نے کہا۔ ”گستاخی کی معافی چاہتا ہوں سر! آپ نے کوئی نئی بات نہیں کی۔ فائننگ پٹرولیں تو پہلے کی طرح جا رہی ہیں۔ میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ سب سے جوئیر میں ہی ہوں۔ اگر غلطی...“

”کہو، کواقبال!“ کمانڈنگ آفیسر نے کہا۔ ”جوئیر ہو تو کیا ہوا؟ سیکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ کوئی شک، کوئی سوال، کوئی مشورہ، کوئی تجویز ذہن میں آئے تو اسے زبان پر لے آؤ۔ غلط ہونے کی صورت میں تمہاری تصحیح ہو جائے گی۔“

”سر!“ اقبال نے کہا۔ ”میں دشمن کی پوزیشنوں کے عقب میں کمانڈو آپریشن کا مشورہ دیتا ہوں۔“

تمام افسروں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ دشمن کے عقب میں کمانڈو کارروائی انتہائی دلیرانہ اور بڑی ہی خطرناک کارروائی ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ یہ تجویز لیفٹیننٹ اقبال نے پیش کی تھی۔ اُسے سب جانتے تھے کہ وہ افسر کم اور کالج سٹوڈنٹ زیادہ ہے۔ اُس کے ساتھی افسر اور سینئر افسر اُسے صرف اس لیے پسند کرتے تھے کہ وہ زندہ دل اور سنسنے ہنسائے والا لیفٹیننٹ تھا لیکن اُس کا کمپنی کمانڈر، ایجوٹنٹ اور کوارٹر ماسٹر اکثر کہا کرتے تھے کہ کبھی لڑائی ہوگئی تو اقبال کو قریب سے گزر جانے سے ہی جام شہادت نوش کر جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے ساتھی افسر اُس کا مشورہ سن کر زیر لب مسکراتے تھے۔

انہیں ابھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ جنگ کی ابتدا میں لیفٹیننٹ اقبال ویسا ہی ثابت ہوا تھا جیسا وہ سمجھتے تھے اور وہ اپنی پلاٹون کے نائب صوبیدار بدراحتی کی نظروں میں ایک مذاق بن چکا تھا لیکن اب اقبال وہ اقبال نہیں رہا تھا۔ اب جو وہ کمانڈو آپریشن کا مشورہ دے رہا تھا وہ دل کی گہرائیوں سے دے رہا تھا اور اس میں جذبے کی حرارت تھی۔

اُس کے ساتھیوں کو پتہ چل ہی نہیں سکتا تھا۔ اُن کی پوزیشنیں ایک دوسرے سے دور دور تھیں جو گولاباری کے گرد و غبار میں چھپی رہتی تھیں۔ پہلے دنوں میں تو دشمن کے نابالغ حملوں نے کسی کو اپنی ہوش بھی نہیں رہنے دی تھی۔ وہ اب سوچ رہے تھے کہ اقبال کی پلاٹون اگر جگمگاتی تھی تو یہ اُس کے صوبیدار، نائب صوبیدار اور سیکشن کمانڈروں کی بدولت ہے، اقبال تو ڈرا ہوا افسر بنا رہا ہوگا۔

بلغار کو نہ صرف روک لیا گیا ہے بلکہ کئی علاقوں میں دشمن کو پیچھے دھکیل کر اُسے اتنا زیادہ نقصان پہنچایا گیا ہے کہ اُس کے لیے ری گروپنگ تک دشوار ہوگئی ہے۔ چونکہ میں اُس کی بکتر بند بلغار کا دم خم توڑ دیا گیا ہے۔ زیادہ خطرہ وہیں تھا کیونکہ پاک آرمی میں ٹینکوں کی بہت زیادہ کمی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہاں تک خطرہ مول لیا گیا ہے کہ کھیم کرن جیسے نازک محاذ سے ایک ٹینک رجمنٹ اور ایک بکتر بند ٹالین کو چونڈہ بھیج دیا گیا ہے۔ لاہور کے محاذ سے ایک ٹینک رجمنٹ کے دو سکواڈرن نکال کر چونڈہ بھیجے گئے ہیں۔

کمانڈنگ آفیسر اچانک خاموش ہو گیا۔ اُس کی نگاہیں تمام افسروں پر گھوم گئیں۔ سب پر خاموشی طاری تھی۔ کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ آؤٹ پوسٹ کی مشین گنوں کی تھقی جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک دو برسٹ فائر کرتی تھیں۔ دوسری آوازیں لاہور اور کھیم کرن کے محاذوں کے توپ خانوں اور ٹینکوں کی توپوں کی تھیں۔ یہ آوازیں ایسی تھیں جیسے بچے بینڈ کے بڑے ڈرموں کو پیٹ رہے ہوں۔ بنگال ٹائیگرز کے افسروں کی یہ کانفرنس زمین کے نیچے ہو رہی تھی اور پر سے کوئی جوان اور اکا دکا ٹرک گزر جاتا تھا۔

”میرے دوستو!“ کمانڈنگ آفیسر نے غیر فوجی لہجے میں کہا۔ ”ہم سیاستدان نہیں، ہم سیاستدانوں کا آلہ کار ہیں۔ فوج برسرِ اقتدار سیاسی لیڈروں کی تلوار ہوتی ہے۔ وہ جب چاہیں اس تلوار کو نیام سے نکال لیں جب چاہیں نیام میں ڈال لیں۔ ہم تلوار بھی ہیں اور ملک کی ڈھال بھی ہیں حکم ماننا ہے۔ ہم سوال نہیں کر سکتے لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اپنے سر پر کھڑے دشمن کے عزائم اور اُس کی تیاریوں کو دیکھ کر بھی ہماری حکومت نے اپنی فوج کو بہتر طریقے سے مسلح کرنے کی اور دشمن کی نفری کے مطابق اپنی نفری بڑھانے کی کبھی بھی نہ سوچی۔ دشمن نے جس نفری اور جس پادرو سے حملہ کیا ہے، اگر ہمارے پاس اس کا نصف بھی ہوتا تو ہم، زیادہ تر ممبر کے روز دشمن کے علاقے میں ہوتے اور دشمن کو اپنا ملک بچانے کے لیے جان کے لالے پڑے ہوتے۔ ہم دشمن کو کم از کم پچاس برسوں تک پاکستان کی طرف دیکھنے کے بھی قابل نہ رہنے دیتے۔“

کمانڈنگ آفیسر بھر خاموش ہو گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسم آگیا۔ اس تبسم میں شگفتگی کم اور تھکن اور شب بیداری کا تاثر زیادہ تھا۔

”بہر حال!“ اُس نے آہ بھر کر کہا۔ ”ہمیں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ نفری اور سامان کی کمی کو جنبہ سے پورا کرنا ہے۔ آپ سب نے اور جوانوں نے معجزے کر دکھائے ہیں۔ انہیں اللہ اجر دے گا۔ تمغہ جرات، ستارہ جرات، ہلال جرات دنیاوی انعام ہیں... مجھے کمنا یہ ہے کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ جنگ کا عروج اب شروع ہوا ہے۔ دشمن باؤلا ہو رہا ہے۔ اب ہمیں اور زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔“

”ہماری فائننگ پٹرولیں تو چل ہی رہی ہیں لیکن ہمیں دشمن کے آنے والے حملوں کو آنے سے پہلے ہی درہم برہم کرنا ہے... کیا آپ سمجھتے ہیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟... ہاں... فائننگ



وہ جس کمانڈو ایجنٹ کا مشورہ دے رہا تھا، وہ کوئی نیا مشورہ نہیں تھا اور یہ کوئی عجیب مشورہ بھی نہیں تھا۔ دوسرے محاذوں پر دشمن کی پوزیشنوں کے عقب میں کمانڈو کارروائیاں کی جارہی تھیں۔ ٹینک ہینٹنگ (شکار) پارٹیاں بھی جاتی تھیں۔ جب دشمن کی نفری زیادہ ہو اور اس کے حملوں میں شدت آگئی ہو تو رات کو آٹھ دس یا اس سے کم یا زیادہ جوانوں کی پارٹی دشمن کے اگلے مورچوں کے پیچھے چلی جاتی ہے اور تباہی پھیلا کر جاتی ہے لیکن پوری پارٹی کبھی واپس نہیں آتی۔ آٹھ دس میں سے چار پانچ جوانوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

ٹینک شکار پارٹیاں تو اس سے بھی زیادہ شجاعت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ٹینک دن کو آگے لڑتے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد یہ لڑنے کے قابل نہیں رہتے۔ اندھے ہو جاتے ہیں۔ انہیں اگلے مورچوں سے دور پیچھے لے جاتے ہیں۔ رات کو ان تک پہنچنا ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ کسے دھانے میں کود گیا ہو۔ ٹینک شکار پارٹیاں ان تک پہنچتی اور انہیں راکٹ لائیوہول سے تباہ کرتی ہیں مگر ان پارٹیوں کو جانوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

★

”ہاں اقبال! کمانڈنگ آفیسر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ ایسی جنگ ہے جو پاک آرمی کمانڈو پارٹیوں اور ٹینک ہینٹنگ پارٹیوں اور فائٹنگ پٹرولوں کے سہارے لڑ رہی ہے۔ دشمن کو دبا تے رکھنے کے لیے پاک آرمی اپنے جوانوں کو ان کارروائیوں میں قربان کر رہی ہے۔۔۔ میں ابھی فائٹنگ پٹرولوں پر اکتفا کر رہا ہوں۔ شاید ہمیں کمانڈو آپریشن کی بھی ضرورت پڑ جائے۔“

”سر! آپ یہ نہ کہیں، شاید ضرورت پڑ جائے۔“ اقبال نے یہ کہہ کر سب کو چوکا دیا۔ ”میں آپ کے تجربے اور آپ کی اتھارٹی کو چیلنج نہیں کر رہا۔ گستاخی کی معافی چاہتا ہوں میں۔ کمانڈو ایجنٹ کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں اور میں یہ درخواست بھی کرتا ہوں کہ پہلی کمانڈو پارٹی کے ساتھ میں خود جاؤں گا۔“

”میں تمہارے جذبے کی تعریف کرتا ہوں اقبال! کمانڈنگ آفیسر نے کہا۔ ”مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم کمانڈو ایجنٹ کی ضرورت کیوں محسوس کر رہے ہو؟“

لیفٹیننٹ اقبال کی پلاٹون کے مورچے بالکل باہر یعنی پہلو پر اپنی کمپنی سے خاصے دور تھے۔ اس سے آگے جگہ خالی تھی۔ اقبال نے اور نائب صوبیدار بدراحتی نے دیکھا تھا جیسے دشمن اس طرف کوئی نقل و حرکت کر رہا ہو۔ دوربین سے اُسے ٹینک بھی دکھائی دیتے تھے۔ فاصلہ زیادہ تھا۔ درخت بہت تھے۔ سرکندے، اونچی گھاس اور جھاڑیاں بھی تھیں۔ ان کے علاوہ زمین ایسی تھی کہ اچھی طرح نظر نہیں آتا تھا۔ وہ زمین نشیبی تھی۔

لیفٹیننٹ اقبال نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو تفصیل سے بتایا کہ وہ دو دنوں سے کیا دیکھ رہا ہے۔

”سر! اُس نے کہا۔ ”آپ نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ آپ کو اپنے ذرائع سے پتہ

چلا ہے کہ دشمن حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دشمن اپنے ٹروپس کو وہیں جمع کر رہا ہے۔ ہمارے پاس میڈیکیم یا ہیوی توپخانے کی بریڈی نہیں۔۔۔ آپ مجھے کمانڈو ایجنٹ کی اجازت دیں۔“

”کتنی نفری کی پارٹی لے جاؤ گے؟“

”صرف دس! اقبال نے جواب دیا۔ ”ایک حوالدار ساتھ ہوگا۔“

”اقبال! کمانڈنگ آفیسر نے کہا اور اس سے آگے وہ نہ بول سکا۔ اُس نے تمام فوٹل پر نگاہ دوڑائی اور سر جھکا لیا۔ چند سیکنڈ بعد اُس نے سر اٹھایا اور کہنے لگا۔ ”چونکہ ہمارے سامنے ویسی سرگرمی نہیں تھی جیسی دوسرے محاذوں پر ہے اس لیے میں کمانڈو ایجنٹ کو نظر انداز کر رہا تھا۔ میں اس کارروائی کو کسی اور وقت کے لیے، کسی اور صورت حال کے لیے التوا میں ڈال رہا تھا۔ تم نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے تو میں نہیں چاہتا کہ تمہارے جذبے کا میں گلا گھونٹ دوں۔ اپنا پلان تباہ۔ اگر میں نے محسوس کیا کہ صورت حال کمانڈو ایجنٹ کا ہی مطالبہ کرتی ہے تو تمہیں اجازت دے دوں گا۔۔۔ لیکن اقبال! میں تم سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ تمہیں معلوم ہے کہ کمانڈو ایجنٹ کس قدر نازک اور کتنی خطرناک کارروائی ہے؟“

”یس سر! اقبال نے جواب دیا اور مسکرا کر بولا۔ ”یہ دشمن کے عقب میں جا کر ہی پتہ چلے گا کہ یہ کارروائی کتنی نازک اور کتنی خطرناک ہوتی ہے۔“

فوج میں اس انداز اور اس لمحے میں بات نہیں کی جاتی جس طرح اقبال کا بٹالین کمانڈر کر رہا تھا اور جس طرح اقبال مشورہ دے رہا تھا۔ فوج میں دو ٹوک بات ہوتی ہے۔ یہ کام کرو یا نہ کرو لیکن جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء ایسی نوعیت کی جنگ تھی جسے پاک افواج کا ہر افسر اور جوان اپنی ذاتی جنگ سمجھ رہا تھا۔ فوجی ڈسپلن اور عہدوں کی اونچ نیچ کو نظر انداز کیے بغیر ہر کوئی اپنا اپنا دماغ استعمال کر رہا تھا اور ہر کوئی سوچتا تھا کہ اپنے ملک کے دفاع کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہے۔

کمانڈنگ آفیسر نے اقبال کو اجازت دے دی۔

★

”اوتے باے! کانفرنس سے باہر آکر اقبال کے ایک ساتھی لیفٹیننٹ نے اُسے کہا۔ ”آگے جانے سے پہلے گھر سے ہوا۔ اپنے ماں باپ سے کہہ آنا کہ میں کمانڈو پارٹی لگے لے جا رہا ہوں، میری قبر تیار رکھنا۔“

”انہیں کہہ آنا کہ رشتہ داروں کو ابھی اطلاع دے دیں کہ اقبال شہید ہو گیا ہے۔“ کیپٹن کوارٹر ماسٹر نے اُسے کہا۔ ”انہیں جنازے کا ٹائم بتا آنا۔“

”لاش تو اس کی ملے گی نہیں۔“ اُس کے ساتھی لیفٹیننٹ نے کہا۔ ”نمازِ حبس زہ غائبانہ پڑھی جائے گی۔“

اقبال ہنس رہا تھا۔ اُسے یہی مذاق اچھا لگ رہا تھا۔

”باے! کیپٹن کوارٹر ماسٹر جو اُس کا دوست تھا، بولا۔ ”تمہاری زندگی تو بس آج ہی آج



ہے میرا ایک کام کرتے جاؤ.... وہ فوٹو مجھے دیتے جاؤ.... کیا نام ہے اس کا؟.... ہاں کیپٹن عصمت.... زنگ سروس میں ہے نا! ایک تو اس کا فوٹو دیتے جاؤ اور دوسرے اس کے نام ایک رقعہ لکھ دو۔“

”رقعے میں کیا لکھوں؟“ اقبال نے پوچھا۔

”لکھ دو۔ کیپٹن کوارٹرماسٹر نے کہا۔“ بس اتنا لکھ دو کہ میں آج رات شہید ہو رہا ہوں، لہذا اب تم حامل رقعہ ہمارے ساتھ شادی کر لو۔“

”اپنا منہ دھو کر رکھو۔“ اقبال نے کہا۔ ”میں اس کے ساتھ شادی کرنے کے لیے زندہ رہوں گا۔ اس کی محبت مجھے زندہ رکھے گی۔ وہ تو تمہارے منہ میں....“

”چلو اسے چھوڑو یا۔“ لیفٹیننٹ نے کہا۔ ”وہ جو چھ مہینے پہلے تم کہتے تھے کہ اپنی نوکری کو دھوکے میں لاہور بلاؤ گے اور کسی ہوٹل میں ایک رات رکھو گے، اس کے نام لکھ دو کہ میرے ساتھ آجائے۔“

”اوئے جینو!“ اقبال نے انہیں کہا۔ ”اچھے دوست ہو۔ یہ دُعائیں نہیں کرتے کہ خدا مجھے زندہ واپس لاتے۔“

”میرا خیال ہے تم زندہ ہی واپس آؤ گے۔“ لیفٹیننٹ نے کہا۔ ”شہادت کا رتبہ تم جیسے لشکروں کو نہیں ملا کرتا۔“

”واپس آکر بات کروں گا۔“ اقبال نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”مجھے ابھی جا کر کمانڈو پارٹی تیار کرنی ہے۔“ اور وہ چل پڑا۔

”بالے!“ کیپٹن کوارٹرماسٹر نے اسے پکارا۔

اقبال نے رُک کر پیچھے دیکھا کیپٹن اور لیفٹیننٹ وہیں کھڑے تھے۔ دونوں اقبال کی طرف چل پڑے۔ اقبال اُن کی طرف چلا اور اُن کے سامنے جا رکا۔ اُس نے دیکھا کہ دونوں کے چہروں پر سنجیدگی تھی کیپٹن نے اُسے بازوؤں میں لے کر گلے لگالیا۔ اُس نے چھوڑا تو لیفٹیننٹ اُس کے گلے لگ گیا۔

”اللہ تجھے کامیابی اور زندگی دے بالے!“ کیپٹن کوارٹرماسٹر نے کہا۔ ”جا، اللہ تیرے ساتھ جائے گا۔“

”قوم کا ہم پر قرض ہے بالے!“ لیفٹیننٹ نے کہا۔ ”شہیدوں کا ہم پر قرض ہے جو ہم تم ادا نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا.... تو نہ رہا تو میں تیرے پیچھے جاؤں گا۔ دشمن بی آر بی سے ادھر نہیں آئے گا۔“

اقبال پر جذبات کی رقت طاری ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ اُس نے دونوں کو سلیوٹ کیا اور اپنی پلاٹوں کے مورچوں کی طرف چلا گیا۔ چلتے چلتے رُک گیا۔ ادھر ادھر دیکھا اور حبیب میں ہاتھ ڈال کر فوٹو نکالا۔ یہ زنگ سروس کی کیپٹن عصمت کا فوٹو تھا۔ فوٹو میں عصمت مسکرا رہی تھی۔ اتنی جانفزا مسکراہٹ کہ اقبال جیسے بھول گیا ہو کہ وہ میدان جنگ میں کھڑا ہے۔

وہ کیپٹن عصمت کی مسکراتی ہوئی تصویر میں غم ہو گیا۔ فضا میں ایک گرجدار زناٹے نے اُسے اس

ظلم سے بیدار کر دیا۔ اس زناٹے کے ساتھ ہی انتہائی تیز ”ترتر ترتر“ بلند ہوئی۔ اقبال کے دہلیں

طرف متحرک تین چار گز دور زمین میں گولیاں لگیں۔ اقبال ہاتیں کوگڑا اور زمین کے ساتھ چپک گیا۔ دشمن کا ایک طیارہ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے مورچوں پر گولیاں برساتا گزر گیا تھا۔ مورچوں کی طیارہ کن مشین گنوں نے بے تحاشہ فائر کھول دیا۔ اقبال پیٹ کے بل ریگتا ایک درخت کے تنے تک چلا گیا اور اُس کی آڑ میں ہو گیا۔

فوراً بعد دوسرا طیارہ آیا اور پہلے کی طرح مشین گنوں سے گولیوں کا مینہ برساتا گزر گیا۔ طیارہ کن گنوں کی نالیاں اُس کے تعاقب میں گھوم کر اُس پر فائر کر رہی تھیں۔ دونوں طیاروں کی بلندی خاصی کم تھی لیکن دوسری مرتبہ آتے تو اُن کی بلندی زیادہ تھی اور وہ مورچوں پر فائر کرنے کی بجائے مورچوں کے پیچھے خالی علاقے میں گولیاں برسا کر چلے گئے۔

اقبال درخت کے تنے سے ہٹا اور اپنی پلاٹوں کے مورچوں میں چلا گیا۔ نائب صوبیدار بدراکتی اُسے دیکھ کر دوڑنا آیا۔

”کیا آؤر ملا شاب؟“ نائب صوبیدار بدراکتی نے پوچھا۔

”آج رات کمانڈو پارٹی بھیجی ہے۔“ لیفٹیننٹ اقبال نے کہا۔ ”میرے ساتھ آئیں۔“

”جبرور کریں گا کمانڈو آپشن شاب!“ بدراکتی نے جو شیلے بچے میں کہا۔

لیفٹیننٹ اقبال اُسے اپنے مورچے میں لے گیا۔

سورج غروب ہونے میں کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا۔

★

کھدیاں چھاؤنی کا فوجی ہسپتال زخمیوں سے بھر گیا تھا۔ ڈاکٹروں اور ہسپتال کے ٹاف کواب تو پانی کا گھونٹ پینے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ شہریوں کا ہجوم الگ تھا۔ یہ لوگ زخمیوں کے لیے تھے، فروٹ، دودھ اور مٹھائی وغیرہ لاتے تھے۔ وہ وارڈوں میں جا کر زخمیوں کو عقیقت، احترام اور پیار سے ملتے تھے۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود لوگ یہ محسوس کئے بغیر کہ زخمیوں کو آرام اور نیند کی ضرورت ہے، وارڈوں سے نکلنے نہیں تھے۔

نوجوان لڑکیاں اور لڑکے زسوں اور زنگ سپاہیوں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ ان میں لیفٹیننٹ اقبال کی بہن شمع بھی تھی۔ وہ ایک وارڈ میں زنگ ڈیوٹی کر رہی تھی۔

”کیا محسوس کر رہی ہو؟“ کیپٹن عصمت نے اُس سے پوچھا۔ ”وارڈ میں خون اور پسینے سے جی متلاتا تو نہیں؟.... خون اور پسینے کی بو کے ساتھ جب دوائیوں کی بو ملتی ہے تو برداشت نہیں ہوتی۔“

”نہیں عصمت!“ شمع نے کہا۔ ”تم نے بو کا ذکر کیا ہے تو مجھے خیال آیا ہے کہ زخمیوں سے بو بھی آتی ہے یقین کرنا عصمت! تم تو کہتی ہو کہ بدبو سے میرا جی متلاتا ہو گا، میں نے بدبو محسوس ہی نہیں کی، جی کیوں متلاتے گا؟.... ہاں میں نے جو محسوس کیا ہے میں تمہیں وہ بتاتی ہوں۔ میں کچھ اور کہتی، ان زخمیوں کو دیکھ کر کچھ اور ہو گئی ہوں۔ مجھے یہ سبق ملا ہے کہ اپنے دکھ کم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے دکھ کم کرنے کی کوشش کرو۔“

”تمہیں اقبال یاد نہیں آتا؟“ عصمت نے پوچھا۔



”اقبال؟“ شمع نے کہا۔ ”یاد کیوں نہیں آتا؟ وہ کون سی بہن ہے جسے اپنا سگ بھائی یاد نہ آتا ہو گا.... سچی بات بتاؤ عصمت؟.... محاذوں سے جو کوئی زخمی ہو کر آتا ہے اُس کا چہرہ مجھے اقبال جیسا لگتا ہے۔ معلوم نہیں بھائی جان کس حال میں ہوں گے!“

”میں تو ہر لمحہ ڈرتی ہوں کہ آپریشن ٹیبل پر آنے والا اگلا زخمی اقبال ہی نہ ہو۔“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”یہ تمام زخمی میرے ہاتھوں سے گزر کر وارڈوں میں گئے ہیں۔ ان میں کم عمر سپاہی اور لفٹیننٹ بھی ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر خور ہو رہے لیکن اقبال کو زخمی حالت میں دیکھ کر معلوم نہیں میری حالت کیا ہوگی۔“

”عصمت! شمع نے پوچھا۔ ”کیا تم واقعی بھائی جان اقبال کے ساتھ شادی کرو گی؟“

”تم ابھی شک میں ہو؟“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”جنگ شروع نہ ہو جاتی تو ہماری شادی ہو چکی ہوتی۔“

”بھائی جان نے گھر میں کبھی تمہارا ذکر نہیں کیا۔“ شمع نے کہا۔ ”وہ امی اور بابا جان سے بات کریں گے پھر وہ تمہارے ماں باپ کے پاس رشتہ مانگنے جائیں گے معلوم نہیں تمہارے والدین کا فیصلہ کیا ہو۔“

”بیس کمی۔“ اے فیصلے کی پرواہ نہیں۔“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔“

”میں نے سنا ہے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تمہارے ڈیڈی کیا کام کرتے ہیں۔“ شمع نے کہا۔ ”اور تم کہاں کی رہنے والی ہو؟“

”میں جب منہاری بھابی بن کر آؤں گی تو تمہیں پتہ چل جائے گا۔“ عصمت نے کہا۔ ”شمع! سچے دل سے بتاؤ کہ تم مجھے اقبال کے قابل سمجھتی ہو؟“

”کیا کمی ہے تم میں؟“ شمع نے کہا۔ ”تم سے زیادہ خوبصورت اور کون ہوگی۔“

”اوہ شمع! کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”مجھے اب جانا چاہیے.... تم میرے ساتھ آؤ میں تمہیں جنرل وارڈ سے ہٹا کر ایک کمرے میں بھیج رہی ہوں۔ یہ ننگل بیڈ کا کمرہ ہے۔ وہاں چونڈہ کے محاذ کا ایک لفٹیننٹ زخمی ہو کر آیا ہے۔ اُسے گھرے زخم آتے ہیں۔ ایک ٹانگ کی ہڈی بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔ اُسے ہم نے بچا لیا ہے اور اُسے مسلسل خون اور گلوکوز دیا جا رہا ہے۔“

”اُسے الگ کمرے میں کیوں رکھا گیا ہے؟“

”افسروں کو الگ الگ کمروں میں رکھا جاتا ہے۔“ کیپٹن عصمت نے جواب دیا۔ ”یہ زخمی لفٹیننٹ بالکل نوجوان ہے۔ ابھی اُس پر بے ہوشی کی دوائی کا اثر ہے جو انجکشن کے ذریعے اُسے آپریشن ٹیبل پر دی گئی تھی مینہ کی بھی دوائی دی جا رہی ہے، اس لیے وہ زیادہ وقت غنودگی اور نیم غشی کی حالت میں رہتا ہے۔ اس کیفیت میں وہ کچھ بولتا ہے اور یہی بہکی باتیں کرتا ہے۔ اُس سے ڈر نہ جانا۔ اُسے دل جوتی کی ضرورت ہے۔“

”اُس کے گھر والوں کو کون اطلاع دے گا کہ اُن کا بیٹا زخمی حالت میں سی۔ ایم۔ ایچ کھاریاں میں پڑا ہے؟“ شمع نے پوچھا۔

”سرکاری اطلاع جا چکی ہے۔“ کیپٹن عصمت نے جواب دیا۔ ”اُس کے رشتہ دار آئیں گے۔ تم اس زخمی لفٹیننٹ کا خیال رکھنا۔ چلو میرے ساتھ آؤ میں تمہیں اُس کے کمرے میں داخل کر دوں۔“

★

کیپٹن عصمت نے شمع کو ایک کمرے میں داخل کر دیا۔ بیڈ پر ایک زخمی پڑا تھا۔ اُس کا چہرہ ننگا تھا، باقی جسم پر چادر تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ سالولا سا تھا جس میں پیلاہٹ کی جھلک بھی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ رنگ اس نوجوان کا قدرتی رنگ نہیں، یہ دھوپ کا، رات رات جاگنے کا اور محاذ کے گرد و غبار کا رنگ ہے اور یہ رنگ جسم سے بے شمار خون نکل جانے کی وجہ سے پیلا پڑ گیا ہے۔

زخمی کی آنکھیں بند تھیں اور وہ قدرتی رفتار سے سانس لے رہا تھا جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔ اُس کی عمر بیس اکیس سال تھی لیکن وہ معصوم سا بچہ لگ رہا تھا۔ شمع اُس کے بیڈ کے ساتھ جا کھڑی ہوئی اور اُس کی نظر میں معصوم سے اس چہرے پر رحم گئیں۔ چہرہ بدلتے بدلتے اقبال کا چہرہ بن گیا۔ شمع کے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا اور اُس کا جسم کانپنے لگا۔ شمع کا ہاتھ اپنے آپ لفٹیننٹ کے ماتھے پر چلا گیا اور وہاں سے سرخ زخمی کے بالوں پر آگیا اور انگلیاں بالوں میں الجھ گئیں۔

شمع نے انگلیوں سے زخمی کے بالوں کو کھینچ کر اپنا چہرہ انگریزوں کی آنکھوں میں دیکھا۔ بال پسینے اور مٹی سے جڑے ہوئے تھے۔ کانوں پر مٹی کی تہ صاف نظر آرہی تھی۔ شمع نے بالوں سے انگلیاں نکال کر زخمی کے کانوں سے مٹی صاف کرنے کی کوشش کی لیکن مٹی جی رہی۔ زخمی کے ماتھے پر ایک لیکر سی ایک کھینٹی سے دوسری کھینٹی تک پٹی لگی تھی۔ یہ سٹیل ہیلٹ کا نشان تھا جو زخمی ہونے تک اس نوجوان لفٹیننٹ کے سر پر رہا تھا۔ اتنے دن اور راتیں اُسے سونے یا کچھ دیر کے لیے لیٹنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ ہیلٹ اتار دیتا۔

زخمی کے جسم میں کچھ حرکت ہوتی پھر اُس کا سر دایں باتیں ہلا۔ اُس کے اُس بازو کو بھی حرکت ہوتی جس کی رگ میں گلوکوز لگا ہوا تھا۔ تھوڑی سی دیر پہلے خون اتار لیا گیا تھا۔ جب گلوکوز کی سوتی والا بازو بلا تو شمع نے اس بازو کو کچرا لیا اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”نہیں نہیں!“ زخمی صاف آواز میں بڑبڑانے لگا۔ ”سب جوان ابھی نہیں پہنچے....“

”ٹھہرو ٹھہرو.... کسی زخمی کو ادھر نہیں چھوڑیں گے.... نہیں نہیں.... میں ٹھیک ہوں، جوانوں کو دکھو۔“ زخمی کی آواز دہی گئی اور فیڈ آؤٹ ہو گئی۔

”یہ ابھی تک محاذ پر لڑ رہا ہے۔“ شمع کو کیپٹن عصمت کی آواز سنائی دی۔

شمع نے چونک کر دیکھا۔ وہ تو بھول ہی گئی تھی کہ عصمت بھی اس کمرے میں موجود ہے۔ ”اُسے بے ہوشی کی حالت میں لاتے تھے۔“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”آپریشن تھیمٹر میں اسے بے ہوشی کا ایک اور انجکشن لگایا گیا کیونکہ زخموں کی حالت بہت بُری تھی۔ ایسے زخموں کو ہلانے لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ٹانگ کی ہڈی بھی جڑنی تھی۔ اسے بے ہوش رکھنا ضروری تھا۔ اس انجکشن کا اثر اتر رہا ہے۔ ڈر نہ جانا شمع! یہ ابھی ایسی باتیں اور ایسی حرکتیں کرے گا کہ تم گھبرا جاؤ گی۔“



اب اُس نے زخمی لیفٹیننٹ کے چہرے کو دیکھا تو اُسے یہ چہرہ آسمان کے پانیوں میں دھلا ہوا نظر آیا۔ بار بار اقبال اُس کے ذہن میں آتا تھا۔

★

لیفٹیننٹ اقبال نے کمانڈو پارٹی تیار کر لی تھی جس میں اُس نے اپنی کمپنی کے دس چنے ہوئے جوان رکھے تھے۔ اُس نے حوالدار وہ منتخب کیا تھا جس نے سائین کے پار دشمن کو کئی گھنٹے روکے رکھا تھا۔ نائب صوبیدار بدر الحق بھی اُس کے ساتھ جانا چاہتا تھا، لیکن وہ لڑائی تھی میلہ نہیں تھا کہ جس کا جی چاہتا وہ ساتھ چل پڑتا۔ یہ جذبے کی انتہا تھی کہ جو سنتا تھا کہ کمانڈو پارٹی دشمن کے اگلے مورچل کے پیچھے جا رہی ہے وہ درخواست کرتا کہ اُسے اس پارٹی میں شامل کیا جائے۔

”نہیں نائب صاحب!“ اقبال نے نائب صوبیدار بدر الحق سے کہا۔ ”آپ کو میں کیسے ساتھ لے جاسکتا ہوں۔ پلانوں کی کمانڈ کون کرے گا؟“

”ٹھیک ہے شاب!“ نائب صوبیدار بدر الحق نے مایوس سے لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے.... لیکن شاب! اپنا خیال رکھنا!“

”اپنا؟“ اقبال نے کہا۔ ”نائب صاحب! اگر ہم نے اپنا اپنا خیال رکھا تو ملک کا ڈیفنس کون کرے گا؟“

نائب صوبیدار بدر الحق نے جذبات کی شدت سے غمزدگی کی ادنیٰ نیچ کو بھول کر اقبال کو گلے سے لگا لیا۔

”آپ نے ٹھیک بولا شاب!“ بدر الحق نے رقت سے دبی ہوتی آوازیں کہا۔ ”ملک کے ڈیفنس کے لیے آپ کو یا ہم کو ضرور مرنا پڑے گا.... ہم مر جائے تو ٹھیک ہے۔ آپ ابھی لڑکا ہے.... ٹھیک ہے شاب، ٹھیک ہے۔ ہم آپ کے لیے دُعا کرے گا۔“ اُس نے لیفٹیننٹ اقبال کے ساتھ اتنی زور سے ہاتھ تلایا جیسے وہ اپنے بیٹے کو رخصت کر رہا ہو۔

اقبال قوم کے بیٹے کے روپ میں آچکا تھا۔

اُسے اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ دشمن کی اگلی پوزیشن کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں، اُن کے پیچھے کیا ہے اور جس زمین سے اُس نے گزر کر جانا ہے وہ کسی ہے۔ اُسے یہ معلومات اُس کے بٹالین کمانڈر نے دی تھیں اور نقشے پر اُسے سارا علاقہ ذہن نشین کر دیا تھا۔ بٹالین کمانڈر نے یہ معلومات اپنے ذرائع سے حاصل کی تھیں۔ اقبال نے اپنی پارٹی کا معائنہ کیا۔ سب نے پی ٹی شوز پہن رکھے تھے۔ اُس نے ایک خیال یہ رکھا کہ کسی کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جو جھنکار پیدا کرتی ہو اور کوئی جوان ایسا نہ ہو جسے کھانسی آتی ہو۔

”تم سب اردو اچھی طرح سمجھ سکتے ہو“ لیفٹیننٹ اقبال نے اپنی پارٹی کے جوانوں کو روانہ ہونے سے پہلے بکچر دیا۔ ”اگر کسی کو کوئی بات یا کوئی لفظ سمجھ نہ آتے تو مجھے روک لے اور پوچھ لے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیا کرنے جا رہے ہیں۔ تم رگروٹ نہیں ہو، پرانے پانی ہو۔ تم فائننگ پیروٹوں پر جاتے رہے ہو۔ اب یوں سمجھو کہ فائننگ۔“

تم نے وارڈ میں زخمیوں کو دیکھا ہے نا!.... یہ خیال رکھنا کہ اس کا یہ بازو نہ ہلے۔“ عصمت!۔ شمع نے کہا۔ ”مجادلوں کے زخمی درد سے کراہتے کیوں نہیں؟“ یہ اپنے ملک کی جنگ لڑ رہے ہیں شمع!۔ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”جذبہ ان کی رُوح میں اُترا ہوا ہے۔ اس لڑکے کو تم جسم نہ سمجھو۔ یہ رُوح ہے۔“

”روحانی جذبہ!“ شمع نے آہ لینے کے انداز سے کہا۔

”تم اب اسی کے پاس رہو گی“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”یہ جب ہوش میں آئے گا تو اس کی باتیں سننا۔“

”عصمت!“ شمع نے عصمت کے قریب آکر سرگوشی میں کہا۔ ”میں اکیلی اس کے ساتھ رہوں گی؟.... رات کو بھی؟“

”ہاں اکیلی!“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”رات کو بھی۔ یہ مکمل طور پر ہوش میں آجائے گا تو بھی تم اس کے ساتھ رہو گی۔“

شمع کے ہونٹوں پر شرم و حجاب کی مسکراہٹ آگئی۔

”تم خود محسوس کرو گی کہ اس کی نظروں میں تم ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی نہیں ہو۔“ عصمت

نے کہا۔ ”میں یہ پاکستان کی آبرو کی علامت سمجھے گا.... میں نے کئی زخمیوں کے ساتھ باتیں کی ہیں اور اُن کی باتیں سنی ہیں۔ تم اس کی باتیں سننا۔ اس کی دل جوئی کرنا لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ یہ دل جوئی کی خواہش کرے گا ہی نہیں صرف ایک بات کہہ گا کہ مجھے آگے بھیجو۔“

”وہ نظر آ رہا ہے۔“ زخمی لیفٹیننٹ پھر بڑبڑانے لگا۔ اب کے وہ اور زیادہ صاف بول رہا تھا۔

”ٹینک ہے.... لائیٹر مجھے دو۔“ اُس نے بلند آواز سے کہا۔ ”مار لیا.... اب.... اب.... اس کے شعلوں کی روشنی میں.... آڑ میں رہو اگر کم.... اُس کی آواز فید آؤٹ ہوتے ہوئے ختم ہوگئی۔“

”میں جا رہی ہوں شمع!“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”جب کوئی ڈاکٹر آئے تو اُسے بتا دینا کہ یہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جسم کو اکڑاتا ہے اور جوشی باتیں کرتا ہے.... ڈاکٹر کو یہ بتانا ضروری ہے

کیونکہ یہ جسم کو بار بار اتنا زیادہ اکڑاتا رہا تو زخموں کے ٹانگے کھل جانے کا خطرہ ہے۔ ویسے بھی خون میں اتنا جوش پیدا کرنا اس کے لیے ٹھیک نہیں۔“

”ڈاکٹر کیا کرے گا؟“ شمع نے پوچھا۔

”وہ ذہنی سکون کی کوئی دوائی یا انجکشن دے دے گا۔“ عصمت نے کہا۔ ”اچھا میں اب

جاتی ہوں۔“

عصمت کے جانے کے بعد شمع اس نوجوان لیفٹیننٹ کے سر ہانے بیٹھ گئی اور نظریں اُس

کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اُس کی نظروں میں یہ چہرہ جھللا نے لگا جیسے وہ اُس کا عکس کسی جھیل میں دیکھ رہی ہو جھللاتا ہو یا یہ چہرہ ایک بار پھر شمع کے بھائی اقبال کا چہرہ بن گیا۔ تب اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی

آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔ اُس نے زخمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اچانک اُسے شدید یاد آگیا

جس کے ساتھ وہ ریلوے لائن پر پکڑی گئی تھی۔ نفرت کی ایک لہر اُس کے سارے وجود میں پھر گئی۔



پٹرول دشمن کے اگلے مورچوں کے پیچھے جانے گی.... لیکن میرے دوستو! ہم جانیں گے کہ انہیں گے نہیں۔ تم آج کسی افسر کے حکم سے نہیں خدا کے حکم سے جا رہے ہو۔ اس کا انعام تمہیں خدا دے گا۔ تم دس جوانوں نے آج رات وہ کام کرنا ہے جو پورا ڈویژن کیا کرتا ہے۔ ہمارے پاس فوج بہت کم ہے۔ دشمن اسی لیے پاکستان پر چڑھ دوڑا ہے کہ اُس کی نفری اور فائر پاور ہم سے کتنی گنا زیادہ ہے۔ ہمیں ثابت کرنا ہے کہ مسلمان سپاہی کے ساتھ اُس کا خدا ہوتا ہے اور مسلمان کا خدا سچا ہے۔

اقبال انہیں مشن کے متعلق فوجی ہدایات دے چکا تھا۔ چونکہ مشن بہت خطرناک تھا اور جوانوں سے ایک معجزے کی توقع کی جا رہی تھی اس لیے ان کے جذبے اور مورال کو مضبوط رکھنے کے لیے جوشیے اور جذباتی لیکچر کی ضرورت تھی لیکن بنگالی جوانوں کے جذبے کی کیفیت یہ تھی کہ فوراً آگے جانے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ اُن کا جوش و خروش تیار ہوا تھا کہ انہیں کسی لیکچر کی ضرورت نہیں۔

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں یہی جذبہ کار فرما تھا جسے جذبہ ستمبر کہتے ہیں۔  
آخر وہ لمحہ آیا جب لیفٹیننٹ اقبال اپنی کمانڈ پارٹی کے ساتھ ساتیفن پار کر گیا۔

★

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کمانڈنگ آفیسر اُس وقت ساتیفن پر کھڑا تھا۔ اُس نے اقبال سے ہاتھ ملایا اور اُسے دعاؤں سے رخصت کیا تھا۔ آگے دونوں فوجوں کے درمیان خالی جگہ تھی۔ اقبال اپنی پارٹی کو ”سنگل فائل“ میں نہر کے دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ لے جا رہا تھا۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چند قدم چل کر وہ سرگوشیوں میں اپنے جوانوں سے سنسی مذاق کی کوئی بات کہہ دیتا۔ اس سے جوان اُس بیجانی کیفیت سے آزاد ہو جاتے جو اُن پر طاری تھی۔ اس قسم کی ہم سے پہلے بیجانی کیفیت کا طاری ہونا لازمی ہوتا ہے۔

نہر کے ساتھ ساتھ پارٹی کم و بیش دو میل دُور چلی گئی۔ کھیم کزن اور لاہور کے محاذوں کی توپوں کے دھماکے صاف سنا دیے رہے تھے۔ اُس رات برکی کا محاذ سب سے زیادہ گرم تھا۔ دشمن نے برکی پر قبضہ کرنے کے لیے بڑا زوردار حملہ کیا تھا اور پانچ تانہ بڑی زبردست گولاباری کر رہا تھا۔ حملے میں جان ڈالنے کے لیے دشمن رات کے وقت بھی ٹینک استعمال کر رہا تھا۔ ان کے مقابلے کے لیے پاک فوج کا ایک بھی ٹینک آگے نہیں تھا۔ پاک فوج کے مورچے نہر کے لاہور والے کنارے پر تھے۔ ٹینک کم ہی ہونے چاہئیں تھے وہاں ٹینکوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دشمن کو معلوم تھا اس لیے وہ برکی تک رات کو بھی ٹینک لے آیا تھا۔ ٹینک فائر کر سکتے تھے لیکن رات کو لڑ نہیں سکتے تھے۔

دو میل دُور جا کر لیفٹیننٹ اقبال اپنی پارٹی کو نہر کے کنارے سے ہٹا کر دشمن کے مورچوں کی طرف لے گیا۔ یہی رپورٹوں کے مطابق اُس جگہ دشمن کا کوئی مورچہ نہیں تھا لیکن کچھ نہ کچھ ضرور تھا۔ آگے خاصی سرگرمی اور حرکت تھی۔ محاذ کے گرد و غبار کی وجہ سے چاند نی بہت چمکی تھی۔ اقبال اپنی پارٹی کو سرکندوں کے جنگل کے اُس طرف لے گیا جو اُس جگہ سے دُور تھی جہاں کوئی سرگرمی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس طرف درخت زیادہ تھے۔ اپنی گھاس بھی تھی اور ذرا کم گھرے اور زیادہ گھرے گڑھے بھی تھے۔ اب وہ اس قدر خاموشی سے جا رہے تھے جیسے اپنی سانسوں کو

بھی روکے ہوتے ہوں۔  
”اوتے کون ہو؟“

اچانک جیسے سرکندوں کے جنگل میں سے آواز اُٹھی ہو۔ اقبال نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ اُس کے اشارے پر اُس کے جوان جہاں تھے وہیں گہر کر زمین کے ساتھ چپک گئے تھے۔

پکارنے والا انڈین آرمی کا جوان تھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور جوان تھا۔ یہ گشتی سنتری تھے۔ ان سے کچھ دُور دو اور سنتریوں کو ہونا چاہیے تھا۔ آگے والے دو سنتریوں کو شک ہوا تھا کہ کوئی آ رہا ہے۔ شاید انہوں نے کسی کو دیکھ بھی لیا تھا۔ دونوں سنتری درختوں کی طرف یہ دیکھنے کے لیے آتے کہ ادھر کون آ رہا تھا۔ دونوں نے رائفلس جن کے آگے سینگیں لگی ہوئی تھیں آگے کر رکھی تھیں۔

اچانک پیچھے سے دونوں کی گردنیں ایک ایک بازو کے شکنجے میں آ گئیں۔ ایک کو لیفٹیننٹ اقبال نے اور دوسرے کو اُس کے پلاٹون حوالدار نے اس طرح دبوچ لیا تھا کہ پیچھے سے بازو اُن کی گردنوں کے گرد لپیٹ دیتے تھے۔ دو بنگالی جوان بڑی تیزی سے گڑھوں سے نکلے۔ اُن کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے جن سے انہوں نے انڈین آرمی کے ان دونوں سپاہیوں کے کچھ پیٹ چاک کر دیئے۔

”دل پر!۔ اقبال نے سرگوشی کی۔“ دل پر!“

دونوں بنگالیوں نے چاقو دونوں کے دلوں میں اتار دیئے۔ اقبال اور حوالدار نے انہیں چھوڑ دیا۔ دونوں گر پڑے۔ اقبال کے کہنے پر دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر ایک گہرے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔

”یہ دشمن کی فائنلنگ پٹرول نہیں۔“ لیفٹیننٹ اقبال نے اپنے جوانوں سے کہا۔ ”یہ گشتی سنتری تھے۔ ان کے پیچھے دو اور ہوں گے۔ یہیں چھپے رہو۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ ان میں سے ایک کو زندہ رکھنا ہے۔“

★

اقبال نے بات ختم کی ہی تھی کہ آہستہ آہستہ قدموں کی آہٹ سنا دی۔ اقبال نے ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو کر دیکھنے کی کوشش کی۔ دو ساتے چلے آ رہے تھے سب نے سانس روک لیے۔ جونہی یہ دونوں اس پارٹی کے قریب سے گزرے، دونوں عقب سے مضبوط بازوؤں میں جکڑے گئے۔ دونوں کی گردنیں ایک ایک بازو کے مضبوط گھیرے میں آتی ہوتی

تھیں۔ انہیں گھسیٹ کر درختوں کے جھنڈ میں لے آئے۔ دونوں کے پاس ٹین گنیں تھیں جو اُن سے لے لی گئیں۔ انہیں بٹھالیا گیا۔ دونوں نے منت سماجت شروع کر دی۔

”ادھر آگے کیا ہو رہا ہے؟“ اقبال نے اُن سے پوچھا۔

”ہمیں جان سے تو نہیں مارو گے؟“ ایک نے روتی ہوئی آواز میں پوچھا۔



”بالکل ٹھیک بتا دو گے تو نہیں ماریں گے۔“ اقبال نے کہا۔ ”نہیں بتاؤ گے تو آؤ میں تمہیں متارے اگلے دو ساتھیوں کی لاشیں دکھا دیتا ہوں۔ تمہاری لاشیں بھی اُن کے ساتھ رکھ دیں گے۔“

”تقریباً ڈیڑھ سو گز آگے ایمونیشن ٹرکوں سے اتر رہا ہے۔“ ایک نے کہا۔ ”اس میں آرٹری کا ایمونیشن بھی ہے، ٹینکوں کا بھی اور چھوٹا ایمونیشن بھی۔“

”وہاں بہت بڑا گڑھا ہے۔“ دوسرے نے کہا۔ ”اسے اور زیادہ کھلا کر لیا گیا ہے۔ ایمونیشن کے بجائے اس میں اتارے جا رہے ہیں۔“

”آگے کیا ہے؟“ اقبال نے پوچھا۔ ”مورچے کہاں ہیں؟“ ایک نے بتایا کہ وہ کون سی رجمنٹ کے ہیں اور انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اُن کے مورچے کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ قریب ہی اس رجمنٹ کی آؤٹ پوسٹ تھی جس میں ایک مشین گن میڈیم تھی اور ایک لائٹ مشین گن تھی۔

”ٹینکوں کا لیگز کہاں ہے؟“ اقبال نے پوچھا۔

”ہماری پوزیشنوں کے پیچھے۔“ ایک نے بتایا۔

”بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟“ اقبال نے پوچھا۔

”ہم سپاہی ہیں۔“ ایک قیدی نے کہا۔ ”ہمیں معلوم نہیں کہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کہاں ہے۔“

”میرا خیال ہے ڈویل دور ہے۔“ دوسرے نے کہا۔ ”وہ جس طرف ہے میں وہ بتا دیتا ہوں، جگہ معلوم نہیں۔“

”صبح کے لیے تمہیں کیا حکم ملا ہے؟“ اقبال نے پوچھا۔

”صبح کے لیے حکم تو صبح ہی ملے گا صاحب!“ قیدی نے جواب دیا۔ ”ہم سپاہی ہیں۔“

جو حکم ملتا ہے وہ پورا کرتے ہیں۔ آپ کے ساتھ ہماری کیا دشمنی ہے صاحب بہادر!“

”اوتے میں صاحب بہادر نہیں ہوں یا!“ لیفٹیننٹ اقبال نے کہا۔ ”میں تو کچا لیس

(لائس نائک) ہوں۔“

ہندو سپاہی ہنس پڑا اور بولا۔ ”میں بیوقوف تو نہیں ہوں جناب! آپ کے کندھے پر

زینک کے پھول نہیں ہیں تو کیا ہوا، آپ آفیسر ہیں۔“ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”مجھے معافی

دے دیں۔ میری مال اندھی ہے۔ اُس کو ساری تنخواہ بھیج دیتا ہوں۔“

”میں تو اس سے بھی زیادہ غریب ہوں صاحب بہادر۔“ دوسرے نے بھی ہاتھ جوڑ

دیتے اور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میری بیوی بڑی بد معاش ہے۔ میں نے تنخواہ اُس کے

نام لکھوائی ہوئی ہے۔ وہ سائے پیسے بھضم کر جاتی ہے، میری مال کو کچھ نہیں دیتی۔“

لیفٹیننٹ اقبال کے ہنگامی جوان یوں ہنس پڑے جیسے بارک میں بیٹھے ہوئے ہوں۔

اقبال نے سرگوشی میں ڈانٹ کر انہیں چپ کرایا۔

وہ دونوں سپاہی تھے۔ سپاہیوں کو تو اپنی پلاٹوں کے پلان یا اگلے پروگرام کا علم نہیں ہوتا۔

وہ اقبال کو کوریڈور کے پلان کے متعلق کیا بتاتے۔ پھر بھی اقبال نے اُن سے اتنی زیادہ باتیں پوچھیں کہ اُسے اندازہ ہو گیا کہ دشمن کا کم از کم ایک ڈوٹرین صبح حملہ کرے گا اور یہ ساتیئن سے گزرنے کی ایک زبردست کوشش ہوگی۔ محاذ کی خاموشی تصدیق کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اقبال نے اُن سے مختلف ایسی جگہیں بھی معلوم کر لی تھیں جو کمانڈو پارٹی کے لیے نہایت اچھے ٹارگیٹ تھے۔

اقبال اپنے حوالدار کو ذرا پر سے لے گیا اور اُسے کہا۔ ”ان دونوں کو کسی گھر سے گڑھے میں لے جاؤ۔ مار نہ دینا انہیں۔ غریب آدمی ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں اور منہ باندھ کر گڑھے میں چھوڑ آؤ۔۔۔ بہت جلدی۔“

حوالدار اپنے دو جوانوں کو ساتھ لے کر دشمن کے ان دونوں سپاہیوں کو ذرا دور لے گیا۔



حوالدار اپنے دونوں جوانوں کے ساتھ واپس آ گیا۔

”بچا باندھا ہے نا؟“ اقبال نے حوالدار سے پوچھا۔ ”منہ بھی باندھے ہیں؟“

”ہلے گا نہیں شر!“ حوالدار نے جواب دیا۔ ”منہ پکبان کر دیا۔ ان کو اپنا بھگوان بلا تے

گا۔ یہ شالا پھر بھی نہیں بولے گا۔۔۔ پھر کمرست نیتیں کر دشر! لڑائی کھتم ہو جائے گا۔ یہ پھر بھی نہیں

بولے گا۔“

”منیر! حسن!“ لیفٹیننٹ اقبال نے حوالدار سے پوچھا۔ ”تم نے....؟“

”ہاں! شر!“ حوالدار نے جواب دیا۔ ”پھکڑنٹیں، پھکڑنٹیں۔ ہم دونوں کو مار دیا۔ دشمن

ہے شر! دشمن ہے، ہمارا شالائیں ہے.... یہ گریب ہے تو ہم جیاستی گریب ہے۔ ہمارا

پاکستان بھی گریب ہے۔ اس شالے کے پاس ٹینک ہے، ہمارے پاس ٹینک نہیں ہے۔

— اُس نے اپنے بازو آگے کر کے کہا۔ ”ہمارے پاس یہ باجو ہے۔ ہم باجو کے جور سے

شالے کا ٹیک ٹوڑے گا۔۔۔ چلو شر! ایڈ بانس کرو۔“ اُس نے اپنے جوانوں سے کہا۔

”ایڈ بانس کرو بے ایڈ بانس!“

لیفٹیننٹ اقبال خاموشی سے اپنے حوالدار کی باتیں سنتا رہا۔ اُسے غصہ نہ آیا کہ اُس کے

حکم کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ وہ کچھ محسوس ضرور کر رہا تھا۔ وہ جب اپنی پارٹی کو لے کر آگے

چلا تو اُس کے اندر سے جیسے کوئی بولا ہو۔ ”دشمن کو دشمن سمجھنے والے کبھی شکست نہیں

کھایا کرتے شکست انہیں ہوتی ہے جو دشمن کو اپنا سلا سمجھتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ دشمن انہیں

اپنا سلا بنا لیتا ہے۔ سانپ کا منہ بند کرنے سے اُس کا زہر مارا نہیں جاتا۔“

لیفٹیننٹ اقبال کا بٹالین کمانڈر اپنے سیکنڈ ان کمانڈ کے ساتھ ساتیئن پر کھڑا دشمن کے

مورچوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اقبال کا کمپنی کمانڈر نائب صوبیدار بدراحت کے ساتھ اپنے مورچوں

کے پاس منہ کے کنارے پر کھڑا ادھر دیکھ رہا تھا جدھر اقبال کو جانا تھا۔

”کبھی خیال آتا ہے کہ اس لڑکے کو آگے بھیج کر میں نے غلطی کی ہے۔“ بٹالین کمانڈر نے

اپنے سیکنڈ ان کمانڈ سے کہا۔ ”غیر ذمہ دار سا لڑکا ہے۔“



”جنگ ہے سر! — سیکنڈ ان کمانڈ نے کہا —“ ہمارے پاس جو کچھ ہے ہمیں اسی سے کام لینا ہے۔ اگر یہ لڑکا غیر ذمہ دار ہے تو آج اسے ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے گا۔ اس نے اپنے آپ کو ڈائریٹر کیا تھا سر!

”مارا جائے گا۔“ بٹالین کمانڈر نے کہا۔ ”اب تک اسے تارگیٹ پر ہونا چاہیے تھا۔“

”نائب صاحب! — کمپنی کمانڈر نائب صوبیدار بدراحت سے پوچھ رہا تھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے، لیفٹیننٹ اقبال کچھ کر لے گا؟“

”جہرہ کر لے گا شاب! — بدراحت نے کہا۔ ”اقبال شاب اب نہیں ڈرتا۔“

”کچھ نہیں کر سکے گا۔“ کمپنی کمانڈر نے کہا۔

”شکے گا شاب! جہرہ کر لے گا۔“ نائب صوبیدار بدراحت نے کہا۔ ”ہم نے حوالدار منیر احسن کو ساتھ بھیجا ہے۔ جبرداشت حوالدار ہے۔“

یہ سب بے چین اور بیتاب ہوئے جا رہے تھے۔ اس وقت تک دشمن کی اگلی پوزیشنوں کے پیچھے دھماکہ ہو جانا چاہیے تھا۔ اب ان سب کو شک ہونے لگا تھا کہ اقبال جوش میں آکر چلا تو گیا ہے لیکن نا تجربہ کاری کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو گا۔ پکڑا جائے گا یا مارا جائے گا۔

★

اس وقت اقبال کی پارٹی اس وسیع گڑھے سے کوئی ایک سو گز دور پہنچ چکی تھی جس میں بڑے اور چھوٹے ایمونیشن کے بجس ٹرکوں سے اتار کر رکھے جا رہے تھے۔ وہاں کوئی روشنی نہیں تھی۔ بھیک کی چاندنی میں دوڑک گڑھے کے اوپر کھڑے تھے اور ان سے بھس اتر رہے تھے۔ دونوں ہندو سپاہیوں کے بیان کے مطابق یہاں شام کے فوراً بعد ایمونیشن آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گڑھا بھر گیا تھا۔

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارتیوں نے تقریباً تمام محاذوں پر ایمونیشن مورچوں سے تھوڑی دور پیچھے گڑھوں میں رکھنے کا طریقہ اختیار کیا تھا تاکہ ایمونیشن کی سپلائی میں وقت ضائع نہ ہو۔ ایسا اکثر ہوا کہ پاکستانی توپ خانے کی گولہ باری ہوئی تو ایک دو گولے دشمن کے ایمونیشن والے گڑھے میں جا پھٹے اور تمام تر ایمونیشن ایک مہیب دھماکے سے اڑ گیا۔

یہاں بھی دشمن توپوں اور ٹینکوں کا اور انفنٹری کا ایمونیشن جمع کر رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دشمن زبردست حملہ کرے گا۔ اقبال نے اپنے جوانوں سے کہا کہ وہ دور پیچھے گڑھوں میں لیٹ جائیں اور انگلیاں کانوں میں دبائیں۔ حوالدار منیر احسن کو اس نے اپنے ساتھ رکھا۔

”منیر! — اقبال نے اپنے حوالدار سے کہا۔ ”فاصلہ ایک سو گز ہے۔ اتنی دور گرنیڈ پہنچا سکتے ہو؟“

”آگے چلو شر! — حوالدار نے کہا۔ ”گرنیڈ جاتے نہیں کرے گا۔“ وہ آگے کو سرکنے لگا۔ انہیں ساٹھ ستر گز کے فاصلے تک جانا تھا۔ وہاں سے پوری طاقت سے پھینکنے سے گرنیڈ گڑھے کے اندر جا سکتے تھے۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ اتنے فاصلے پر وہ ایمونیشن کے دھماکے کی زد میں آ سکتے تھے۔ اقبال اس خطرے سے آگاہ تھا لیکن اس نے پرواہ نہ کی۔

وہ پریٹ کے بل رینگتا حوالدار منیر احسن کے ساتھ آگے ہی آگے جاتا رہا۔ فاصلہ ساٹھ گز سے بھی کم ہو گیا تھا۔ دھماکے کے ساتھ اڑ جانے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔

اقبال کو اپنے قریب ایک گڑھا نظر آ گیا۔ یہ اچھا خاصا کھڈ تھا جس میں اقبال اپنے حوالدار سمیت سما سکتا تھا۔ اس نے حوالدار سے کہا کہ گرنیڈ نکالے۔ اس نے خود بھی گرنیڈ نکال لیا۔ انہیں ایمونیشن اتارنے والوں کی باتیں سنائی دینے لگی تھیں۔

”اٹھو منیر احسن! — اقبال نے کہا۔ ”پن نکالو، بسم اللہ شریف پڑھو اور پوری طاقت سے گرنیڈ پھینکو۔“

دونوں اکٹھے اکٹھے۔ اکٹھے ہی انہوں نے اپنے اپنے گرنیڈ سے پن نکالے۔ دونوں نے ذرا اونچی آواز میں بسم اللہ شریف پڑھی۔ دونوں کے دانت بازو اکٹھے پیچھے گئے اور بجلی کی

تیزی سے کندھوں کے اوپر سے گھوم کر آگے گئے۔ دو گرنیڈ ہوا میں بلند ہو کر ایمونیشن کے گڑھے کی طرف گئے۔ اقبال اور اس کا حوالدار پک جھپکتے اپنے قریب گڑھے میں جا کر رہے۔ لیٹ کر انہوں نے انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔

چار ساڑھے چار سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ پہلے گرنیڈوں کے دھماکے سنائی دیتے اور اس کے ساتھ ہی اتنی زور کا دھماکہ ہوا کہ اقبال اور حوالدار لیٹے لیٹے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ توپوں کے گولے ایک ہی بار پھٹنے سے چمک ایسی ہوئی جیسے سورج زمین پر آ پڑ ہو۔ اقبال اور حوالدار کو اپنے اوپر زناٹے سنائی دیتے جو گزر گئے۔ یہ پھٹنے والے گولوں کے ٹکڑے تھے۔ کانوں میں ٹھونس ہوئی انگلیوں کے باوجود ان کے کان بند ہو گئے۔

پھر دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ تمام ایمونیشن ایک ہی بار نہیں پھٹا تھا۔ بڑے گولے ایک ایک دودھ پھٹ رہے تھے۔ اقبال نے خطرہ مول لے کر سر اٹھایا۔ اسے دونوں ٹرک جلتے ہوئے نظر آئے۔ ذرا ہی دیر بعد ٹرکوں میں جو ایمونیشن تھا، وہ پھٹا۔

”وہ مار لیا۔“ سائیفن پر کھڑے بٹالین کمانڈر نے نعرہ لگایا۔ ”میرے خدا... کیا تھا وہاں؟“

”ایمونیشن لگتا ہے۔“ سیکنڈ ان کمانڈ نے کہا۔ ”اللہ سب کو خیریت سے لے آئے۔“

”وہ دیکھو شاب! — ادھر نائب صوبیدار بدراحت نے اچھل کر کہا۔ ”ہم ٹھیک بولا تھا۔ اقبال شاب ہمارا ٹائیگر ہے۔“

کمپنی کمانڈر کا نعرہ سب سے زیادہ اونچا تھا۔ جلتے ہوئے ٹرکوں کے شعلے اپنے مورچوں سے صاف نظر آرہے تھے۔ دھماکے کا شعلہ تو اتنی دور اوپر گیا تھا جیسے آسمان تک پہنچے گا۔

★

دشمن کے اگلے اور پچھلے مورچوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ کسی کو ہوش نہیں تھا کہ دیکھتا کہ ایمونیشن کو کس نے تباہ کر دیا ہے۔ لیفٹیننٹ اقبال حوالدار کے ساتھ گڑھے سے نکلا اور دوڑ کر اپنے جوانوں تک گیا۔ ان میں سے دو کے پاس راکٹ لانچر تھے۔ ان دونوں سنٹرلوں نے جنہیں



انہوں نے پکڑا تھا، بتا دیا تھا کہ ٹینک کہاں کھڑے ہیں۔ اقبال نے حوالدار منیر احسن کو کوئی اور تار گھیسٹ بتائے اور خود راکٹ لائیچروں والے جوانوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔

انہیں زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ نصف میل سے ذرا زیادہ دور جا کر انہیں دو ٹینک ایک درخت کے نیچے کھڑے دکھائی دیے۔ چاندنی میں ان کے ہیروے سے نظر آ رہے تھے۔ اقبال دونوں جوانوں کو آگے لے گیا۔ وہاں بھی سب بیدار ہو چکے تھے اور وہاں جگ دوڑ سی تھی۔

اقبال نے دونوں جوانوں کو الگ الگ دو ٹینک دکھائے۔ دونوں جوان موزوں فاصلے پر پہنچنے کے لیے آگے چلے گئے۔ یہ موزوں فاصلہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ صرف پچاس گز۔ دونوں نے پورے اطمینان سے لائیچر کندھوں پر رکھ کر شست لی اور راکٹ فائر کر دیئے۔ دونوں راکٹ سیدھے ٹینکوں میں لگے۔ ٹینکوں کے اندر ایمویشن تھا اور یہ پٹرول سے بھرے ہوئے تھے۔ دونوں کا ایمویشن بڑے خوفناک دھماکوں سے پھٹا اور شعلے اٹھنے لگے۔

اب اقبال اور اُس کی پارٹی کے لیے بڑا مشکل وقت آگیا۔ دشمن کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ پاکستانیوں کی کمانڈو پارٹی یا ٹینک ہینڈلنگ پارٹی آگئی ہے۔ دشمن نے روشنی راؤنڈ فائر کرنے شروع کر دیئے۔

ادھر سائیفن پریٹینڈنٹ اقبال کا کمانڈنگ آفیسر اپنے سیکنڈان کمانڈ کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُسے دشمن کے اگلے مورچوں کے دور تیجھے دو اور دھماکے سنائی دیتے اور دو اور شعلے دکھائی دیتے۔ اُس نے دائر لیس آپریٹر کو جو قریب ہی کھڑا تھا، اپنے پاس بلایا اور خود بات کرنے لگا۔ ادھر اقبال کے ساتھ بھی دائر لیس آپریٹر تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اقبال کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ پیغام ہے۔ اقبال بھی اپنے کمانڈنگ آفیسر کی طرح خود بات کرنے لگا۔ وہ کوڈ میں نہیں بلکہ اپنے مقرر کیے ہوئے الفاظ اور اشاروں میں بات کر رہے تھے۔ اقبال نے کچھ فاصلے بتاتے اور بات ختم کر دی۔

کمانڈنگ آفیسر نے توپ خانہ میٹری سے ملاپ کر کے فائر آرڈر دیا اور اُس کے ساتھ ہی میٹری کی توپوں نے گولے داغنے شروع کر دیئے۔ یہ گولے اُس علاقے سے ہرٹ کر گھر رہے تھے جہاں اقبال کی پارٹی اپنی کارروائی میں مصروف تھی۔ یہ پہلے سے طے تھا کہ دشمن کی توجہ تقسیم کرنے کے لیے ادھر سے گولاباری شروع کرادی جائے گی۔ وہ اقبال کے اشارے پر کرا دی گئی لیکن مشکل یہ تھی کہ اپنے پاس تو بیس بہت تھوڑی تھیں اس لیے گولاباری اتنی زیادہ نہیں کی جا رہی تھی جتنی ضروری تھی۔

دشمن کے پاس آرٹلری کی دو جمنٹیں تھیں۔ میڈیم توپیں بھی تھیں۔ پاکستانی توپوں کو خاموش کرنے کے لیے دشمن کی ان تمام توپوں نے گولاباری شروع کر دی۔

اقبال کا حوالدار منیر احسن دشمن کے علاقے کے اندر چلا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ پانچ جوان تھے۔ دشمن روشنی راؤنڈ فائر کر رہا تھا۔ ان کی روشنی میں اپنے آپ کو بچاتے رکنا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی ان ہنگاموں نے گرنیڈوں سے چند اور ٹرک تباہ کر دیئے اور جہاں آٹلی، اس کے پیچھے جو گرنیڈوں اور ایک لائٹ مشین گن کا فائر بھی کیا۔

اقبال کے دونوں جوان دو اور ٹینک تباہ کر چکے تھے۔ دشمن کو وہ نظر نہیں آتے تھے۔ دشمن کی مشین گنوں نے ان کی طرف لکارتا رہا بوجھاڑیں فائر کرنی شروع کر دیں۔ دشمن کو جہاں شک ہو وہاں اُس نے گرنیڈ پھینکے۔

ایک اور ٹینک دھماکے سے پھٹا۔ دشمن نے ایک کمپنی کو بلا کر اقبال اور اُس کے جوانوں کو گھیرنے میں لینے کے لیے پھیلا دیا۔ اقبال اور اُس کے ہنگامی جوانوں نے دیکھ لیا اور وہ نکلنے کی کوشش کرنے لگے لیکن نکلنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ ہر طرف گولیاں اڑ رہی تھیں۔ مشین گنوں کی ٹرلیر گولیاں آتشیں لکیروں کا جال بن رہی تھیں۔ اقبال کی پارٹی بکھر گئی تھی اور ہر جوان کو اپنے اپنے طور پر واپس آنا تھا لیکن واپسی محذو ش ہو گئی تھی۔

★

پو پھٹنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی جب پارٹی کا پہلا جوان سائیفن پہنچا۔ اُس کے بازو کے پیچھے سے کوئی گز گئی تھی جس پر اُس نے فیلڈ پی بانڈ رکھی تھی۔ بٹالین کمانڈر ابھی تک سائیفن پر کھڑا تھا۔ اس ہنگامی جوان کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے مختصر سی رپورٹ دی کہ اُسے کسی اور کے متعلق کچھ خبر نہیں۔ اُس نے اپنے راکٹ لائیچر کے علاوہ دشمن کی دو الٹیمٹس رائفیں اٹھا رکھی تھیں۔ اُسے میڈیکل آفیسر کے حوالے کر دیا گیا۔

پھر دو اور جوان آئے۔ انہیں لیٹینڈنٹ اقبال اور حوالدار منیر احسن کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ انہوں نے یہ بتایا کہ ان کا شب خون موقع سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔

ایک اور گھنٹہ گزر گیا۔ اقبال کے متعلق سب مایوس ہو گئے تھے۔ پندرہ بیس منٹ اور گزے تو اقبال آگیا۔ اُس نے کندھے پر ایک زخمی جوان کو اٹھا رکھا تھا۔ اقبال بالکل ٹھیک تھا اور جس جوان کو اُس نے اٹھا رکھا تھا، اُس کی ایک ٹانگ مشین گن کی گولیوں کی بوجھاڑ سے اس قدر زیادہ زخمی ہو گئی تھی کہ دو جگہوں سے بڑی ٹوٹ گئی تھی۔ اس ٹانگ کو اب جسم سے الگ ہونا تھا۔ بڑی جڑنے کے قابل نہیں تھی۔

حوالدار منیر احسن اور باقی جوان کبھی بھی واپس نہ آ سکے۔ وہ پاکستان کی آن پر قربان ہو گئے تھے۔

اقبال کو کمانڈنگ آفیسر نے گلے لگایا۔ اقبال نے محاذ کا سکوت توڑ دیا تھا اور اُس کی سربے بڑی کامیابی یہ تھی کہ دشمن جس حملے کی تیاری کر چکا تھا، اس حملے کا پلان تباہ ہو گیا۔

★

اقبال کی بہن شمع رات بھر سو نہیں سکی تھی۔ نرس نے اُسے فارغ کر دیا تھا۔ وہ کمیٹین عصمت کے کمرے میں چلی گئی اور سو گئی لیکن اُس نے ایسا اٹا سا خواب دیکھا کہ بڑا کراٹھ بیٹھی، پھر وہ سونے کی بجائے بے چین ہی رہتی چلی گئی اُسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ ابھی ابھی اُس نے کیا خواب دیکھا ہے۔ خواب ڈراؤنا تھا۔ دشمن پر زور دیا تو دھماکے اور آگ یاد آئی پھر اُس نے



حون دیکھا تھا... کس کا خون؟ اُسے یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اُسے رہ رہ کر اقبال یاد آ رہا تھا۔ شاید بہن کا پیار اُسے اشارہ دے رہا تھا کہ اس کا خوبصورت بھائی موت کے مُنہ میں گیا ہوا ہے۔

رات کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ وہ کمرے سے نکلی اور آہستہ آہستہ چلتی ہسپتال کے برآمدے میں پہنچ گئی۔ ہسپتال جاگ رہا تھا۔ وہ بے خیالی سی میں چلی جا رہی تھی۔ جب وہ ایک کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بیدار ہو گئی۔ زخمی لیفٹیننٹ غشی میں تھا یا گہری نیند میں۔ اُسے گلو کو زلکا ہوا تھا اور ایک نرسنگ سپاہی کمری پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ شمع کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "گلو کو زلکا یہ آخری ڈرپ ہے"۔ نرسنگ سپاہی نے کہا۔ "آدھی رہ گئی ہے۔ میڈیکل آفیسر صاحب۔ یہ کہا ہے کہ یہ ختم ہو جائے تو اتار دینا... آپ جائیں۔ آرام کریں۔"

"نہیں"۔ شمع نے کہا۔ "میں آرام کراؤں گی۔ تم اگر جانا چاہو تو چلے جاؤ"۔ شمع دوسری کمری پر بیٹھ گئی۔ "گلو کو زلکا کراؤں گا"۔ نرسنگ سپاہی نے کہا۔ "میں صاحبہ! بڑی ظالم جنگ ہے۔ آج جو زخمی آئے ہیں ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ معلوم نہیں یہاں تک زندہ کیسے پہنچے ہیں۔" "ملک کو دشمن سے بچانا ہو تو اپنے جوانوں کی یہی حالت کرانی پڑتی ہے"۔ شمع نے کہا۔ "میرا اپنا بھائی آگے ہے۔ معلوم نہیں کس حال میں ہے... یہ ابھی ہوش میں نہیں آیا؟" "یہ سو رہے ہیں"۔ نرسنگ سپاہی نے کہا۔ "ڈاکٹر نیند اور سکون کا انجکشن دے گیا ہے۔"

دو گھنٹوں بعد گلو کو زخم ختم ہو گیا۔ نرسنگ سپاہی نے زخمی لیفٹیننٹ کے بازو سے سٹونی نکال کر دہاں سپرٹ والی روئی رکھ دی۔ شمع نے آگے ہو کر روئی کو اپنی انگلی سے دبایا۔ نرسنگ سپاہی چلا گیا۔ شمع کو نیند کا ہلکا سا احساس بھی نہ رہا اور باقی رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ ہی ایک اور نرسنگ سپاہی کمرے میں آیا اور شمع کو بتایا کہ زخمی کے عزیز آئے ہیں۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک عورت اندر آئی، اس کے ساتھ ایک آدمی تھا، ان کے پیچھے ایک جوان عورت اور دو لڑکے تھے۔ عورت نے ادھر ادھر نہ دیکھا۔ وہ سیدھی زخمی پر چھٹی اور اُس کا منہ چومنے لگی۔

"میرا بچہ"۔ اس عورت نے وارفتگی سے کہا۔ "میرا چاند... میرا شیر پتر۔"

وہ زخمی لیفٹیننٹ کی ماں تھی۔ زخمی کا باپ زخمی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ شمع آگے بڑھی اور زخمی کی ماں کو پیچھے ہٹانے لگی۔

"اماں جی! اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہ سو یا ہوا ہے۔ گھبراہٹ نہیں۔ اللہ نے اس کی جان بچالی ہے۔"

ماں نے گھوم کر شمع کی طرف دیکھا تو وہ چونکی۔ شمع کو بھی دھچکہ لگا اور ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ "شمع؟"۔ ماں نے کہا اور اپنے ساتھ آئی ہوئی دوسری عورت سے کہنے لگی۔ "اری"

گلی! تو نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا؟... تم یہاں کیا کر رہی ہو شمع؟

"زخمیوں کی خدمت"۔ شمع نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اس زخمی کو پہچانتی ہو؟"۔ زخمی کی ماں نے پوچھا۔

"نہیں تو؟"

"تو کیسے پہچانے گی؟"۔ دوسری عورت نے شمع سے کہا۔ "اسی کے لیے ہم نے تیرا رشتہ لیا ہے۔ تو نے تو اسے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔"

یہی وہ لیفٹیننٹ تھا جس کے ساتھ شمع کا رشتہ طے ہوا تھا اور وہ کہتی تھی کہ کسی فوجی کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔

"ہمیں رات کو اس کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی ہے"۔ زخمی کی ماں نے کہا۔ "رات کو ہی ہم نے وزیر آباد بھارے گھر ایک آدمی کے ہاتھ پیغام بھیج دیا تھا۔ شاید بھارے ابا جان اور امی آجائیں۔"

تھوڑی ہی دیر بعد شمع کا باپ اُس کی ماں کے ساتھ آگیا۔ زخمی لیفٹیننٹ لطیف اُن کا ہونے والا داماد تھا۔ وہ صبح سویرے چل پڑے تھے۔ شمع کو اپنے منیجر کے کمرے میں دیکھ کر وہ کچھ حیران ہوئے۔

"دیکھ لے اپنے دولہا کو"۔ ماں نے شمع کے کان میں کہا۔

شمع نے زخمی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ ابھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ شمع نے دروازے کی طرف دیکھا جیسے وہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہو۔



پھینک دیا۔

”عجیب اتفاق ہے“ شمع نے کہا۔ ”سچی عصمت! مجھے تو بڑی شرم آرہی ہے۔“  
 ”کیوں؟“ کیپٹن عصمت نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ زخمی لیفٹیننٹ ہوش میں آ گیا ہے؟... معلوم ہوتا ہے اس نے... لڑکا سا ہی تو ہے وہ... تمہیں خدا نے ایسا حسن دیا ہے...“

”نہیں، نہیں“ شمع نے کہا۔ ”وہ بیچارہ تو ابھی ہوش میں نہیں آیا، ہوا یہ ہے کہ ابھی ابھی اس کے ابو، امی، خالہ اور میری امی اور ابا جان آئے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ یہی لیفٹیننٹ ہے جس کے ساتھ میرا رشتہ طے ہوا ہے... مجھے کسی اور جگہ لگا دو عصمت! شرم آتی ہے۔“  
 ”عجیب بیوقوف ہو“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”اس کے دل میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے لیے تمہیں خدا نے بڑا اچھا موقع دے دیا ہے... تم نے تو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا، کیا اس نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا ہے؟“

”نہیں“ شمع نے جواب دیا۔

”وہ ابھی ہوش میں نہیں آیا“ عصمت نے کہا۔ ”اس کے عزیز چلے جائیں گے کسی کو یہاں رہنے کی اجازت نہیں۔ اس وقت تک وہ ہوش میں نہیں آئے گا۔ تم اپنے متعلق اسے نہ بتانا۔ دیکھنا وہ تمہارے ساتھ کیسی باتیں کرتا ہے۔ اسے تپہ تو چل ہی جاتے گا۔ چلنے دو۔ اس کے ساتھ رہو۔ گھبراؤ نہیں۔“

کیپٹن عصمت نے اس سے بہت کچھ سمجھا دیا۔

”عصمت! شمع نے پوچھا۔ ”میری امی اور ابا جان سے نہیں ملو گی؟ تم ان کی بہو بن رہی ہو؟“

”مل لوں گی“ عصمت نے ایسے لہجے میں کہا جس میں خواہش اور اشتیاق نہیں تھا۔  
 ”سرد سے لہجے میں بولی۔“ تم چلو، میں آتی ہوں۔“

شمع جب لیفٹیننٹ لطیف کے کمرے میں گئی اس وقت وہ ہوش میں آچکا تھا اور بول رہا تھا لیکن اس کے بولنے کا انداز نارمل نہیں لگتا تھا۔ مال رہ رہ کر اس کا ماتھا کبھی اس کے گال چومتی اور اس سے پوچھتی تھی کہ کہیں درد تو نہیں ہو رہا مگر صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی کو پہچان نہیں رہا۔

”لطیف بیٹے! اس کی خالہ نے اسے کہا۔“ یہ شمع ہے نا وزیر آباد والے چوہدری

کرامت صاحب کی بیٹی۔“

لطیف نے شمع کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کوئی تبدیلی نہ آئی۔ شمع شرما کر اپنی ماں کے پیچھے ہو گئی۔

”ہاں، اسی جیسی لڑکیاں تھیں وہ!“ لطیف نے کہا۔ ”یہ پہلے نکل آتی ہو گی۔ حملے سے پہلے جو لوگ نہیں نکل سکے تھے ان کی لڑکیوں کو کافر اٹھا کر لے گئے ہیں۔“ لطیف کے چہرے پر مرنے کی آواز تھی۔ ”میں واپس جاؤں گا۔ قوم کی بے عزتی کا انتقام لوں گا۔“

شمع وہاں سے بھاگ ہی نکلی اور کیپٹن عصمت کو ڈھونڈنے لگی۔

محض اتفاق تھا کہ کیپٹن عصمت اسے اپنے دفتر میں بھی مل گئی۔ اسے آپریشن ٹھیٹر سے فراغت ملتی ہی نہیں تھی۔ زخمیوں کا ایک ریلوے جہاز ہی آرہا تھا۔ ہر روز ہسپتال سے ایک ڈوٹا بوت بکلتے تھے، کلمہ شہادت کی مقدس گونج ابھرتی تھی اور یہ گونج فوجی کارپوں میں ہسپتال سے نکل جاتی، پاکستان کے دیہات میں جا پہنچتی اور بلند بہت ہی بلند ہو جاتی تھی جب جنازے اٹھتے تھے تو لگتا تھا جیسے سارے علاقے کی آبادی قبرستان میں جمع ہو گئی ہو۔

”شہید زندہ ہوتے ہیں۔“

”کوئی نہیں روئے گا... کوئی نہیں روئے گا۔“

”شہید کی روح کو تکلیف ہوتی ہے۔“

”اللہ موت دے تو ایسی دے۔“

آوازیں۔ جیشیلی آوازیں۔ جذباتی آوازیں۔ سسکیاں۔ ماؤں کی بہنوں کی بیٹیوں اور بیویوں کی دبی دبی گھٹی گھٹی سسکیاں۔ ”رونا نہیں، رونا نہیں... شہید کی روح کو تکلیف ہو گی!“  
 ماتیں سسکتی بھی نہیں تھیں۔ ”میرے بچے کی روح کو تکلیف ہو گی۔“ ماؤں نے بین اور آہ و فغاں اپنے سینوں میں روک لی تھی۔ دیکھتے ہوئے انکار سے نکل لیے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس لیے جلا لیا تھا کہ ان کے شہید بچوں کی روحوں کو تکلیف نہ ہو۔

ماؤں کے تصوروں میں لمحوں کے فاصلے پیچھے کو چل پڑے تھے۔ ہر شہید کی ماں کو وہ وقت یاد آ رہا تھا جب اس کا بچہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا تھا۔ گیند پھینکتا اور اس کے پیچھے رنگتا تھا۔ پھر یہ وقت آیا جب یہ بچہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل ہی چلتا گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں گیند نہیں گرنیڈ تھا۔ جب گیند اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا تو اس کی ماں مسکرایا کرتی تھی اور جب گیند گرنیڈ بن گیا تو خدا مسکرا اٹھا۔

ماؤں کے دودھ کی دھاریں جذبہ حریت کے شعلے بن گئی تھیں۔

فوجی ہسپتالوں کے آپریشن ٹھیٹروں میں جو لوہے رہا تھا وہ اس سبیر پریم کی آبیاری کر رہا تھا جو

ہسپتالوں کی منڈیروں پر بڑی شان سے لہرا رہا تھا۔

”کیوں شمع؟“ کیپٹن عصمت نے شمع کو اپنے کمرے میں دیکھ کر پوچھا۔ ”گھبرائی گھبرائی

سی بیوی ہو؟“

شمع کی ہنسی نکل گئی۔ ”عصمت کے سامنے کبھی پڑنے لگی۔ کہنیاں میرے پر رکھ کر نہ ہاتھوں



وہ ہنس پڑا اور بولا۔ ”ہمارے ڈاکٹر بیوقوف لوگ ہیں۔ مجھے ذرا سا زخم آیا تو مجھے بیہوشی کا انجکشن لگا کر یہاں لے آئے۔۔۔ یہ سیالکوٹ ہے نا؟“

”نہ بیٹا!۔۔۔ اُس کے باپ نے کہا۔“ یہ کھاریاں ہے۔ تم سی۔ ایم۔ انجکشن میں ہو۔“

”ادھر آؤ۔“ لیفٹیننٹ لطیف نے شمع سے کہا۔

”شمع ماں کی ادھ میں ہو گئی۔“

”اجا بیٹی!۔۔۔ لطیف کی ماں نے شمع سے کہا۔

”جاشمع!۔۔۔ اُس کی اپنی ماں نے کہا۔

”اس کی حالت دیکھ شمع بیٹی!۔۔۔ لطیف کی خالہ نے شمع کا بازو پکڑ کر سرگوشی میں کہا۔“ اس میں شرمانے والی کون سی بات ہے۔۔۔ آگے ہو جاؤ۔“

”شمع بیڈ کے قریب چلی گئی۔“

”تمہارا گادول کون سا تھا؟۔۔۔ لیفٹیننٹ لطیف نے شمع سے پوچھا۔“ چونڈہ سے آگے

بار در پر ہو گا۔“

”بیٹا!۔۔۔ لطیف نے اُس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔“ یہ شمع ہے۔۔۔“

”قبال کی بہن۔۔۔ وزیر آباد والے چوہدری کرامت صاحب کی بڑی بیٹی!۔۔۔ لیفٹیننٹ اقبال یاد نہیں آ رہا؟“

چوہدری کرامت لطیف کے بیڈ کے قریب بیچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ لطیف کے منہ کی

طرف ہو گیا۔

”مجھے نہیں جانتے لطفی بیٹا!۔۔۔ چوہدری کرامت نے پیار سے پوچھا۔“

”السلام علیکم چوہدری صاحب!۔۔۔ لیفٹیننٹ لطیف نے دایاں ہاتھ چوہدری کرامت کی

طرف بڑھا کر کہا۔ ”آپ بزرگ ہیں۔ ان لوگوں سے کہیں مجھے جانے دیں۔ اگر ذرا سے زخمیوں

کی وجہ سے یہ افسروں اور جوانوں کو محاذوں سے اٹھا اٹھا کر لاتے رہے تو وہاں لڑنے کے لیے

کون رہ جائے گا؟“

”تمہارے زخم ذرا ذرا سے تو نہیں لطفی!۔۔۔ چوہدری کرامت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں، نہیں۔“ کمرے کے دروازے سے آواز آئی۔ ”آپ سب اس پر گھر سے ہوتے

کیوں ہیں!۔۔۔ پلیز۔۔۔ پیچھے ہو کر بیٹھ جائیں۔“

سب نے دیکھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر سولیں ڈاکٹر تھا۔ جنگ کے دوران کئی سولیں ڈاکٹروں

نے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر فوج کو پیش کر دی تھیں۔ یہ ان ڈاکٹروں میں سے ایک تھا۔ وہ

زخمیوں کو دیکھتا پھر رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ لطیف کے لواحقین اُسے زمرے میں لیے ہوئے

اُس کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔

”اس کا دم گھٹ جائے گا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”ذرا دیکھیں، گرمی کتنی ہے۔۔۔ اس کے ساتھ

ابھی زیادہ باتیں بھی نہ کریں۔“

”ڈاکٹر صاحب!۔۔۔ لیفٹیننٹ لطیف کے باپ نے دکھاری سی آواز میں کہا۔“ میں

اس کا باپ ہوں۔ یہ ہوش میں ہے۔ باتیں بھی صحیح کرتا ہے لیکن ہمیں پہچانتا نہیں۔ شاید اس کا

دماغ چوٹ سے۔۔۔“

”نہیں محترم!۔۔۔ ڈاکٹر سب کو کمرے سے باہر لے گیا اور انہیں بتایا۔“ اس کا دماغ

بالکل ٹھیک ہے۔ یہ استھیا کا اثر اتر رہا ہے۔ یہ وہ دوائی ہوتی ہے جو آپریشن سے پہلے مریض

کو بیہوش کرنے کے لئے انجکشن کے ذریعے دی جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے مسلسل بیہوشی یا نیند

میں رکھنے کے لیے دوائیاں دی جاتی رہی ہیں۔ یہ ان دوائیوں کے اثرات ہیں۔ جب ان کا

نشہ اتر رہا ہوتا ہے تو مریض اسی طرح باتیں کرتا ہے جیسے آپ کا بیٹا کر رہا ہے۔ سننے والے

سمجھتے ہیں کہ مریض ہوش میں ہے لیکن وہ مکمل طور پر ہوش میں نہیں ہوتا۔“

”ڈاکٹر صاحب!۔۔۔ لطیف کی ماں نے پوچھا۔“ کوئی خطرے والی بات تو نہیں؟“

”نہیں میری بہن!۔۔۔ ڈاکٹر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔“ بالکل نہیں خطرہ مل گیا ہے۔ آپ

میں سے کسی کو بھی اس کے کمرے میں نہیں رہنا چاہیے۔ آپ سب اسے دیکھ کر پریشان

ہوتے رہیں گے اور یہ آپ کو دیکھ دیکھ کر تذبذب میں مبتلا ہو جائے گا۔ آپ اس کے ساتھ باتیں

کرتے رہیں گے اور یہ بولتا رہے گا۔ یہ اس کے لیے ٹھیک نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ چلے

جائیں اور پرسوں صبح اسے آکر دیکھیں۔ اُس وقت تک یہ ذہنی طور پر نارمل حالت میں آچکا ہو گا۔“

”اتفاق کی بات ہے ڈاکٹر صاحب!۔۔۔ چوہدری کرامت نے شمع کے متعلق کہا۔“ یہ ہماری

اپنی بچی ہے۔۔۔ میری بیٹی ہے۔“

”یہ تو رضا کارانہ طور پر کام کر رہی ہے نا!۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا۔“ یہ تو اور اچھا ہے۔ ہم نے

اسے اسی کمرے کی ڈیوٹی دے دی ہے۔۔۔ اچھا، اللہ آپ کے بچے کی یہ قربانی قبول کرے۔“

اس کے متعلق آپ بے فکر ہو جائیں اور چلے جائیں۔ اللہ نے اسے نئی زندگی دے لی ہے۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد ان سب نے پھر لیفٹیننٹ لطیف پر دھاوا بول دیا۔ اُس کی ماں

خالہ اور شمع کی ماں اُس کا منہ یوں چوم رہی تھیں جیسے اُسے چاٹ ہی لیں گی۔ لطیف نے

اپنے باپ اور شمع کے باپ سے ہاتھ ملا یا۔

”تم لوگ پیچھے چلے جاؤ۔“ لطیف نے انہیں کہا۔ ”پیچھے ہماری آرٹلری ہے۔ اس سے

بھی دور پیچھے چلے جانا۔ بہتر ہے تم لوگ سیالکوٹ چلے جاؤ۔“

وہ سب باہر نکل آئے۔



شمع اپنی ماں اور اپنے باپ کو پر سے لے گئی۔

”اباجان!۔۔۔ شمع نے کہا۔“ آپ پہلی بار یہاں آئے تھے تو نرسوں کی ایک افسر

کیپٹن عصمت سے ملے تھے۔۔۔ اُس کے پاس اقبال بھائی جان کی فوٹو ہے۔ وہ کہتی ہے کہ

وہ بھائی جان کے ساتھ شادی کرے گی اور انہوں نے یہ شادی کچی طے کر رکھی ہے۔۔۔ اُمی جان!



”وہ بھی نوجوان ہے“ — شمع کو خیال آیا — ”اور یہ بھی نوجوان ہے۔ دونوں کی مائیں ایک جیسی ہیں اور دونوں کے باپ بھی ایک جیسے ہیں مگر ان دونوں لڑکوں میں کتنا فرق ہے“  
 شمع کو یہ سمجھنا اور پریشان کرنے لگا کہ رشید جیسے گھٹیا لڑکے کے ساتھ فلموں جیسی محبت کر کے وہ کتنی ذلیل ہوئی ہے۔

”اگر قوم کے سارے نوجوان رشید جیسے ہوتے تو آج کھاریاں چھاؤنی میں ہندوستانی فوج گھوم پھر رہی ہوتی“ — شمع نے سوچا اور اُس نے اپنے جسم میں لرزہ سا محسوس کیا۔

اس قسم کے خیالوں اور تصوروں کا ایک ریل اُس کے ذہن میں آیا اور وہ ایک تینکے کی طرح اڑنے اور بھٹکنے لگی۔ پھر اُس کا خون کھولنے لگا۔ وہ اُس وقت چونکی جب اُس نے دیکھا کہ اُس کا ایک ہاتھ سوتے ہوئے لیٹینڈٹ لطیف کے نننگے بازو پر رینگ رہا ہے۔ اُس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”اگر یہ شخص محاذ سے اندھا ہو کر آتا“ — شمع نے اپنے آپ سے کہا — ”ٹانگوں اور بازوؤں سے بھی محروم ہو جاتا تو بھی میں اسے ساری عمر کی رفاقت کے لیے قبول کر لیتی۔“

★

دن گزر گیا۔ شمع نے لطیف کو دو مرتبہ دوائیاں دیں جو ڈاکٹر دے گیا تھا۔ شام کو لطیف نے خود شمع سے کہا کہ وہ بیٹھ کر کچھ کھانا چاہتا ہے۔ شمع نے اُس کے پاس بیٹھ کر بازو اُس کی گردن کے نیچے رکھا اور اُسے اس طرح بٹھا دیا کہ خود اُس کے پیچھے بیٹھ گئی اور اُس کی پیٹھ اپنے ساتھ لگا لی۔

”تم اس ہسپتال میں ملازم ہو؟“ — لطیف نے شمع سے پوچھا۔  
 ”نہیں“ — شمع نے جواب دیا — ”دوسری بہت سی لڑکیوں کی طرح میں بھی یہاں رضا کارانہ طور پر کام کرنے آئی ہوں۔“  
 ”کہاں کی رہنے والی ہو؟“

”تم خود ہی کہتے تھے کہ میں چونڈہ سے آگے کے کسی گاؤں کی رہنے والی ہوں۔“  
 شمع نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

”میں نے؟“ — لطیف نے حیران سا ہو کر پوچھا اور شمع کی طرف دیکھا جو اُس کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں کے منہ اس قدر قریب ہو گئے کہ اُن کی سانسیں ٹکرائے لگیں۔  
 لطیف نے کہا — ”میں نے کب کہا تھا؟ میں تو تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔۔۔ تم دیہاتی تو نہیں لگتی۔“  
 ”میں وزیر آباد کی رہنے والی ہوں۔“

”نام کیا ہے تمہارا؟“ — لطیف نے پوچھا۔

”ناہید“ — شمع نے جھوٹ بولا۔

”لٹا دو مجھے“ — لطیف نے کہا۔

”کیوں؟“ — شمع نے پوچھا۔ ”تکلیف ہوتی ہے؟“

آپ بھی اس سے مل لیں اور دیکھ لیں۔ بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔“  
 ”نہ شمع؟“ — ماں بولی — ”یہ کیسے ہو سکتا ہے امیراجائی کب سے اُس لگائے بیٹھا ہے۔“

اُس نے تو یہ سچی کر رکھی ہے کہ اپنی بیٹی اقبال کو لے گا۔“  
 ”بلکہ لے چکا ہے۔“ — شمع کے باپ نے کہا — ”ہم خون کے رشتوں کو تو نہیں ٹھکرا سکتے۔“

اتنے میں کیپٹن عصمت آگئی۔  
 ”عصمت! — شمع نے کہا — ”ابا جان سے تو تم پہلے ہی مل چکی ہو۔ ان سے ملو۔ یہ میری امی ہیں۔“

کیپٹن عصمت انہیں اس طرح ملی جیسے ان لوگوں کے ساتھ اُسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اُس نے مختصر سی جوا ایک دو باتیں اُن سے کہیں اُن میں محض رسمی پن اور تصنع تھا۔ وہ شمع کے باپ سے معذرت کر کے چلی گئی۔

”نہ جی نہ“ — شمع کی ماں نے کہا — ”میں گھر میں ہولادوں کی ہمیں افسر نہیں چاہتی۔ اس نے تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔“

”میرے ساتھ تو اس کا سلوک بہت ہی اچھا ہے۔“ — شمع نے کہا۔  
 ”تم اس کے ساتھ اچھا سلوک رکھو۔“ — چوہدری کرامت نے کہا — ”صرف یہ خیال رکھنا کہ یہ اپنی شادی کی کوئی بات کرے تو تم ہاں میں ہاں ملائی چلی جانا، کوئی اور بات نہ کرنا۔“  
 کچھ دیر بعد سب لوگ چلے گئے۔ لطیف کی ماں نے جانے سے پہلے شمع کو گلے لگا کر کہا کہ وہ لطیف کا بہت خیال رکھے۔

شمع آہستہ آہستہ لیٹینڈٹ لطیف کے کمرے میں گئی۔ لطیف گہری نیند سو رہا تھا اور ایک نرس اُس کے بازو سے بلڈ پریشر کے آلے کی پٹی کھول رہی تھی۔  
 ”کیسا ہے؟“

”بلڈ پریشر بالکل نارمل ہے۔“ — نرس نے جواب دیا — ”سوچتی ہوں کتنے خوبصورت جوان اپنے وطن پر قربان ہو رہے ہیں۔“

”سِسٹر! — شمع نے اُس سے پوچھا — ”اُس میں کوئی مستقل جسمانی نقص تو نہیں رہ جائے گا؟“

”نہیں“ — نرس نے جواب دیا — ”زیادہ شدید زخم ٹانگ کا تھا۔ دو یا غالباً تین جگہوں سے بڑی ٹوٹ گئی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ بڑی ٹھیک جڑ گئی ہے۔۔۔ معلوم ہوتا ہے یہ تھکرا کوئی عزیز ہے!“

”ہاں“ — شمع نے کہا — ”عزیز ہی سمجھو۔“  
 شمع لطیف کے بیڈ کے پاس پڑے ہوئے بیچ پر بیٹھ گئی اور اُس کی نظریں لطیف کے چہرے پر جم گئیں۔ اُسے رشید کا چہرہ یاد آگیا۔ اُس نے لاشعوری طور پر سر کو زور زور سے دائیں بائیں ہلایا جیسے رشید کے تصور کو ذہن سے نکال پھینکنے کی کوشش کی ہو۔



”ہاں“ — لطیف نے جواب دیا — ”تکلیف تو ہوتی ہی ہے لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا کہ ایک نوجوان لڑکی کے بازوؤں میں بیٹھوں۔“

”میں نے تو کوئی ایسی بات محسوس نہیں کی“ — شمع نے کہا — ”اگر تمہیں اس طرح بیٹھ کر آرام محسوس ہوتا ہے تو بیٹھے رہو۔“

”نہیں ناہید!“ — لطیف نے کہا — ”مجھے ابھی آرام کی ضرورت نہیں اور مجھے کسی کے سہارے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری رضا کارانہ خدمت کو رد کر رہا ہوں میں تمہارے جذبے کی داد دیتا ہوں.... مجھے لہذا ناہید!“

شمع نے سہارا دے کر اُسے لٹا دیا اور اُس سے پوچھا کہ وہ کیا کھانا چاہتا ہے لطیف نے کہا کہ کوئی فروٹ ہو تو دے دو ناہید نے اٹھ کر انگور کی پلیٹ اُس کے قریب رکھ دی لوگوں نے ہسپتالوں میں فروٹ کے توانبار لگا دیتے تھے۔

”ناہید!“ — لطیف نے انگور کھاتے ہوئے شمع سے پوچھا — ”چوہدری کراست علی کو جانتی ہو؟.... وزیر آباد کے رہنے والے ہیں۔ اُن کا ایک بیٹا اقبال لیفٹیننٹ ہے۔“

”ہاں جانتی ہوں“ — شمع نے جواب دیا — ”وہ ہمارے ساتھ والی گلی میں رہتے ہیں.... وہ تمہارے کچھ لگتے ہیں؟“

”ہاں“ — لیفٹیننٹ نے جواب دیا اور پوچھا — ”پھر تو تم اُن کی بیٹی شمع کو جانتی ہوگی۔“

”ہاں“ — شمع نے جواب دیا — ”اچھی طرح جانتی ہوں۔ سکول میں بھی اور کالج میں بھی میری کلاس فیلو رہی ہے.... کیوں تم کیوں پوچھتے ہو؟“

”کیسی لڑکی ہے؟“ — لیفٹیننٹ لطیف نے پوچھا اور ذرا سوچ کر بولا — ”میرے ماں باپ اُس کے ساتھ میرا رشتہ بچا کر چکے ہیں۔“

”اگر میری رائے لیتے ہو تو تمہیں مایوسی ہوگی“ — شمع نے کہا۔

”کیوں؟“ — لطیف نے پوچھا — ”کوئی خرابی ہے؟.... میرا مطلب ہے چال چلن....“

”نہیں“ — شمع نے جواب دیا — ”چال چلن کی تو اچھی ہے شکل و صورت کی ویسی ہی ہے.... تمہارے قابل نہیں۔“

”میری امی اور خالہ نے اُسے دیکھا ہے“ — لطیف نے کہا — ”وہ کہتی ہیں شمع بہت خوبصورت ہے!“

”وہ پھر کوئی اور شمع ہوگی“ — شمع نے کہا — ”اچھا یہ بتاؤ.... تمہیں معلوم نہیں کہ تمہاری امی، خالہ اور تمہارے والد صاحب، شمع کے والد چوہدری کراست اور شمع کی امی آج صبح تمہیں دیکھنے آئی تھیں؟ تم اُن کے ساتھ باتیں کرتے رہے تھے؟“

”نہیں تو“ — لیفٹیننٹ لطیف نے کہا — ”مجھے کچھ بھی یاد نہیں.... اچھا تو شمع کے ابا اور امی بھی مجھے دیکھنے آتے تھے!“

”کیا تم یہ سن کر مایوس نہیں ہوئے کہ شمع خوبصورت لڑکی نہیں؟“ — شمع نے پوچھا۔

”نہیں ناہید!“ — لطیف نے آہ لے کر کہا — ”چھتمبر سے پہلے کی بات کچھ اور تھی۔ اُس وقت تک تو میری اور میرے دوستوں کی حالت یہ تھی کہ فلی رسالوں میں ایڈیٹریوں کے فوٹو دیکھ کر ہم کہا کرتے تھے کہ فلاں ایڈیٹر جیسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ شادی کریں گے مگر اب خدا کی قسم ناہید! کوئی معذور اور بد صورت لڑکی مل گئی تو اُسے بھی قبول کر لوں گا۔“

”اب کیا ہو گیا ہے؟“

”ہوا یہ ہے ناہید!“ — لیفٹیننٹ لطیف نے آہ بھری اور کہا — ”اب یہ ہوا ہے کہ میں نے عورت کو بہت بُری مظلومیت میں دیکھا ہے۔ سرحدی دیہات کی جوان لڑکیوں کے ساتھ ہمارے دشمن نے جو سلوک کیا ہے، وہ میں سنا نہیں سکتا۔ سناؤں گا تو تم سن نہیں سکو گی۔ پہلے چلے میں تو دشمن نے بہت سے دیہات پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہم نے جوابی حملہ کر کے اپنے کئی گروں دشمن سے واپس لے لیے۔ ہم نے وہاں جوان پاکستانی لڑکیوں کی رہنمائی لاشیں دکھیں۔ بعض لڑکیوں کو دشمن اپنے ساتھ لے گیا تھا....“

”ہندو جنگجو قوم نہیں اس لیے اُن کا کردار بھی کوئی نہیں۔ لڑکیوں اور بچوں کا کیا قصور تھا؟.... ہم فوجی لوگ محاذوں پر اپنی قوم کی عصمت پر کٹ رہے ہیں۔“ — لطیف نے آہ بھری اور سانسوں کو سنبھالتے ہوئے بولا — ”جوان عورت کے متعلق، تم جیسی لڑکیوں کے متعلق میرے خیالات بدل گئے ہیں۔ دماغ میں جب ملک اور قوم کی عظمت سما جاتی ہے تو دماغ میں بالکل صحیح سوچیں آنے لگتی ہیں۔ تم جس شمع کو خوبصورت نہیں سمجھتیں اُسے میری نظروں سے دیکھو۔ اُسے اُس مرد کی نظروں سے دیکھو جس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا ہو جس نے اپنے مذہب اور اپنے ملک کے دشمن کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہو۔“

”لطیف!“ — شمع نے لطیف کے ماتھے پر آئے ہوئے بالوں کو اپنے ماتھے سے پیچھے کرتے ہوئے کہا — ”زیادہ باتیں نہ کرو۔ ایسی جوشیلی اور جذباتی باتیں نہ کرو کہ تمہارا خون جوش میں آجائے۔ مجھے اسی لیے تمہارے کمرے میں رکھا گیا ہے کہ ڈاکٹروں کی ہدایات وغیرہ کے مطابق تمہاری دیکھ بھال کروں۔ آرام کرو۔“

”مجھے بولنے دو ناہید!“ — لیفٹیننٹ لطیف نے جذباتی سے لہجے میں کہا — ”مجھے باتیں تو کر لینے دو.... زخمی ہونے کی بجائے میں مر جاتا تو اچھا تھا۔ یہ غم تو نہ ہوتا کہ میں زندہ یہاں لیٹا ہوا ہوں اور میرے ساتھی آگے لڑ رہے ہیں۔“

”کیا تم اپنا فرض ادا نہیں کر چکے؟“ — شمع نے کہا — ”تم اتنی بُری طرح زخمی ہوئے ہو کہ دوسرے زخموں کے علاوہ تمہاری ایک ٹانگ تین جگہوں سے ٹوٹی ہوئی ہے۔“

”لیکن ناہید!“ — لطیف نے کہا — ”میں تو پورے کا پورا قربان ہونے گیا تھا.... میں نے وہاں جو دیکھا ہے اسے میں کیسے بھول سکوں گا۔ میں نے انتقام نہیں لیا۔“

”انتقام لینے کے لیے پوری فوج موجود ہے“ — شمع نے کہا۔

”جو میں نے دیکھا ہے وہ پوری فوج نے نہیں دیکھا“ — لطیف نے کہا — ”وہ میں تمہیں



سناتا ہوں۔ چونکہ میں جو لڑائی ہو رہی ہے، وہ یوں سمجھو کہ اُدھر ٹینک ہیں اور اُدھر انسان ہیں۔ پاکستان کے پاس اتنے ٹینک ہیں ہی نہیں کہ وہ دشمن کے اتنے زیادہ ٹینکوں کی یلغار کو روکتے۔ بیٹھوں کا کام مجھ جیسے انسان کو رہتا ہے۔۔۔ ناہید اتم نہیں سمجھ سکتیں کہ ٹینک کیسا ہوتا ہے۔

”میں نے ٹینک دیکھے ہیں۔“ شمع نے کہا۔ ”ریل گاڑی پر لاہور کی طرف لے جاتے جا رہے تھے۔ یہ تو بڑی ہیبت ناک چیز ہوتی ہے۔“

”ٹینک تو ہے کا قلعہ ہوتا ہے ناہید اتم۔ لیفٹیننٹ لطیف نے کہا۔ ”یہ گو لے اور گولیاں اگلتا ہے۔ ٹینک کو ٹینک ہی توڑ سکتا ہے، لیکن ہمارے جوانوں نے راکٹ لانچروں سے۔۔۔ نہیں ناہید اتم نہیں سمجھ سکتیں۔ یہ فوجی باتیں ہیں اور یہ جذبے کی باتیں ہیں۔ تم بڑھے لکھی لڑکی ہو۔ اتنی سی بات سمجھ لو کہ ہم جذبہ صریت اور شجاعت کی ایسی روایت قائم کر رہے ہیں جسے تاریخ اپنے دامن میں ڈالنے سے بھی گھبرائے گی۔ ہم اپنی آنے والی نسلوں کے لیے یہ روایت چھوڑ جائیں گے کہ تمہارے جذبہ حب الوطنی اور شجاعت کا معیار یہ ہو گا تو دشمن سے اپنے مذہب اور اپنے ملک کے وقار کو بچا سکو گے۔“

”تم نے پھر جوشیلی اور جذباتی باتیں شروع کر دی ہیں۔“ شمع نے کہا۔ اُس کے انداز میں دوستانہ سی بے تکلفی تھی۔

”کیا یہ باتیں تمہیں اچھی نہیں لگتی؟“

”مجھے تو اچھی لگتی ہیں۔“ شمع نے جواب دیا۔ ”تمہارے لیے اچھی نہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہیں غنودگی آرہی ہے اور تم زبردستی بولے جا رہے ہو۔۔۔ میں تو کہتی ہوں کہ مجھے ہی باتیں سناتے رہو اور اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے ساتھ محاذ پر لے چلو۔“

”ابھی ہم زندہ ہیں۔“ لطیف نے کہا۔ ”میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا دشمن جو ہمیشہ ہمارا دشمن رہے گا بہت اوجھا اور کمینہ ہے۔ اُس کا پہلا حملہ سننے دیہاتیوں اور اُن کی عورتوں پر ہوتا ہے۔ ہمارے دشمن نے چونکہ سیکڑ میں ایک ایسی حرکت بھی کی ہے جسے دنیا کی کوڑی قوم شاید سچ نہیں مانے گی۔“

”نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔“ شمع نے کہا۔

”یہ تو انہوں نے کیا ہی ہے۔ لیفٹیننٹ لطیف نے کہا۔ ”انہوں نے ہمارے سرحدی دیہات کی بہت سی عورتوں اور اُن کے بچوں کو اپنے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جنگ کا تیسرا چوتھا روز تھا۔ چونکہ سیکڑ میں پھلو اور گدگور دو گاؤں ہیں۔ ہم نے دشمن پر جوابی حملہ کیا تو میری بٹالین اپنے ٹینکوں کے ساتھ آگے بڑھی۔ زمین اور آسمان گولوں اور گولیوں کے دھماکوں سے پھٹ رہے تھے۔ اچانک ہمیں فائر بند کرنے کا حکم ملا۔۔۔“

”تم نہیں سمجھ سکتیں کہ ٹینک اور پیادہ کمپنیاں کس طرح پیش قدمی کیا کرتی ہیں۔ میں تمہیں وہ بات سناتا ہوں جو تم سمجھ سکتی ہو۔ ہمیں جب فائر روکنے کا حکم ملا اور جب دیکھا کہ ہمارے ٹینک بھی رک گئے ہیں تو ہم صرف حیران ہی نہ ہوئے بلکہ ہمیں غصہ آ گیا کہ اتنا تیز حملہ کیوں روک

لیا گیا ہے۔ جوانوں نے پولیشیں لے لیں۔ دشمن کی طرف سے فائر آرہا تھا۔ میں چونکہ آفیسر ہوں اس لیے میں اُدھر اُدھر ہو سکتا تھا اور میرے پاس دُور بین بھی تھی۔ میں نے دُور بین سے دیکھا۔ دشمن نے اپنے مورچوں کے سامنے ہمارے دیہات کی عورتوں اور بچوں کو کھڑا کر رکھا تھا اور اُن کے درمیان مشین گنیں رکھ کر وہ ہم پر فائر کر رہے تھے۔ ہمارے کمانڈر کو معلوم تھا کہ یہ ہماری عورتیں اور ہمارے ہی بچے ہیں جنہیں ان کافروں نے پہلے ہی بٹے میں پکڑ کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔“

”انہوں نے ان بے چاریوں کو اسی مقصد کے لیے اپنے پاس رکھا ہوگا۔“ شمع نے کہا۔

”بندہ کا پہلا حملہ عورت اور بچے پر ہوتا ہے۔“ لطیف نے کہا۔ ”انہیں قیدی بنا کر اُن بدبختوں نے انہیں اپنی ڈھال بنا لیا۔ ان عورتوں اور بچوں میں چند ایک آدمی بھی تھے۔ انہوں نے چلا چلا کر ہمیں کہا کہ آگے آؤ۔ فائر مست روکو۔ ہماری پروا نہ کرو، لیکن ناہید اتم انسانی فطرت ایسی ہے کہ ضرورت ہو تو بھی اپنی مستورات اور بچوں کو کون اپنی گولیوں کا نشانہ بنا سکتا ہے۔“ لطیف کو ہنسی سی آتی اور وہ خاموش ہو گیا۔

”پھر کیا ہوا لطیف؟“ شمع نے پوچھا۔

لیفٹیننٹ لطیف کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ بے ہوش نہیں ہو گیا تھا، وہ سو بھی نہیں گیا تھا لیکن اُس کی آنکھوں اور اُس کے چہرے کا تاثر بنا رہا تھا کہ اُس کا جسم ہسپتال کے اس کمرے میں ہے لیکن اس کی رُوح وہیں جا پہنچی ہے جہاں دشمن نے ہماری عورتوں اور بچوں کو اپنی ڈھال بنایا تھا۔ شمع نے اُس کے ایک گال پر ہلکی سی ہتھکی دے کر اُسے بیدار کرنے کی کوشش کی۔

”بولو نا لطیف!۔“ شمع نے کہا۔ ”پھر کیا ہوا تھا؟“

”وہی ہوا تھا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ لطیف نے دبی دبی سی آواز میں کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ”ہم حملہ روک نہیں سکتے تھے۔ ہمیں یہ قربانی دینی پڑی۔ ہمارے ٹینکوں نے اور ہماری مشین گنوں نے آگ اگنی شروع کر دی۔ دشمن پسا ہو گیا۔ ہم جب وہاں پہنچے تو دشمن کی لاشوں کے ساتھ اُن تمام مستورات اور اُن کے بچوں کی لاشیں پڑی تھیں۔۔۔“

”ان عورتوں اور بچوں کی لاشیں دیکھ کر ہم سب پاگل سے ہو گئے۔ اس کے بعد ہم نے جو معرکہ لڑا وہ تم نہیں سمجھ سکو گی۔ یہ چونکہ سیکڑ کی بڑی ہی خونریز لڑائی تھی۔ تم اسے جذبہ کموگی، لیکن میں اسے جذبے کا پاگل پن کہتا ہوں۔ پاگل ہوتے ہوتے ہم پوری طرح ہوش میں تھے۔ میدان جنگ کا ڈسپلن قائم تھا اور ہم آسمان سے گرنے والی بم کی بن گئے تھے۔ اس جذبے کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ ہم نے دشمن سے گدگور گاؤں چھین لیا۔ اگر رات نہ آجاتی تو ہم اور آگے نکل جاتے۔ میں کچھ زیادہ ہی آگے چلا گیا تھا۔ میرے جوان ابھی اور آگے جانا چاہتے تھے۔ دشمن کے کسی ٹینک نے ہماری پولیشن دیکھ لی۔ یکے بعد دیگرے اُس کی توپ کے تین گولے آئے۔ تیسرا گولہ میرے قریب پھٹا۔۔۔“

”میں گر پڑا۔ خدا کی قسم ناہید اتم، مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ میں اتنا زخمی ہو گیا ہوں جتنا تم مجھے دیکھ رہی ہو۔ میں اٹھا لیکن میری یہ ٹانگ جو ٹوٹی ہوئی ہے میرے پیچھے دوہری ہو گئی اور میں گر پڑا۔ تب میں



نے دیکھا کہ گولے کے ٹکڑے میری ٹانگ کی ہڈی کو دو تین جگہوں سے کاٹ گئے تھے۔ ایک ٹکڑے نے پیٹ بھی چیر دیا۔ ایک ٹکڑا باتیں پہلو میں لگا۔ میں پوری طرح ہوش میں رہا۔ جب مجھے ٹریجر پر ڈالنے لگے تو بھی میں ہوش میں تھا۔ میں بہت چپکا کہ مجھے پیچھے نہ لے جاؤ لیکن میرے کمپنی کمانڈر نے غصے میں کہا ”لطفی، پیچھے جاؤ۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔“

شمع بھی جیسے محاذ پر پہنچ گئی تھی۔ لیفٹیننٹ لطیف کی ایک سسکی نے اُسے بیدار کر دیا۔ اُس نے دیکھا کہ لطیف کی آنکھوں کے کونوں سے آنسو بہے جا رہے تھے اور وہ سسک رہا تھا۔ شمع دوپٹے سے اُس کے آنسو پونچھنے لگی۔

★

برصغیر کی تاریخ ہمیشہ گواہی دیتی رہے گی کہ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے تیسرے ہی روز بھارت کا اُس وقت کا وزیراعظم لال بہادر شاستری بلبلاتا تھا کہ بھارت ابھی، اسی وقت فاتر بندی کرنے کو تیار ہے۔ یہ برہمن کی خریب کاری کا مظاہرہ تھا۔ رن کچھ کی جنگ میں بھی اُس نے اُسی وقت فاتر بندی کی پیشکش کر دی تھی جب اُس کا پورا ڈویژن پاکستان کے ایک بریگیڈ کے گھیرے میں آگیا تھا اور پاکستان نے فاتر بندی قبول کر لی تھی۔

برہمن نے اپنے ڈویژن کو بچا کر اعلان کیا تھا۔ ”اب ہم پاکستان کو اپنی پسند کے میدان میں لڑائیں گے۔“ لال بہادر شاستری نے یہ اعلان کھیم کرن کے ڈاک بنگلے میں بیٹھ کر اخباری نمائندوں کے سامنے کیا تھا۔ پھر چند ہی روز بعد بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ کھیم کرن کا وہی ڈاک بنگلہ تھا جس میں چند روز پہلے شاستری نے پاکستان کو لاکھارا تھا مگر اب اس ڈاک بنگلے میں پاک فوج کے افسر بیٹھے ہوتے تھے اور کھیم کرن پر پاک فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔ شاستری اب پھر فاتر بندی کی بھیک مانگ رہا تھا لیکن پاکستان مان نہیں رہا تھا۔

آخر بھارت کی درخواست پر اقوام متحدہ نے فاتر بندی کی بات چیت شروع کر دی اور پاکستانی نیم رضامندی تک پہنچ گیا۔ جب بھارت کی سیاسی اور فوجی قیادت نے دیکھا کہ فاتر بندی جلدی ہو جاتے گی تو اُس نے قصور کھیم کرن اور لاہور سیکڑوں کو کمک دے کر فوج کو یہ حکم دیا کہ فاتر بندی سے پہلے پہلے زوردار حملہ کر کے بی آر بی پارکو اور کچھ علاقہ قبضے میں لے لو تاکہ پاکستان پر اپنی شرائط مسلط کی جا سکیں۔ مثلاً لاہور کے متعلق بھارتی حکومت کے احکام یہ تھے کہ شالامار تک پہنچ جاؤ۔ یہ تھی برہمن کی صحیح ذہنیت کہ ایک طرف فاتر بندی کے لیے واویلہ اور دوسری طرف پاکستانی علاقے پر قبضہ کرنے کی کوشش۔

ان احکام پر انڈین آرمی نے جب عمل شروع کیا تو محاذوں پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی دشمن نے سب سے زیادہ دباؤ لاہور پر ڈالا تاکہ بی آر بی نہر پار کر سکے۔ پھر قصور کھیم کرن سیکڑ پر بے تحاشہ دباؤ ڈالا تاکہ پاک فوج سے کھیم کرن واپس لے سکے۔

بیدیاں سیکڑ بھی ان تازہ حملوں کی زد میں آگیا۔ بیدیاں سائیفن جو نہر عبور کرنے کے کام آسکتا تھا محفوظ تھا۔ پاک فوج کے جوڑ واپس اس سیکڑ میں تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ

دشمن مزید کمک لارہا ہے اور وہ پوزیشنیں بھی مضبوط کر رہا ہے۔ دشمن کے اجتماع کو لیفٹیننٹ اقبال نے اپنے چند ایک جوانوں کے ساتھ کمانڈو آپریشن سے درہم برہم کر دیا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ دشمن کے حملے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ اب دشمن کو وہاں مزید کمک مل گئی تھی۔ آگے سے جو رپورٹیں ”بنگال ٹائیگرز“ کے کمانڈنگ آفیسر کے پاس آرہی تھیں، خاصی تشویشناک تھیں۔ تشویش یہ تھی کہ پاکستان کے پاس کمک نہیں تھی۔ بیدیاں سیکڑ میں تو پٹانے میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کمانڈنگ آفیسر نے بریگیڈ کمانڈر کے حکم سے سائیفن کے پار برج ہیڈ ہانے کی ڈیوٹی لیفٹیننٹ اقبال کی کمپنی کے سپرد کی۔ اس کمپنی کی دو پلاٹونوں کو سائیفن کے پار جا کر مورچے قائم کرنے تھے۔ ایک پلاٹون لیفٹیننٹ اقبال کی تھی۔

رات کے وقت دونوں پلاٹونیں خاموشی سے سائیفن سے گزر کر آگے چلی گئیں اور انہوں نے وہی پوزیشنیں سنبھال لیں جو ابتدائی دنوں میں خالی کر دی گئی تھیں۔ اقبال کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ رات کو کمپنی کمانڈر اور ہٹالین کمانڈر پوزیشنیں دیکھنے آئے۔ انہوں نے جوانوں کے حوصلے بڑھائے اور واپس چلے گئے۔

★

”اس رات بھی مورچوں میں ایک آدھ سیکڑ کے لیے بھی کسی کی آنکھ نہ لگی۔ افسروں اور جوانوں کے جسم چھنا چور ہو چکے تھے۔ اب تو وہ اپنی روحانی طاقت سے مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔ دشمن کا حملہ کسی بھی وقت متوقع تھا لیکن کسی کو یہ گمان تک نہ تھا کہ ایک دو گھنٹوں بعد ہی حملہ شروع ہو جائے گا۔ صبح کا ذب سے ذرا ہی بعد دشمن کی کم و بیش اڑھائی سو چھوٹی بڑی توپوں کے دھانے کھل گئے۔ یہ بڑی تیز اور بڑی شدید گولہ باری تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حملہ آ رہا ہے۔ بنگالیوں کے نعرے توپوں کے دھانوں کی طرح گر جتے لگے۔ ان نعروں میں قرا و غصب تھا توپوں کے گولے نہر کے اوپر سے گزر کر پچھلے مورچوں پر گر رہے تھے۔ دشمن کو معلوم نہیں تھا کہ سائیفن کے آگے برج ہیڈ کے مورچے ہیں۔

لیفٹیننٹ اقبال، نائب صوبیدار بدراحتی، دوسری پلاٹون کا پلاٹون کمانڈر اور اُس کا صوبیدار مورچوں سے باہر آ گئے۔ انہوں نے جوانوں کا حوصلہ قائم رکھنے کے لیے جوشیلی تپیں شروع کر دیں۔ یہ چاروں ہر مورچے میں جاتے کہیں نعرے لگاتے کہیں کوئی جذباتی بات کہتے جاتے تھے۔ لیفٹیننٹ اقبال نے آر آر والی جیب کو بڑی صحیح پوزیشن میں رکھا ہوا تھا۔ ہٹالین کی مارٹر پلاٹون کا ایم ایف اوجس کی ڈیوٹی تو پٹانے کے اوپی کی طرح ہوتی ہے اقبال کسے پلاٹون سے کچھ آگے ایک ٹیکوری پر پوزیشن لیے ہوئے تھا۔ اقبال دوڑتا ہوا ایم ایف او تک گیا۔ وہ ایک حوالدار تھا۔

”حوالدار متین!“ اقبال نے اُسے کہا۔ ”یاد رکھو۔ گھبرا کر فاتر آرڈر نہیں دینا۔ دشمن جب قریب آجائے تو اپنی پلاٹون کو فاتر آرڈر دو اور پوری مارٹر پلاٹون کا فاتر مانگو۔ گھبرا نہیں۔ میرے تمہارے پاس آتا رہوں گا۔“



"شر!۔ اس جنگلی حوالدار نے پر عزم لہجے میں کہا۔" ہم گھبرانے کا نہیں ہم سہید ہوزائے گا تو ادھر فوراً آؤ۔"

"میں آؤں گا متین!۔ اقبال نے کہا۔" میں پہنچوں گا۔"

اُس نے حوالدار متین کو اپنے دائر لیس کی فریکوئنسی بتا کر کہا۔" اگر تم زخمی ہو جاتے ہو تو ہم کو بکار دو۔"

اس قدر قیامت خیز گولا باری کے سائے میں انڈین آرمی کا ایک ڈویژن ٹینکوں کو ہانڈے لیے ہوئے بڑے تیز طوفان کی طرح آگیا۔ پھر زمین و آسمان ایک مسلسل دھماکہ بن گئے دشمن کی طاقت اتنی زیادہ تھی کہ جنگی اصولوں کو دیکھتے ہوئے اس طاقت کا مقابلہ البتہ جنگل سے رجسٹ نہیں کر سکتی تھی، لیکن برج ہیڈ کے مورچوں کے قریب آکر دشمن کے حملے کی رفتار سست ہو گئی۔

لیفٹیننٹ اقبال بھیچڑوں کا پورا زور لگا کر چلا رہا تھا۔ اور قریب آنے دو۔ اور قریب آنے دو۔ گرنیڈوں کی زد میں آنے دو۔۔۔۔۔ پوری طاقت سے گرنیڈ پھینکو۔ اس طرح چیختا چلاتا اقبال اڑتی گولیوں میں دوڑتا پھرتا تھا۔ وہ آکر کی جیب تک بھی گیا جو خندق میں تھی۔ سحر کی نیم تاریکی میں اُس نے گزروں کو دو ٹینک دکھائے جو گزروں نے یکے بعد دیگرے دو گولے فائر کر کے ہٹ کر لیے۔ حوالدار متین نے دماغ کو حاضر رکھ کر اپنی مارٹر پلاٹون کا ایسا کارگر فائر کر دیا کہ دشمن کی یلغار مزید سست ہو گئی۔ برج ہیڈ کی دونوں پلاٹونوں نے بھی مکمل حاضر دماغی سے دشمن کو مشین گنوں اور رائفلوں وغیرہ پر لے لیا۔

گمرد و غبار اس قدر گہرا ہو گیا تھا کہ تیرہ ہی نہیں چلتا تھا کہ صبح طلوع ہو چکی ہے۔ اقبال پہلے کی طرح اپنی پلاٹون کے مورچوں میں بھاگتا دوڑتا، نعرے لگاتا اور اپنے جوانوں کے حوصلے بڑھاتا پھرتا تھا۔

★

اچانک اقبال کو یوں لگا جیسے آسمان پھٹ گیا ہو اور تمام ستارے زمین پر آگرے ہوں۔ اُسے ہر نو ستاروں کے چمکتے ذرے دکھائی دیے اور اُس کے کانوں میں توپوں کی گرج اور پھٹنے گولوں کے دھماکے ہونے لگے پھر اُس کی نظروں کے سامنے گپ اندھیر اچھالنے لگا اور پیشتر اس کے کہ وہ محسوس کرتا کہ کیا ہوا ہے وہ دھڑام سے گر پڑا۔

اُس کا نائب صوبیدار کنارے کے ساتھ پوزیشن لیے ہوئے تھا۔ وہ بھاگ کر اقبال تک پہنچا۔ معاً دو اور جنگلی جوان کوڈ تے پھلانگتے پہنچے۔ دیکھا۔ لیفٹیننٹ اقبال کے سر سے خون کا دھارا پھوٹ رہا تھا۔ ایک طرف کا گال بھی کٹ گیا تھا۔ ایک گولہ بی آر بی کے کنا سے پھٹا تھا جس کے ٹکڑے اقبال کی لھو پڑی کی بڑی اور کال کو کاٹ گئے تھے لیفٹیننٹ اقبال بے سدھ پڑا تھا۔

نائب صوبیدار اور دو جوان اُسے اٹھا کر تیجھے لائے سب نے اپنی اپنی فیلڈ ہسپتال اُس کے سر اور منہ پر کس دی اور اُس کے نیم زندہ جسم کو فیلڈ ایمبولینس کے حوالے کر دیا۔

وہ دوسرے روز ہوش میں آیا۔ اُسے ہر نو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا جسے وہ رات کا اندھیرا سمجھ رہا تھا۔ اُسے اپنے ارد گرد سرگوشیاں سنائی دیں۔

"میں ہسپتال میں تو نہیں؟۔ اقبال نے نحیف سی آواز میں پوچھا۔"

"آرام سے لیٹے رہتیے۔ ایک نرس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔" خدا کا شکر ہے آپ بچ گئے ہیں۔"

اقبال کا سینہ ہم کی طرح پھٹا اور وہ بھیچڑوں کا تمام تر زور لگا کر چلا گیا۔ "نائب صوبیدار بھائی! پلاٹون کی کمانڈ لے لو۔ لائچر اوپر لے جاؤ۔ سائیفن کو دیکھو۔" اُس نے جسم کو جھٹکا دیا اور بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن زخموں سے درد کی ایسی بے رحم ٹیس اٹھی کہ اُس کے دانت کھٹکانے لگے۔

"آپ نہیں اٹھ سکیں گے۔ زخم کھل جائیں گے۔" نرس نے اُسے دونوں کندھوں سے تھام لیا اور رندھیائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اقبال صاحب! آپ ہسپتال میں ہیں، محاذ پر نہیں۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھال کر ہوش میں آئیے۔"

"آہ!۔ اقبال نے کمر بناک آہ لی اور بے بس ہو کر جسم کو بستر پر پھینک دیا۔ اُس کے جوڑ جوڑ سے درد اٹھ رہا تھا۔ جسم روتی کی طرح ڈھنسا ہوا تھا۔ کئی دنوں اور راتوں کی مسلسل معرکہ آرائی، شب بیداری اور ہیجان نے اعصاب کو چکنا چور کر دیا تھا۔

اقبال نے درد کی ٹیس سے سنبھل کر پوچھا۔ "دشمن بی آر بی کے قریب تو نہیں آگیا؟"

"نہیں جی!۔" نرس نے جواب دیا۔

"بی آر بی بہرہ رہی ہے نا؟"

"جی ہاں!۔"

"سائیفن محفوظ ہے نا؟"

"ہاں جی!۔" نرس نے جواب تو دے دیا لیکن اُسے کچھ علم نہیں تھا کہ اقبال کون سے سائیفن کی پوچھ رہا ہے اور وہ کس محاذ کا زخمی ہے۔ وہ تو اُسے تسلیاں دے رہی تھی۔

"بی آر بی بہتی رہے گی۔" اقبال نے سکون کی آہ لے کر کہا۔ "بہتی رہے گی۔" وہ بلند آواز سے بولا۔ "میرے جنگلی غازیوں کی کیا خبر ہے؟"

"وہ لڑ رہے ہیں۔" نرس نے کہا۔ "پاک فوج نے کھیم کرن لے لیا ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔"

"میں جنگل ٹائیگرز کے پاس کب جا سکوں گا؟"

کبھی نہیں کبھی نہیں۔ اُسے کوئی بتانا نہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی آنکھیں بی آر بی کی آن پر قربان کر آیا ہے اور اُس کا فرض ادا ہو چکا ہے۔ دشمن کے گولے کا ٹکڑا اسے سر میں ایسی جگہ لگا تھا کہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو گئی تھیں۔

"آپ کے گھر والوں کو اطلاع کر دی ہے۔" اُسے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"شاید کل تک آپ کا کوئی عزیز آپ کو دیکھنے آجائے گا۔"



”کہاں سے؟“ اقبال نے پوچھا۔

”وزیر آباد سے“ مردانہ آواز نے کہا۔ ”آپ وزیر آباد کے رہنے والے ہیں نا؟“

”نہیں“ اقبال نے انکھی اور دھیمی آواز میں کہا۔ ”میرا گھر بی آر بی کے کنارے ہے“

میر سے عزیز وہیں لڑ رہے ہیں۔ وزیر آباد میں میر کوئی نہیں۔ میر سے عزیز ایسٹ بنگال جنرل

کے جوان ہیں۔ بولتے بولتے اس پر غشی طاری ہو گئی اور وہ غشی میں بڑبڑانے لگا۔

”صوبیدار بدرالحق آ آر کی رری لوڈنگ میں دیر کیوں لگتی ہے؟“

★

کھاریاں چھاؤنی کے ہسپتال میں لیفٹیننٹ لطیف گہری نیند سو گیا تھا۔ صبح کے ساڑھے دس

بج رہے تھے۔ شمع اُس کے کمرے سے نکل کر کیٹین عصمت کے کمرے کی طرف جا رہی

تھی۔ ابھی وہ برآمدے میں جا ہی رہی تھی کہ اُسے کیٹین عصمت تیزی سے آئی نظر آئی۔

”شمع! اُس نے کہا۔“ تم فوراً وزیر آباد پہنچو۔“

”کیوں؟“ شمع نے گھبراتے ہوئے لمحے میں پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”اللہ خیریت ہی رکھے۔“ عصمت نے جواب دیا۔ ”تمہارے ابا جان نے وزیر آباد

تھانے سے کیٹین طارق سے فون کر دیا ہے کہ اقبال زخمی ہو گیا ہے اور وہ لاہور سی ایم ایچ

میں ہے۔“

کیٹین عصمت کے مُنہ سے الفاظ ڈک ڈک کر نکل رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی

تھیں کہ وہ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر شمع اور زیادہ

گھبرا گئی۔

”تم فوراً روانہ ہو جاؤ شمع! عصمت نے زندگی بھری آواز میں کہا۔“ زخمی لیفٹیننٹ کے

کمرے میں نہ جانا۔“

شمع کیٹین عصمت کے رہائشی کمرے کی طرف دوڑ پڑی۔ وہاں سے اُس نے اپنی

چیزیں اٹھائیں اور دوڑتی ہوئی نکل گئی۔ بڑی سڑک پر پہنچتے ہی اُسے بس مل گئی۔

جب اپنے گھر پہنچی تو اُس کی ماں اور بہن رو رہی تھیں۔ چوہدری کرامت کے چہرے پر

اطمینان اور سکون تھا۔ ہاجرہ گھبراہٹ میں سی الگ کھڑی تھی۔ شمع کے گھر والے اسی کا انتظار

کر رہے تھے۔ وہ بہت جلدی لاہور پہنچنا چاہتے تھے۔ انہیں لاہور سے اطلاع ملی تھی کہ

اقبال زخمی ہو گیا ہے اور لاہور سی۔ ایم۔ ایچ میں ہے۔ محلے کی چند ایک عورتیں بھی ان کے

گھر آ گئی تھیں۔

”اللہ خیر کرے۔“

”خدا اقبال کو لمبی زندگی دے۔“

”اللہ رحم کرے گا۔“

”مست گھبرا چوہدرانی!“

گھر میں سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”میری بہنو! اقبال کی ماں نے ان عورتوں سے کہا۔“ ہم سب لاہور جا رہے ہیں

تیجھے ہاجرہ اکیلی رہ جائے گی۔ رات کو کوئی اس کے پاس آکر سو جانا۔“

”نکمر نہ کر چوہدرانی!“ ایک عورت نے کہا اور اس کی تائید میں کئی آوازیں سنائی دیں۔

”نہ گھر کی نگرانی ہاجرہ کی.... ہاں ہاں۔ تیجھے کی فکر کیوں کرتی ہے تو!“

وہ سب لاہور چلے گئے اور ہاجرہ اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہ گئی۔ اقبال کے زخمی ہو

جانے کا اُسے کوئی غم نہ تھا لیکن شام کے وقت اقبال کے متعلق اُس نے چند ایسی باتیں

سنیں جن سے اُس کے تصوروں میں اقبال کا روپ بدلنے لگا۔ لوگ صدقہ خبریں سن رہے

تھے کہ اقبال نے جان پھیل کر دشمن کا حملہ روکا ہے اور وہ سپاہیوں سے آگے بڑھ کر آڑ

کے بغیر لڑتا رہا ہے۔

اگر یہ خبریں وزیر آباد کی گلیوں سے جنم لیتیں تو ہاجرہ کبھی یقین نہ کرتی لیکن ایک آدمی لاہور

سی ایم ایچ میں اپنے ایک زخمی عزیز کو دیکھنے گیا تھا۔ وہاں سے اقبال کی شجاعت کی تفصیلات

سن آیا تھا۔ شجاعت تو بہت بڑی بات ہے۔ اقبال کے متعلق اتنی سی خبر بھی سہرے کے کی خبر تھی

کہ وہ ملک و ملت کی آن پر لڑ گیا ہے۔ سبھی جانتے تھے کہ وہ کس قماش کا آدمی تھا۔

ہاجرہ کے ذہن میں اقبال کا تصور نکھر آیا لیکن اس اقبال سے اُسے نفرت تھی۔ اُس کے

ہونٹوں سے سرگوشی نکل گئی۔ ”آہ، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا.... اُس نے آہ بھر کر کہا۔“ میرے

پروردگار! اتھیل کا فردل سے لڑتا ہوا زخمی ہوا ہے تو اُسے میری زندگی دے دے۔“

ہاجرہ کے لاشعور سے یہ دعا نکلی تو اُسے یوں قرار آ گیا جیسے روح سے کانٹا نکل گیا ہو

اور دل پر جو ایک مدت سے سل رکھی تھی، اتر گئی ہو۔

رات ایک پڑوسن اُس کے پاس سونے کے لیے آ گئی۔

”خالہ جی!“ ہاجرہ نے کہا۔ ”مجھے ڈر تو نہیں آتا۔ جب سے جنگ لگی ہے چوری چکاری کا

خطرہ بھی نہیں رہا۔ دروازہ بند کر کے سو جاؤں گی۔ تم گھر چلی جاؤ خالہ جی! سچے پریشان ہوں گے۔“

پڑوسن نے اصرار کیا لیکن ہاجرہ نہ مانی اور پڑوسن چلی گئی۔

رات چاندنی تھی۔ ہاجرہ نے صحن میں چار پانی بکھائی تو اُسے پر لطف اور پروقار سا احساس

ہوا کہ گھر والے سارا گھر اُس کے حوالے کر گئے ہیں۔ اپنی اہمیت اور ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے

وہ تمام کمروں میں گھومی، کونکوں کے تالے دیکھے، کھڑکیوں اور دروازوں کی چٹنیاں دیکھیں اور

ریڈیو برآمدے میں رکھ کر چار پانی پر لیٹ گئی۔

★

جنرل چوہدری اب دلی ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا اپنے ایک پلان کا ماتم کر رہا تھا اور شکست

کا الزام اپنے سیکرٹری کمانڈروں کے سر تقویٰ کر اپنی نوکری کا تحفظ کر رہا تھا۔ چونڈہ کے میدان میں

اُس کی سولہویں کیولری کا نام و نشان بٹ چکا تھا۔ جلے ہوئے چند ایک ٹینکوں پر سیاہ دھند



”جانتی ہو ہجرہ سرحدوں پر کیا ہو رہا ہے؟“ اکبر علی نے کہا۔ ”جانتی ہو ہجرہ ہاں کیا ہوا ہے؟ خدا کے رسول اور قرآن کے ازلی دشمن ہماری ہوسٹیسوں کو رات کے اندھیرے میں اٹھالے گئے ہیں، بچوں کو ماؤں کی گودیوں سے قوت کر کاٹ گئے ہیں، جوانوں کو سونے میں فوج کر گئے ہیں۔ پاک فوج کے جوان اپنی ماؤں، بہنوں اور بچوں سے بخش بخشنا کر محاذ پر خون بہا رہے ہیں.... اپنا بھی دشمن کا بھی.... ماؤں کے لاڈلے بیٹے وطن کی عصمت پر شہید ہو رہے ہیں، لڑکیاں اور بازو کٹوا کر عمر بھر کے لیے اپنا ہج ہو رہے ہیں.... کس لیے ہجو؟.... جانتی ہو کس کی خاطر؟.... تمہاری آبرو کی خاطر، تم جیسی کنواریوں کی عصمت کے نام پر ہجو!.... وہ تمہارے بھائی ہیں، تمہارے باپ ہیں....“

کچھ تو باتیں ایسی تھیں کچھ اکبر علی کا لب و لہجہ ایسا کہ ہجو کا سینہ لرزے لگا۔ اُس کے ہونٹ کچھ تڑپنے لگے مگر کچھ نہ سکے۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ اکبر علی کوئی اور ہے جس سے اُسے نفرت ہے اور یہ اکبر علی کوئی اور ہے جس سے وہ کبھی نفرت نہ کر سکے گی۔

”اندرا آجاؤ نا“ ہجرہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”بیٹھ کے بات کرو“

”ہجرہ!۔ اکبر علی نے صحن میں کچھ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بخش دینا۔ میں تمہیں پریشان کرتا رہتا تھا لیکن ہجرہ! وہ وقت کچھ اور تھا....“

ہجرہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اکبر علی نے اُسے چارپائی پر بٹھانا چاہا لیکن مصلحتاً چپ رہا۔

”ہجو بیٹی“ اکبر علی نے کہا۔ ”قوم کا سچا بچہ اپنے فوجی جوانوں پر قربان ہوا جا رہا ہے۔ لوگ اپنے زور بکوں میں جمع کر رہے ہیں۔ قوم ایک اور خون ایک ہو گیا ہے خدا نے سب کا راستہ اور سب کی منزل ایک کر دی ہے!.... ہجو! بڑے بڑے خوبصورت جوان پاکستان پر قربان ہو گئے ہیں.... اقبال جیسا لاڈلا اور نازوں پلا بیٹا ہمیشہ کے لیے اندھا ہو گیا ہے۔“

”کیا کہا؟“ ہجرہ نے تڑپ کر پوچھا۔

”اقبال اندھا ہو گیا ہے!“ اکبر علی نے کہا۔ ”شاید پاگل بھی.... لیکن کسی سے بات نہ کرنا۔ اُس کے ماں باپ اُسے دیکھنے لاہور چلے گئے ہیں.... ڈاکٹر شاید انہیں ابھی بتائیں گے نہیں۔ مجھے اقبال کی اصلی حالت کا پتہ چل چکا ہے.... ہجو! ان گلیوں میں شہزادوں کی طرح گھومنے پھرنے والا عیاش اقبال تم جیسی کنواریوں کی آبرو پر قربان ہو گیا ہے۔“

اکبر علی نے اتنی باتیں اور اس قسم کی جذباتی باتیں کبھی نہیں کی تھیں۔ اٹھارہ برس گزے اُس کے خاندان کے اٹھارہ مرد، عورتیں اور بچے اُس کے سامنے ٹرک میں شہید ہو گئے تھے تو بھی اُس نے کوئی جذباتی بات نہیں کی تھی۔ اُس نے یہ ہولناک حادثہ اپنے سینے پر اور پاکستان کی تاریخ کے سینے پر بھی لکھ ڈالا تھا۔ وہ پاک فوج کا غازی تھا۔ غازی باتیں نہیں کیا کرتے۔ جن سپاہیوں نے اُس کے ہاتھوں ٹریننگ لی تھی انہیں وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا۔ ”حرکت زیادہ بات کم“ لیکن ہجرہ سپاہی نہیں تھی۔ وہ جو بات ہجرہ کے دل پر نقش کر کے اُس کے دل کو مسکھی میں لینا چاہتا تھا وہ ہجرہ کے جذبات میں زلزلے بپا کئے بغیر نہیں سمجھائی

مجلے ہوئے نشان نظر آرہے تھے۔ اُس نے ہانا پور، برکی اور بیدیاں سے منہ کی کھا کر کھیم کرن مار کر اپنے نمبر ۲۶، الفٹری، نمبر ۶ توٹیں اور نمبر ۱۴، الفٹری ڈوٹریوں کے شبدوش نمبر ۱، آرمرڈ ڈوٹریں جس میں نمبر ۶ کیو لری اور نمبر ۲ لانسز اضافی ٹینک یونٹیں تھیں لکھوٹ کی راہ سے پاکستان میں داخل ہونے کے لیے بڑھادیے تھے لیکن چونڈہ کا بیس میل وسیع میدان بھی جنرل چوہدری کے پلان کی شمشان بھومی بن گیا تھا۔ اُسے انڈین فوج پر بھروسہ تھا مگر پاک فضائیہ نے بھارتی طیاروں کو اڑنے کے قابل ہی نہ چھوڑا تھا وہ فضا کی دہشت بن گئے تھے۔ ادھر پاک بحریہ دوار کا کوتاہ کر کے کھلے سمندروں میں رین نیوی کو لٹکا رہی تھی لیکن انڈین نیوی جانے کہاں دھک گئی تھی!

صرف جنرل گپتا تھا، جاندھر کے ہیڈ کوارٹر میں پاگلوں کی طرح پاکستان میں بکھرے تے جاسوسوں کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اُس نے جاسوسی اور ساوتناژ کرنے والوں کو طیاروں سے بھی پاکستان میں اتار دیا تھا۔ مگر وہ بھی تک پاکستان پر کاری زمین دوز ضرب لگا کر رین آرمی کا کام آسان کر دینے کی آس لگائے بیٹھا تھا۔

جنرل چوہدری سرکچڑے دلی ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا تھا اور ہجرہ سر اونچا کیے صحن میں چارپائی بٹھائے ریڈیو پر رزمیہ ترانے سن رہی تھی۔ اُس کے دل و دماغ پر بیجان سا طاری ہوتا چلا گیا۔ میں بے اختیار آئی کہ کسی کو پاس بٹھا کر کھل کر باتیں کرے۔ وہ ابھی اور خراماں خراماں باہر دے دوازے میں جا کھڑی ہوئی۔

دو چار منٹ بعد اُسے ایک آدمی گلی میں آتا دکھائی دیا۔ وہ قریب آیا تو اُس نے اس آدمی پچان لیا۔ وہ صوبیدار اکبر علی تھا۔ ہجرہ نے منہ پھیر لیا اور دروازے کی طرف ٹپڑی۔

”ہجو!۔ اکبر علی نے اُس کے پاس رک کر کہا۔ ”میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم گھر میں اکیلی ہو۔“

ہجرہ اکبر علی سے کبھی ڈری نہیں تھی لیکن اُس رات ڈر گئی کیونکہ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اُس زبان گنگ ہو گئی۔

”میرے قریب آؤ گے تو میں شور مچا دوں گی۔“ ہجرہ اکبر علی کو چپ چاپ گھورتے

پچھ کر یک سخت بولی۔

”باپ بیٹی کے گھر آئے اور بیٹی شور مچا دے؟“ اکبر علی نے ایسی سنجیدگی اور متانت سے کہا جو ہجرہ نے اُس کے بچے میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اکبر علی نے آہ لے کر کہا۔ ”ہجو!

من کی عزت پر باؤ لے کتے ٹوٹ پڑے ہیں اور تم اکبر علی کو اتنا بے غیرت سمجھتی ہو کہ وہ تمہاری عزت پر ہتھ ڈالے گا.... میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے۔“

بات اُس کے دل سے نکلی تھی، اثر کر گئی۔

”پھر میرے پاس کیوں آئے ہو؟“ ہجرہ نے سنجھے سنجھے اور صُبح جو بچے میں کہا۔

سکین بدست محمد طارق اقبال  
اردو ڈاٹ کام ممبیز



جاسکتی تھی۔

”مخافوں پر خونریز جنگ ہو رہی ہے۔“ اکبر علی نے جذبات سے لرزتی آوازیں کہا۔  
 ”جو! خدا اور رسول کے عاشق جان پر کھیل رہے ہیں۔ ہندوستانی کا فرزند زخمی ہو کر گرتے ہیں اور  
 ٹرپ ٹرپ کر مارتے ہیں لیکن پاک فوج کے مجاہد گرتے ہیں تو یا علی اور اللہ اکبر کا نعروں لگا کر  
 کھٹکتے ہیں اور بھلی بن بن کر کافروں پر لوٹ لوٹ پڑتے ہیں۔ زخمی ہونے میں تو ترپتے نہیں۔  
 غرے لگاتے شہید ہو جاتے ہیں۔“

”تم بھی جنگ میں گئے تھے نا؟“ ہاجرہ نے دبی دبی آوازیں کہا جس میں طنز نہیں تھی۔

”میں اب بھی جنگ میں ہوں۔“ اکبر علی نے کہا۔ ”میں اُس دشمن کے خلاف جنگ لڑ رہا  
 ہوں جو کسی کو نظر نہیں آتا مگر توپوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے زیادہ خوف ناک ہے۔ راہوالی،  
 ہونگل اور وزیر آباد کے علاقے میں اسی نے بم گرائے ہیں۔ ہو سکتا ہے چناب کا پل کسی روز وہ بولانی  
 ماڑیوں کے بغیر ہی تباہ کر دے۔“

”کون ہے وہ؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”افضال۔“ اکبر علی نے کہا۔

”افضال؟“ ہاجرہ نے چونک کر کہا۔ ”وہ تو ....“

”وہ ہندوستان کا جاسوس ہے۔“ اکبر علی نے دو ٹوک کہا۔

”نہیں۔“ ہاجرہ جیسے چونک کر بیدار ہو گئی ہو۔ ”کہنے لگی۔“ وہ سات پانیوں میں دھلا ہوا پر بزرگوار  
 آدمی ہے۔ جب مع مسجد کے خطیب سے قرآن پڑھتا ہے .... وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔  
 اکبر علی نے جنگ اور پاک فوج کی شجاعت کی باتیں سنا کر اُس پر جو ظلم طاری کیا تھا، وہ ایک سخت دھل  
 گیا۔ اُس نے مان لیا تھا کہ اقبال جیسا عیاش آدمی وطن پر قربان ہو گیا ہے۔ اُس نے یہ بھی تسلیم کر لیا  
 تھا کہ اکبر علی بھی اُسے وطن کی خاطر بیٹھی سمجھ رہا ہے لیکن وہ کسی قیمت پر ماننے کو تیار نہ تھی کہ افضال  
 ہندوستان کا جاسوس ہے۔

وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ ہوائی حملے کے سارن چاندنی رات کو کھنھوڑنے لگے۔ اکبر علی نے ادھر  
 سر دیکھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہوائی حملے کی صورت میں کس جگہ پناہ لی جائے لیکن اُس نے صحن ہی میں  
 بیٹھے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اتنے میں دو ہوائی جہازوں کی بھیانک گونج سنائی دی جو سر کے اوپر سے  
 زرتے توپ کے گولوں کی طرح پلک پلک پھسکے گزر گئے۔ یہ انڈین ایئرفورس کے لڑاکا بمبار طیارے تھے  
 جنکی پرواز سے وزیر آباد کے اوپر سے گزر گئے تھے۔

”یہ کس کے جہاز ہیں؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

اکبر علی یوں غلامیں گھور رہا تھا جیسے اُسے یاد ہی نہ رہا ہو کہ ہاجرہ اُس کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔

”پپ۔ پنی پنی۔ پپ۔ تارگیٹ۔ تارگیٹ۔ ون، اوکلاک۔“ کہیں سے دھیمی دھیمی سی آواز  
 سنائی دی جس طرح خراب ٹیلی فون یا ہیڈ فون سے سنائی دیا کرتی ہے۔

”یہ آواز کہاں سے آئی ہے؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”میری جیب سے۔“ اکبر علی نے کہا۔ ”فرا کھٹو۔“ اُس نے پھر کان کھڑے کر لیے جیسے  
 کسی غیبی آواز کو سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ طیاروں کی آوازیں دور نکل گئی تھیں۔

”چیک .... تارگیٹ .... ہنڈر ڈائیٹی (۱۸۰) ڈگری ....“ اکبر علی کی جیب سے آواز پھر  
 سنائی دی۔

”دشمن کے ہوائی جہاز واپس آئیں گے۔“ اکبر علی نے ہاجرہ کو بتایا۔ ”مجھے یقین ہے یہ چناب  
 کے پل کو تباہ کرنے آئے ہیں۔ وہ آگے نکل گئے تھے لیکن یہاں کوئی جاسوس ان کی رہنمائی کر رہا  
 ہے اور انہیں بتا رہا ہے کہ تم آگے نکل گئے ہو۔ واپس آؤ۔“  
 ”ٹین، اوکلاک ....“ آواز سنائی دی۔

ایک سخت چناب کے پل کے ارد گرد لگی ہوئی، پاک فوج کی طیارہ شکن توپوں اور مشین گنوں نے  
 قیامت بہا کر دی۔ آسمان پر گولے پھٹنے لگے اور مشین گنوں کے ٹیسر ایموشن نے فضا میں آگ کی  
 چمکتی لکیروں کا جال تن دیا۔ ہاجرہ سہم کر اکبر علی کے قریب سرک گئی اُس کے لیے یہ سب بڑا ہی پراسرار  
 تھا۔

اکبر علی نے طنز آلود مقدمہ لگایا۔ اتنے میں دُور، خاصی دُور چار دھماکے سنائی دیئے اور طیاروں  
 کے زنائے ایک دوسرے کے پیچھے وزیر آباد سے پرے ہی پرے گزر گئے۔  
 ”لگے بھارتی!“ اکبر علی نے طنز یہ کہا۔ ”پاکستان کے پلوں کو تباہ کرنا اتنا آسان نہیں ....  
 ہاجرہ! ہم پل سے بہت دُور گزرے ہیں دھماکوں کی آواز بتاتی ہے کہ ہم دریا میں بھی نہیں گزرے بہت دُور  
 پھٹے ہیں .... بہت دُور۔“ اور وہ فاختانہ ہنسی ہنس پڑا۔

”یہ آواز کہاں سے آرہی تھی؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔ ”یہ آواز کس کی تھی؟“

”یہ میری جیب میں ایک آلہ ہے جو دشمنوں کی آوازوں کو سن رہا ہے۔ میں ان ہی جاسوسوں کو پکڑنے  
 کے لیے وزیر آباد میں واپس آ گیا ہوں۔“ آلہ کلیر کا سارن بکنے لگا۔ اکبر علی کہہ رہا تھا۔ ”میں جھٹک  
 نہیں مار رہا ہاجرہ! ذرا تصور کرو کہ چناب کے دونوں پل، سڑک کا بھی اور ریل کا بھی، تباہ ہو جائیں تو  
 ہماری فوجوں کو نہ گولہ بارود پہنچ سکے گا نہ راشن نہ پٹرول۔ پھر فوجوں کا کیا حشر ہوگا؟ پھر پاکستان کا کیا  
 حشر ہوگا؟“

اُس نے ہاجرہ کو تفصیلاً سمجھایا کہ فوجوں کو راشن، گولہ بارود اور ضروری سامان نہ پہنچا تو اس کا نتیجہ  
 کیا ہوگا۔

ہاجرہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گھبراتی ہوئی آوازیں بولی۔ ”تم جاسوسوں کو پکڑتے کیوں نہیں؟“  
 — ذرا رک کے انوکھے سے لہجے میں کہنے لگی۔ ”مجھے کوئی جاسوس دکھاؤ، میں چھری سے اُس کا  
 کلیجہ نکال دوں گی۔“

”تمہیں ایک جاسوس بتا دیا ہے!“ اکبر علی نے مسکرا کر کہا۔ ”افضال۔“

”نہیں۔“ ہاجرہ نے ملتی لہجے میں کہا۔ ”وہ جاسوس نہیں ہو سکتا۔ وہ ہندو تو نہیں۔ وہ نماز  
 پڑھتا ہے۔“



وہ افضل اُس کی پناہ تھا مگر ایک یہ افضل جو پاکستان کے دشمنوں کا جاسوس تھا۔ وہ مینوں کی ٹنگلیں پہچانتی تھی مگر روپ بہ روپ کے چھلاووں نے مینوں کی صورتیں مسخ کر ڈالیں، چہروں کے خطوط گم ہو گئے۔ اُسے ان مینوں کے ایک رُخ سے محبت اور دوسرے رُخ سے نفرت تھی۔ اُس کے ذہن میں محبت اور نفرت، پاک فوج اور انڈین آرمی کی طرح آمنے سامنے آکر معرکہ آرا ہو گئیں۔

ہاجرہ نے اپنے متعلق سوچا تو اُسے اپنے بھی دو روپ نظر آئے۔ ایک وہ ہاجرہ جس کے پیار اور ارمالوں کو راولپنڈی کی سردی نے برف کا تودہ بنا کر مٹی میں دبا دیا تھا اور جسے مردوں ہی سے نہیں اس زندگی ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔ اور ایک یہ ہاجرہ جسے جنگ اور اکبر علی کی باتوں نے اس قدر بیدار کر دیا تھا کہ اسے گلیوں کے آوارہ لونڈوں سے صرف اس لیے پیار ہو گیا تھا کہ وہ پاکستانی لڑکے تھے۔ اس ہاجرہ سے اس کے وطن کا جھنڈا افضل کی محبت کی قربانی مانگ رہا تھا۔

چھ تبصرہ کی صبح سے وزیر آباد میں جو انقلاب آگیا تھا اس کی ایک ایک تفصیل ہاجرہ کے سامنے آگئی۔ جوانی حملے کے بعد رات پھر خاموش ہو گئی تھی۔ رات کے اس بوجھ تائے میں ہاجرہ کو دُور، سیالکوٹ کے محاذ سے پاک آرٹلری کی دو سو پونڈ توپوں کے دھماکے دھیمے دھیمے سناتی دے رہے تھے۔ یہ آوازیں اُس نے پہلے بھی سنی تھیں لیکن کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ آج کی رات یہ دہلی دہلی سی دُور کی دھم دھم اُس کے ذہن میں بلند ہوتی چلی گئی اور وہ ان آوازوں کو کان لگا کر سننے لگی۔ اُس نے سنا تھا کہ سیالکوٹ کے محاذ پر دشمن نے جنگوں کی تاریخ کا سب سے بڑا حملہ کیا ہے۔

اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اُس کے دل کی دھڑکن توپوں کی دھم، دھم کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی ہو اُسے یہ آوازیں اچھی لگنے لگیں۔ کرتے کرتے اُس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی جیسے وہ خود توپیں داغ رہی ہو یا جیسے یہ توپیں اُس کے سینے میں فائر ہو رہی ہوں۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ سیالکوٹ کے محاذ کی میوی آرٹلری کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں اور ہاجرہ کا ذہن بیدار ہوتا جا رہا تھا۔

”افضل جاسوس ہے؟“ ہاجرہ کے بیدار ہونے ہوتے ذہن میں بڑا ہی زور وار دھماکا ہوا۔

”نہیں“ اُس نے اپنے آپ کو جواب دیا۔

صوبیدار اکبر علی کی باتیں اُس کے ارد گرد بھنٹانے لگیں۔ وہ اپنے سر پر اکبر علی کا ہاتھ محسوس کرنے لگی۔ کبھی وہ بے چین ہو جاتی کبھی اُسے سکون سا محسوس ہوتا۔ جب اُسے خیال آتا کہ اکبر علی نے اُسے کہا ہے کہ افضل کو کپڑا ہے تو وہ اندر ہی اندر تڑپ اٹھتی۔

”نہیں ہاجرہ!“ اُسے اپنی آواز سناتی دیتی۔ ”تم افضل کو کپڑا نہیں سکوگی۔ اُس کے سامنے جاؤ گی تو تم پر اُس کا طلسم طاری ہو جائے گا۔“

وہ ان پڑھ اور بہت ہی سادہ فطرت کی لڑکی تھی۔ وہ صرف پیار اور پھٹکار کو محبت اور نفرت کو پہچانتی تھی۔ جاسوس کا لفظ تو اُس نے اب سنا تھا۔ اُسے کیا خبر تھی کسی جاسوس کی جاسوسی کس طرح کی جاتی ہے۔ صوبیدار اکبر علی نے اُس کے جذبات میں تو پہل پیدا کر دی تھی لیکن عمل کے

”وہ پاکستانی بھی نہیں“ اکبر علی نے کہا۔ ”پھر بھی ہاجرہ! ہو سکتا ہے وہ جاسوس نہ ہو لیکن تم اُس کے پاس جاتی رہو اور اُس پر نظر رکھو.... اور یاد رکھو۔ ابھی ابھی تم نے میری جیب سے جس طرح کی آوازیں سنی ہیں اگر اس طرح کی آواز افضل کے کمرے میں سنو تو اُسی وقت بھلے خبر کرو۔“

ہاجرہ خلا میں ٹنگی باندھے دیکھ رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں وہ تمہیں بہت اچھا لگتا ہے“ اکبر علی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں تمہیں اُس سے ملنے سے کبھی نہ روکوں گا مگر ہاجرہ! چاند تارے والے ہنر بھنڈے کے مقابلے میں کچھ بھی اچھا نہیں۔ اگر تم نے اُس کا ساتھ دیا تو میں سمجھوں گا کہ تم بے غیرت لڑکی ہو جسے پاکستان کی محبت لڑکی کی آبرو کا ذرہ بھر خیال نہیں۔“

ہاجرہ کا سینہ لرز اٹھا۔ وہ بے غیرت نہیں کہلانا چاہتی تھی۔

”میں سمجھوں گا کہ تم پاکستانی نہیں“ اکبر علی نے اُسے کہہ دیا۔ ”تم ہندوستانی ہو.... تم ہندو ہو۔“

ہاجرہ نے تڑپ کر دو لو ہاتھ اکبر علی کے گھٹنے پر رکھ دیئے اور زندہ بھیاں ہوتی آواز میں بولی۔

”یوں نہ کہو اکبر جی! میں پاکستانی ہوں۔ مجھے ہندوستانی نہ کہو۔ اُس کے آئینہ بھلے۔“

”مجھے ہندو نہ کہو۔ ہندو بہت بُرے ہوتے ہیں۔ ہندوؤں نے کشمیر میں بچوں کو مار ڈالا تھا ہم سب کو انہوں نے دہار سے نکال دیا تھا.... نہیں اکبر جی! مجھے ہندو نہ کہو۔“

اکبر علی نے ہاجرہ کا یہ رد عمل دیکھا تو اُسے خوشی محسوس ہوئی۔ ہاجرہ اُسے بڑی ہی پیاری لگی۔ اس پیار میں اب آوارگی نہیں احترام کا عنصر بنایا تھا۔ وہ اٹھا اور ہاجرہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ایکے دُروگی تو نہیں؟“ اُس نے ہاجرہ سے پوچھا۔

”نہیں“ ہاجرہ نے دکھیا ری سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ”میں اکیلی دنیا میں آتی تھی، اکیلی جی رہی ہوں۔“

اکبر علی خراماں خراماں باہر نکل گیا۔

ہاجرہ وہیں زمین پر بیٹھی خیالوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔ اُس کے سامنے تین آدمی آگئے۔ اکبر علی، اقبال اور افضل۔ مگر یہ تین آدمی چھ ہو گئے۔ ایک وہ اکبر علی جو اُس کے حسن و جوانی سے دل بہلانا چاہتا تھا اور اُسے زیور کا جھانسنے دے کر شادی کے لیے اکٹا رہتا تھا اور ایک یہ اکبر علی جو ابھی ابھی باپ کے روپ میں اُس کے پاس آیا تھا اور جس کی دلولہ انگیز باتوں نے اُس کی ذات میں مقدس اور بڑا ہی پیارا جذبہ بیدار کر دیا تھا۔

ایک وہ اقبال جو خود بھی بے جیا تھا اور اُسے بھی بے جیا ہو جانے کے لیے پانچ پانچ اور دس دس کے نوٹ دکھاتا رہتا تھا، اور ایک یہ اقبال جو اپنی جوانی اور اپنی اتنی خوبصورت آنکھیں پاکستان کی آبرو پر قربان کر آیا تھا۔

ایک وہ افضل جس نے اُسے کھویا ہوا پیار دے کر اُس کے دُکھے ہوتے دل کو سہلایا تھا۔



لئے جس فہم و فراست کی ضرورت تھی وہ ہاجرہ میں نہیں تھی۔  
 صوبیدار اکبر علی نے ہاجرہ جیسی لڑکی کو اعتماد میں لے کر غلطی کی تھی۔ وہ انٹیلی جنس کا یا  
 سیکرٹ سروس کا صوبیدار تھا۔ افضال کو کپڑے کے لئے اور اُس کے رنگ کو زمین کے نیچے سے  
 باہر لانے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا، کسی اور ذریعے کا سہارا لینا چاہیے تھا۔ اُسے  
 معلوم نہیں تھا کہ ہاجرہ نے افضال کو ایک بڑے خوبصورت آسیب کی طرح اپنے اوپر غالب کر  
 رکھا ہے۔

”حوالہ منتین!“ لیفٹیننٹ اقبال نے سی۔ ایم۔ ایچ لاہور کے ایک کمرے  
 میں بیڈ پر لیٹے لیٹے کہا۔ ”گھبرانا رست۔ ہوش ٹھکانے رکھ کر فائر آرڈر دینا.... زخمی ہو  
 تو ہم کو پکارو۔ ہم آئیں گے۔ شہید ہو جاتے ہو تو پرواہ نہیں.... ہم آئیں گے۔“ وہ  
 دھیمی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ اچانک اُس کی آواز بلند ہو گئی۔ ”ہم آئیں گے.... گھبرانا نہیں  
 .... میں آؤں گا.... دشمن“ اُس کی آواز اور زیادہ بلند ہو گئی۔ ”پاکستان کا دشمن....  
 انڈیا.... باؤلا ہندوستان“ اقبال کے دانت پس رہے تھے۔ اُس کا سر اور آدھا  
 چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ چپ ہو گیا۔

نرس خاموشی سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اقبال کی ماں اُس کا باپ، شمع اور اُس کی چھوٹی  
 بہن اقبال کے ارد گرد کھڑی تھیں۔ سب کے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ سب جب اقبال کے  
 کمرے میں داخل ہوتے تھے تو وہاں وہی منظر بن گیا تھا جو لیفٹیننٹ لطیف کے کمرے میں  
 اُس وقت بنا تھا جب اُس کے ماں باپ اور عزیز پہلی بار اُس کے کمرے میں داخل ہوتے  
 اور اُسے زخمی حالت میں دیکھا تھا۔

شہیدوں کی اور محاذ سے زخمی ہو کر آنے والوں کی مائیں کچڑوں، قد کاٹھ، شکل و صورت  
 اور عمر کے لحاظ سے ایک دوسری سے مختلف ہوتی ہیں لیکن آپس میں ایک جیسی، آنسو ایک جیسے،  
 خاموش فریادیں ایک جیسی اور اُن کے جذبات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اقبال کی ماں اُس پر  
 اُسی طرح گری تھی جس طرح لطیف کی ماں لطیف پر گری تھی۔ اقبال کی ماں کے آنسو لطیف  
 کی ماں جیسے تھے۔ اُن کی سسکیاں اور دلوں کی دھڑکنیں ایک جیسی تھیں۔

لطیف نے اپنی ماں کو نہیں پہچانا تھا، اقبال نے بھی اپنی ماں کو نہیں پہچانا۔ فرق صرف  
 یہ تھا کہ لطیف کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ دیکھ سکتا تھا اور آنکھیں اقبال کی بھی کھلی تھیں مگر وہ دیکھ  
 نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے گال پر جس پر پٹیاں نہیں بندھی ہوئی تھیں، اپنی ماں کے ہونٹوں کا سر  
 محسوس ہی نہیں کر رہا تھا۔ ماں کے آنسو اُس کے سر اور آدھے چہرے پر لپٹی ہوئی پٹیوں  
 میں جذب ہو رہے تھے۔

”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“ اقبال کی ماں نے نرس سے پوچھا جو اقبال کے بیڈ کا رڈ پر کھچ  
 لکھ رہی تھی۔

”ٹھیک ہو جاتیں گے۔“ نرس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

”لیکن یہ جو باتیں کر رہا ہے“ ماں نے کہا۔ ”یہ تو ایسے ہے جیسے تیز بخار سر کو چڑھ جاتا ہے۔“  
 ”یہ بخار نہیں خالہ جان!“ نرس نے کہا۔ ”محاذ سے جو زخمی آتا ہے اُس کی ذہنی حالت

اسکین بکسٹ محمد طارق اقبال  
 ون اردو ڈاٹ کام ممبیز





ایسی ہی ہوتی ہے۔ وارڈوں میں جا کر دیکھیں۔ آپ سمجھیں گے جیسے آپ محاذ پر آگئی ہوں....  
آپ گھبراہٹ میں نہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت ٹھیک ہو جائے تو زخم جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔  
ابھی ان کا ذہن محاذ پر لڑ رہا ہے۔

”کیا ہم رات کو اس کمرے میں رہ سکیں گے؟“ اقبال کے باپ نے نرس سے پوچھا اور اسے بتایا۔ ”ہم وزیر آباد سے آئے ہیں۔“

”سب نہیں۔“ نرس نے جواب دیا۔ ”آپ میں سے کوئی ایک رہ سکتا ہے.... آپ ان کی فکر نہ کریں۔ ان کی دیکھ بھال اور تیمارداری ایسے ہی ہوتی ہے جیسے ماں اپنے بچے کی کرتی ہے۔ دن کو آپ سب آ سکتے ہیں۔“

اقبال کے باپ کے قریبی رشتہ دار لاہور میں رہتے تھے۔ رات کو وہ ان کے ہاں چلے گئے۔

★

صبح ابھی نیم تار یک تھی جب وہ سی۔ ایم۔ ایچ میں پہنچ گئے۔ پورا ہسپتال جاگ رہا تھا۔ وارڈوں میں نعرے گرج رہے تھے۔ ڈاکٹروں، نرسوں اور ہسپتال کے دیگر سٹاف کے بھاگ دوڑ ایسی ہی تھی جیسی اقبال کے عزیز گذشتہ روز دیکھ گئے تھے۔ وہ لیفٹیننٹ اقبال کے کمرے میں گئے تو وہاں ایک نرسنگ آرڈلی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور اقبال کی نگہبند تھیں۔ ان سب کو دیکھ کر نرسنگ آرڈلی اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اٹھا اور سب کو باہر لے گیا۔

”صاحب سوئے ہوئے ہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”انہیں جگانا نہیں۔“  
”اب کیا حال ہے؟“ اقبال کے باپ نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے ذہنی حالت....“  
”نارمل ہو گئی ہے۔“ نرسنگ آرڈلی نے کہا۔ ”رات تقریباً دو بجے انہوں نے پوچھا تھا کہ میرے گھر سے کوئی نہیں آیا؟.... آپ برآمدے میں بیٹھیں۔ ان کے جا گئے پر میں آپ کو بلاؤں گا۔“

برآمدے میں ان کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہاں کوئی بیچ خالی نہیں تھا۔ برآمدے کے فرش پر زخمیوں کے لواحقین نے بستر ڈال رکھے تھے۔ اقبال کے ماں باپ اور بہنیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔ ان کی رات بے چینی میں گزری تھی۔

رات ہجرہ نے بھی بے چینی میں گزاری تھی۔ یہ رات اُس کی تمام راتوں سے زیادہ لمبی تھی۔ رات کو وہ صوبیدار اکبر علی کی باتوں سے متاثر ہو گئی تھی لیکن صبح طلوع ہوتے ہی اُسے ایسے لگا جیسے اکبر علی اُسے اندھیرے میں پھینک گیا تھا اور اب اُس کا پھیلا ہوا اندھیرا چھٹ گیا ہو۔  
”افضل جاسوس نہیں ہو سکتا۔“ تیر کی طرح یہ خیال آیا اور اُس کے ذہن میں اُتر گیا۔

”مگر اکبر علی نے مجھے بیٹا کہا تھا۔“ اُسے دوسرا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے ذہن میں اکبر علی کی باتیں یوں گونجنے لگیں جیسے وہ ابھی تک اُس کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہو۔

ہجرہ ایک انہیت میں مبتلا تھی۔ اکبر علی اگر اُس کے پاس جنگ سے پہلے والے روپ میں آتا تو ہجرہ کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ وہ اُس کی باتوں کو یوں نظر انداز کر دیتی جیسے منہ پر بیٹھی مکھی کو اڑا دیا جاتا ہے لیکن صوبیدار اکبر علی کے بولنے کے انداز میں ایک تپش تھی جو اُس کی روح کے الاؤ کا پتہ دیتی تھی۔ ہجرہ اس تپش کو محسوس کر رہی تھی۔

ہجرہ باورچی خانے میں گئی۔ اُسے اب ایسی کوئی جلدی نہیں تھی کہ گھر والوں کو ناشتہ دینا بنے۔ آج اُسے آوازیں دینے والا، حکم دینے والا اور یہ کہنے والا کوئی نہ تھا کہ اسے چھوڑو پہلے وہ کرو۔ اُس نے اپنے لیے چائے بنائی۔ رات کی ایک روٹی پڑی تھی۔ وہ گرم کیے بغیر چائے کے ساتھ کھائی اور باہر نکل گئی۔

★

وہ افضل سے ملنے جا رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ جھینپ گئی جیسے وہ کسی اجنبی مرد سے ملنے جا رہی ہو۔ دوسرے ہی لمحے افضل کا سر اُپا اور چہرہ اُس کے سامنے آگیا۔ یہ چہرہ کھلا ہوا تھا اور اس چہرے پر پیار کی رونق تھی۔ وہ تیز چل پڑی جیسے کسی نے اُسے دھکا دیا ہو۔ اس دھکے سے اُس کے دل پر جو بوجھ تھا وہ گہ پڑا۔ اعصاب جو کچھ تنے ہوئے تھے ٹھکانے پر آ گئے اور اکبر علی کی باتوں کی گونج خاموش ہو گئی۔

ہجرہ کے آگے آگے پانچ چھ سال عمر کا ایک بچہ ہاتھ میں برتن اٹھاتے دودھ یا دہی لینے جا رہا تھا۔ اوپر سے پاک فضائیہ کے تین سیر طیارے ہیبت ناک زناٹے سے بڑی کم بلندی پر اڑتے گزر گئے۔ لاہور سیکٹر میں دشمن نے مزید ٹھک بھیج دی اور توپ خانے میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ ان سینکڑوں چھوٹی بڑی توپوں کو خاموش کرنے یا ان کی گولا باری کسے شدت کو قابو میں رکھنے کے لیے پاک فضائیہ کے شہبازوں کو بلا یا جاتا تھا۔ ان کی پروازیں صبح کی پہلی روشنی کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی تھیں۔

ان لڑاکا بمبار طیاروں میں بیٹھے ہوئے اور جان کی بازی لگا کر برستی آگ میں اور زمین سے اُٹھتے ہوئے گرد و غبار میں غوطے میں چلے جانے والے گوشت پوست کے انسان تھے۔ انہیں فائر پائلٹ اور اُردو میں ہوا باز کہا جاتا تھا لیکن جنگ کے پہلے چند دنوں میں ہی انہوں نے دشمن سے منوالیا تھا کہ وہ ہوا باز نہیں شہباز ہیں۔ انہوں نے پاکستان اور بھارت کی فضاؤں میں اپنی حکمرانی قائم کر لی تھی۔ حالانکہ دشمن کے جدید اور آواز کی رفتار پر اڑنے والے لڑاکا بمبار طیاروں کے مقابلے میں پاک فضائیہ کے شہبازوں کے پاس پرانی طرز کے سست رفتار طیارے تھے جن کی رفتار پاور بھی کم تھی۔ ان کی شہبازی اور ان کے سنا منے دشمن کی بے بسی دیکھ کر کسی مبصر نے کہا تھا کہ طیارہ نہیں طیارے میں بیٹھا ہوا ہوا باز لڑا کر تباہ ہے وہ انہی شہبازوں کے طیارے تھے جو وزیر آباد کے اوپر سے زناٹے سے گزر گئے۔

ہجرہ کے آگے آگے پانچ چھ سال عمر کا جو بچہ ہاتھ میں برتن اٹھاتے جا رہا تھا، ہم کی طرح پھٹا۔ ”علیٰ حمید.... پاکستان زندہ باد۔“



اس ننھے ننھے نعرے سے ہاجر کا دل دہل گیا جیسے ساری قوم اور پاک فوج نے مل کر "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا ہو۔ یہ نعرہ ہاجرہ کی روح تک اتر گیا اور اُسے آوازیں سنائی دینے لگیں:

"پاک فوج کے مجاہد گرتے ہیں تو یا علیؑ اور اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر اٹھتے ہیں۔"

"وہ زخمی ہوتے ہیں تو تڑپتے نہیں، نعرے لگاتے شہید ہو جاتے ہیں۔"

یہ گزشتہ رات کی آوازیں تھیں۔

"افضال ہندوستان کا جاسوس ہے۔"

ہاجرہ کے ذہن میں جب یہ آواز گونجی تو اُس کے سینے سے ہوک اٹھی۔ وہ اندر ہی اندر تڑپ گئی۔ اُس کے جی میں آئی کہ رو تے اور اتنا روئے کہ دل کی لگی آنسوؤں کی راہ بہ جاتے۔ اُس نے اپنے آپ کو یہ فریب دینے کی بھی کوشش کی کہ رات اُس نے صوبیدار اکبر علی کو خواب میں دیکھا تھا اور اُس نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ خواب میں کہا تھا، مگر حقیقت کے سامنے یہ خود فریب ٹھہر نہ سکی۔

وہ رک گئی تھی، پھر چل پڑی۔ اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور اُس کے پاؤں تلے زمین پانی کی لہروں کی طرح اوپر نیچے ہونے لگی۔ اس قسم کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے اور اس پر قابو پانے کے لیے جس عقل اور فہم و فراست کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہاجرہ میں نہیں تھی۔ ذہنی طور پر وہ اکھڑتی چلی گئی۔ اُسے کسی گھر کے ریڈیو سے جنگی ترانہ سنائی دیا:

جو موت آتے سامنے تو مسکراؤ سا خنجر

ترانے کی پرجوش موسیقی اور طر ز نے ہاجرہ کو تھم لیا۔ تیز اور جوشیلی موسیقی اُس کے وجود میں سرایت کرنے لگی اور اُس کے خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ اُس کے لڑکھڑاتے قدم سنبھل گئے۔ وہ چلتی گئی۔ اُسے اپنے سر پر صوبیدار اکبر علی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ اُسے سکون سا آنے لگا۔ لیکن معاً بعد اس کے دل پر پھر خوف طاری ہونے لگا۔

وہ رک گئی۔ سر کو جھٹکا دیا اور گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ افضال کے بند دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔



بند دروازے کے پیچھے خاموشی تھی۔ بند کواڑوں نے ہاجرہ کے دل کے درپچھے کھول دیئے اور اُسے قرار سا آنے لگا۔ دروازہ باہر سے بند نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ افضال اندر موجود ہے۔ ہاجرہ نے بڑی آہستہ سے دستک دی اور دروازہ فوراً کھل گیا۔

اُس کے سامنے افضال کھڑا تھا اور اُس کے ہاتھ میں قرآن تھا۔ قرآن اور افضال کی صورت دیکھ کر ہاجرہ کے ذہن کی اکھنیں اپنے آپ سمجھ گئیں۔ خوف نہ رہا، اضطراب نہ رہا، ذہن میں کوئی معمہ اور کوئی سوال نہ رہا۔ افضال کی مسکراہٹ نے ہاجرہ پر نشہ سا طاری کر دیا اور اُسے اکبر علی کی باتیں بے بنیاد معلوم ہونے لگیں، محض الزام! افضال تو وہ چشمہ

تھا جس سے ہاجرہ کی پیاس بجھتی تھی۔ وہ کیسے مان لیتی کہ اس چشمے میں زہر ملا ہوا ہے جس نے اُسے نئی زندگی دی ہے اور جس نے اُس کے وجود میں روح بھونکی ہے۔

افضال کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ مسکراہٹ وہی تھی۔ اس پر پہلے بھی ہاجرہ کو کوئی دھوکہ اور تصنع نظر نہ آیا تھا، آج بھی نظر نہ آیا۔ فریب کا شائبہ تک نظر نہ آیا۔ ہاجرہ کو یہ خیال بھی تو آ گیا کہ ہاتھ میں قرآن مجید لے کر تو کوئی کسی کو فریب نہیں دے سکتا۔

پھر ایسے ہوا کہ دروازہ جو افضال نے کھولا تھا وہ ہاجرہ اور افضال کے پیچھے بند ہو گیا۔

قرآن وہیں چلا گیا جہاں افضال رکھا کرتا تھا۔ اُس نے ہاجرہ کو اپنے بازوؤں میں لیا تو ہاجرہ نے افضال کے انداز میں پہلے والی وارفتگی اور بنیابی دیکھی۔ افضال کے لمس اور اُس کی سانسوں کی بو نے ہاجرہ پر بے خودی طاری کر دی۔

"افضال جی! — ہاجرہ نے اُس کے بازوؤں سے تڑپ کر نکلتے ہوئے پوچھا — "مہنیں

قسم ہے اس قرآن مجید کی جو تم ابھی ابھی پڑھ کر اٹھے ہو۔ جھوٹ بولو گے تو دوزخ میں جاؤ گے.... سچ بتاؤ، تم ہندوستان کے جاسوس ہو؟"

افضال یوں اچک کر پرے ہٹ گیا جیسے ہاجرہ ناگن ہو اور اس نے اُسے دس لیا ہو۔ وہ بھٹی بھٹی نظروں سے ہاجرہ کو دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ہاجرہ نہیں جانتی تھی کہ چہرے کے اس تاثر سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اتنا ہی سمجھ سکی کہ افضال کو غصہ آ گیا ہے۔

"میں تو نہیں کہتی۔" ہاجرہ نے خفت آمیز لہجے میں کہا — "وہ کافر اکبر علی کہتا ہے.... اکبر علی

کو جانتے ہونا! وہ جو کل میرے پیچھے پیچھے یہاں آیا تھا۔"

"اکبر علی؟" افضال نے غصے سے کانپتی ہوتی آواز میں کہا — "وہ اکبر علی جو جنگ سے

بھاگ آیا ہے؟ پاکستان کے خوبصورت جوان سرحدوں پر شہید ہو رہے ہیں۔ اُن کے بازو کٹ رہے ہیں، ہانگیں کٹ رہی ہیں، اُن کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے اندھی ہو رہی ہیں اور یہ

اکبر علی جو اپنے آپ کو صوبیدار کہتا ہے، یہاں گلیوں میں بد معاشیاں کرتا پھرتا ہے۔"

"افضال جی! افضال جی! — ہاجرہ نے بچوں کی طرح بے تابی سے کہا — "مہنیں ایک اور

بات بتاؤں.... وہ اقبال ہے نا! وہ جس کے گھر میں میں نوکریوں، وہ فوج میں لفٹیننٹ ہے

وہ زخمی ہو گیا ہے اور لاہور ہسپتال میں ہے۔ میرے گھر والے سب لاہور چلے گئے ہیں

میں گھر میں اکیلی ہوں۔ کہتے ہیں اقبال دونوں آنکھوں سے اندھا ہو گیا ہے۔"

"وہ مہنیں چھیڑا کرتا تھا نا! — افضال نے کہا — "تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ مہنیں بہت تنگ

کیا کرتا تھا.... دیکھ لینا! جو! جس جس نے تم پر بُری نظر رکھی ہے اُس کا انجام یہی ہو گا۔ اُسے

خدا تمھارے سامنے سزا دے گا.... اور یہ اکبر علی؟.... میں نے اُسی وقت اس کی نظریں دیکھ

لی تھیں جس وقت وہ یہاں تمھارے پیچھے آیا تھا۔ وہ میری اور تمھاری محبت کو کاٹنا چاہتا

ہے۔ وہ تمھارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے نا! میرے خلاف تمھیں گمراہ کر رہا ہے۔



اُسے بڑا اچھا موقع مل گیا ہے۔ آج کل کسی کی طرف اشارہ کر کے کہہ دو کہ وہ جاسوس ہے تو تصدیق کیجئے بغیر اُسے پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے پھر اُس کی رہائی کی کوئی صورت ہی نہیں بنتی خواہ وہ بیگناہ ہی ہو.... اکبر علی مجھے جاسوس کہہ کر گرفتار کرانا چاہتا ہے۔ اس کے پہلے وہ تمہارے دل میں میرے خلاف نفرت پیدا کر رہا ہے تاکہ تم مجھے بیگناہ نہ سمجھو۔ ”خدا تمہارے دشمنوں کو گرفتار کرے افضل جی!۔“ ہجرہ نے بیباکگی سے افضل کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر بڑے ہی جذباتی لہجے میں کہا۔ ”میں اب اُس مرزدوں کی باتیں نہیں سنا کروں گی۔“

ہجرہ کو روحانی سکون محسوس ہونے لگا۔ صوبیدار اکبر علی نے افضل پر جو بھونڈا اور مکروہ سا ہردپ چڑھادیا تھا، وہ اُتر گیا تھا۔ اب افضل اُسے اپنے اصلی اور قدرتی روپ میں نظر آنے لگا تھا۔ افضل کا یہ کمرہ تو ہجرہ کے معجز اور مغموم وجود کی پناہ تھا اور افضل اُس کے لیے ہوا سے بھرے ہوئے مشکیزے کی مانند تھا جس پر وہ رنج و الم کے سیلاب میں بے خوف و خطر تیر رہی تھی۔

”میرے پاس بیٹھو ہجو!۔“ افضل نے اُسے چارپائی پر اپنے ساتھ لگا کر بٹھالیا اور اُس سے پوچھا۔ ”اکبر علی نے تمہیں اور کیا کہا تھا؟“

”کہتا تھا میں لڑائی سے بھاگ کر نہیں آیا۔“ ہجرہ نے افضل کو بتایا۔ ”کہتا تھا کہ میں اُس دشمن کے خلاف لڑ رہا ہوں جو کسی کو نظر نہیں آتا اور وہ وزیر آباد میں موجود ہے۔ اُس نے مجھے سمجھایا تھا کہ ہندوستان کے جاسوس کیا کرتے ہیں.... اور افضل جی! میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں۔ رات کو جہاز آئے تھے نا! انہوں نے ہم گمراہ تھے۔ اُس وقت اکبر علی کی جیب سے آوازیں آتی تھیں۔ اکبر علی نے مجھے بتایا تھا کہ ہندوستان کے جاسوس جہاز چلانے والوں کو بتا رہے ہیں کہ ہم یہاں پھینکو۔ پھر اکبر علی نے ہی مجھے بتایا تھا کہ ہم وہاں نہیں گئے جہاں دشمن کے جہاز گرانے آئے تھے، دُور گئے ہیں۔“

”کیا وہ رات کو تمہارے پاس آیا تھا؟“ افضل نے پوچھا۔ ”تم گھر میں اکیلی نہیں تھیں؟“ اکیلی تھی۔“ ہجرہ نے کہا۔ ”پہلے تو میں اُسے دیکھ کر ڈر گئی تھی لیکن اُن نے مجھے مٹی کہا اور ایسی باتیں کہیں کہ مجھ میں جوش پیدا ہو گیا۔“ ہجرہ نے افضل کو وہ ساری باتیں سنائیں جو صوبیدار اکبر علی نے اُس کے ساتھ کی تھیں، پھر اُس نے کہا تھا کہ تم افضل کے پاس جاتی رہنا اور اُس پر نظر رکھنا اور اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہیں میری جیب سے جس طرح کی آوازیں سنائی دی ہیں، اگر ایسی آوازیں افضل کے کمرے میں سنائی دیں تو مجھے فوراً بتانا۔

”اُس نے تمہارے ساتھ چھپ چھپا کر تھوڑی سی ہوگی!۔“ افضل نے کہا۔ ”نہیں افضل جی!۔“ ہجرہ نے کہا۔ ”اُس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جیسی وہ پہلے کیا کرتا تھا، بلکہ مجھے تو شک ہو گیا تھا کہ یہ کوئی اور ہے، یہ اکبر علی نہیں ہو سکتا.... وہ جانے لگا تو اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور چلا گیا۔ وہ تو بالکل بدل گیا ہے۔“

افضل گہری سوتح میں کھو گیا۔  
”کیا سوتح رہے ہو افضل جی؟“

”کچھ نہیں ہجو!۔“ افضل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”خیال رکھنا، وہ بالکل نہیں بدلا۔ وہ تمہیں دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ پھر تمہارے پاس آئے تو مجھے بتانا کہ اُس نے کیا باتیں کی ہیں۔“ ”ضرور بتاؤں گی۔“ ہجرہ نے کہا۔ ”اور افضل جی! میری ایک بات مان لو۔ گھر والے لاہور چلے گئے ہیں۔ میں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں۔ رات کو میرے پاس آجایا کرو نا! مجھے اکبر علی سے ڈر آنے لگا ہے۔“

”میں ہجو!۔“ افضل نے کہا۔ ”میرا تمہارے پاس رات کو آنا ٹھیک نہیں.... تم بہت سیدھی ہو ہجو! لوگ اعتراض کریں گے، باتیں بنائیں گے۔ صرف اسی شخص کو دیکھ لو۔ اس کی نیت دیکھ لو۔ مگر میں تمہارے پاس آیا تو یہ بد معاش اکبر علی مجھے گرفتار کر دے گا.... تم جاؤ۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے ضرور بتانا۔“

★

اُس روز گیارہ بجے کے لگ بھگ اقبال کی ذہنی اور جذباتی حالت نارمل ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔

”کون ہے یہاں؟“ اقبال نے پوچھا۔

”میں ہوں سر! نرسنگ اردلی!“

”لائٹ آن کرو۔“ اقبال نے کہا۔ ”نہیں، رہنے دو۔ بلیک آؤٹ ہوگا۔“ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ”مجھے یاد نہیں رہا تھا میں شہر میں ہوں.... وقت کیا ہے؟“

”گیارہ بجنے والے ہیں سر!۔“ نرسنگ اردلی نے کہا۔ ”آپ کے والد صاحب اور والدہ صاحبہ آئی ہوئی ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“

”باہر بیٹھے ہوئے ہیں سر!“

”اوہ!۔“ اقبال نے پریشان سا ہو کے کہا۔ ”بے چارے رات گیارہ بجے تک بیٹھے ہوئے ہیں؟“

”رات نہیں سر!۔“ نرسنگ اردلی نے کہا۔ ”دن ہے۔ دن کے گیارہ بجے ہیں۔“

”پھر مجھے نظر کیوں نہیں آ رہا؟“ اقبال نے پوچھا۔ ”میری آنکھوں پر پٹی تو نہیں بندھی ہوئی!“

”سر!۔“ نرسنگ اردلی نے کہا۔ ”میں ایم او صاحب کو اطلاع دیتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ صاحب جاگیں تو فوراً اطلاع دینا۔“

بیسٹینٹ اقبال مسلسل بے ہوشی میں رہا تھا، پھر اُسے بے ہوشی کے انجکشن دیئے جاتے رہے۔ اس دوران ڈاکٹروں نے دیکھ لیا تھا کہ اقبال کی بنیادی ختم ہو چکی ہے۔ اب



☆  
 لمجره اُس رات بھی اکیلی تھی۔ صوبدار اکبر علی اُس رات بھی اُس کے پاس گیا۔



”گلی کون سی تھی؟“ اکبر علی نے پوچھا۔  
 ”کسی مسجد والی گلی کا نام بتاتے تھے۔“ کیپٹن طارق نے جواب دیا۔  
 ”مسجد والی گلی؟“ اکبر علی نے کہا۔ ”مجھے وہاں سے گزرنا تھا لیکن میں دوسری گلی میں  
 چلا گیا تھا۔۔۔ ہاں سر! پھر کیا ہوا؟ وہ آدمی زندہ ہے؟“

”زندہ ہے۔“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”ڈاکٹر مایوس تھا کہتا ہے زخم ہلکے حد تک گہرے  
 ہیں۔ مجھے اس واردات میں دیکھی نہیں لینی چاہیے تھی۔ یہ پولیس کا کیس ہے۔ میں ویسے ہی  
 سب انسپکٹر کے ساتھ زخمی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ ہوش میں تھا۔ اُس سے پوچھا کہ اُس  
 پر کس نے حملہ کیا ہے؟ اُس نے کہا۔ ”میرا کوئی دشمن نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کسی کے  
 دھوکے میں مجھ پر حملہ کیا گیا ہے۔ وہ کسی اکبر علی کا نام لے رہے تھے۔ شاید صوبیدار۔۔۔“

”اس کی بات پوری نہیں ہوتی تھی کہ اُس پر غشی طاری ہو گئی۔ اُسے فوراً ہسپتال لے  
 گئے۔ میں نے آپ کا نام سنا تو میں بھی ساتھ چلا گیا اور ڈاکٹر سے کہا کہ وہ اس کا زخمی بیان  
 لینے کی کوشش کرے۔ اگر جنگ نہ ہوتی تو اس شخص کو فوراً مر جانا تھا کیونکہ اُسے خون کی  
 ضرورت تھی جو اُسے اتنی جلدی نہیں مل سکتا تھا۔ جنگ کی یہ برکت ہے کہ لوگوں نے بالٹیوں  
 اور کنستروں کے حساب سے خون دے رکھا ہے اور دے رہے ہیں۔ بعض لوگ دو دو اور  
 بعض تین تین بار خون دے گئے ہیں۔۔۔“

”ڈاکٹر نے فوراً زخمی کے خون کا گرد پ دیکھا اور اسے خون لگا دیا۔ اس کے زخموں کی  
 مرہم ٹی بھی شروع کر دی۔ اب کوئی آدھ گھنٹہ پہلے وہ ہوش میں آیا اور اُس نے بیان دیا ہے  
 .... اُس نے بتایا کہ وہ گلی میں جا رہا تھا۔ مسجد والی گلی میں داخل ہوا تو پیچھے سے کوئی  
 آدمی آئے اور اُسے چاقو یا چھریاں مار گئے۔ اُس نے پیچھے دیکھا۔ بلیک آؤٹ کی تاریکی میں  
 اُسے دو آدمی نظر آئے لیکن انہیں پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ وہ گھرنا نہیں چاہتا تھا، اپنے گھر  
 تک جاسکتا تھا لیکن یہ سوتھ کر گر پڑا کہ حملہ کرنے والے اُسے مارا ہوا سمجھ کر چلے جائیں اور  
 اس پر مزید وار نہ کریں۔۔۔“

”ان میں سے ایک نے کہا۔ اُڑا رہے دو، چلو یہاں سے۔“ دوسرے نے کہا  
 ”کھڑو۔ دیکھ لینے دو، مر گیا ہے یا مر رہا ہے۔“ اس آدمی نے یا دوسرے نے زخمی  
 کے منہ پر مارتی کی روشنی ڈالی اور بولا۔ ”یہ تو کوئی اور ہے۔ اکبر علی تو نہیں۔ وہ بدبخت  
 صوبیدار ادھر ہی آیا تھا۔“ اس کے ساتھی نے کہا۔ ”جائے دو۔ مت رکو یہاں۔ مرنے دو  
 جو کوئی بھی ہے۔ ہمارا باپ تو نہیں۔“ وہ دونوں چلے گئے۔ زخمی نے اُسٹھنے کی کوشش کی تو  
 اُسے زخموں میں اتنا شدید درد ہوا کہ اُسٹھ نہ سکا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک آدمی ادھر آیا اور اسے  
 دیکھ کر رک گیا۔ اُس کے شور مچانے سے یا لوگوں کو گھروں سے بلانے سے زخمی تھانے اور  
 پھر ہسپتال پہنچا۔۔۔ صوبیدار صاحب! آپ نے غلطی سے اپنے آپ کو بے نقاب کر دیا  
 ہے۔ یہ حملہ آپ پر ہوا تھا۔“

★  
 وہ جب اس کمرے تک پہنچے تو کمرے کا دروازہ بند دیکھا۔ ہاتھ لگایا تو کوارٹر کھل گئے۔  
 کیپٹن طارق اور صوبیدار اکبر علی بڑی تیزی سے اندر گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں جلتی  
 ہوئی ٹارچیں تھیں۔ انہوں نے ٹارچوں کی روشنی میں کمرہ دیکھا۔ کمرہ خالی تھا۔ ایک دیوار میں  
 بغیر کواڑوں کے دو الماریاں تھیں۔ ایک خانے میں ایک قرآن مجید اور چند ایک پارے  
 رکھے ہوئے تھے۔ ایک چارپائی تھی جس پر بستر نہیں تھا۔

کمرے کے پیچھے بھی ایک کمرہ تھا۔ اس میں گئے۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کمرہ  
 غسل خانے کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا۔ اس میں ایک لوٹے کے سوا کچھ بھی نہیں  
 تھا۔ کیپٹن طارق اور صوبیدار اکبر علی نے دیواروں کو بڑی غور سے دیکھا۔ یہ پرانے زمانے  
 کا کمرہ تھا۔ اس کی اینٹوں کو بھی دیکھا لیکن دیوار کہیں سے بھی اکھاڑی ہوئی نہیں تھی۔ وہ دیکھ  
 رہے تھے کہ ہو سکتا ہے کہیں جاسوسوں والا دائرہ پولیس ٹرانسمیٹر چھپا ہوا مل جائے یا اس  
 کے آثار مل جائیں لیکن ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی۔

وہ تھانے میں آ گئے۔ تھانے کے انچارج انسپکٹر شاہ کو کیپٹن طارق نے یہ ڈیوٹی دی  
 کہ وہ اس گلی میں ایک دو منبر مقرر کر دے۔ انسپکٹر شاہ کو افضال کا حلیہ بتا کر کہا گیا کہ اس  
 آدمی کو جس کا نام افضال ہے گرفتار کرنا ہے۔

”اس گلی کے بچے اُس کے پاس قرآن پڑھنے جاتے تھے۔“ صوبیدار اکبر علی نے کہا۔  
 ”یہ شخص محلے میں باعزت سمجھا جاتا تھا۔ گلی کے ہر گھر میں اطلاع کر دیں کہ یہ شخص جہاں کہیں  
 نظر آئے یا کمرے میں آئے، تھانے خبر دیں۔ لوگوں سے کہیں کہ وہ انڈیا کا جاسوس ہے۔“  
 انسپکٹر شاہ کو احکام اور ہدایات دے کر کیپٹن طارق نے صوبیدار اکبر علی کو الگ بٹھالیا اور  
 اُس سے پوچھا کہ اُسے کس طرح پتہ چلا تھا کہ افضال جاسوس ہے اور اُس نے اُسے فوری  
 طور پر پکڑنے کی کوشش کیوں نہ کی۔

صوبیدار اکبر علی نے بتایا کہ اُسے کس طرح شک ہوا تھا اور وہ کس طرح اُس کی  
 نقل و حرکت پر نظر رکھتا رہا ہے۔ اکبر علی نے ہجرہ کے متعلق بتایا کہ وہ کون ہے اور کیا  
 ہے اور وہ افضال کے کمرے میں جاتی رہتی ہے۔ لیفٹیننٹ اقبال کے گھر کی  
 نوکرانی ہے۔

”لیفٹیننٹ اقبال؟“ کیپٹن طارق نے چونک کر پوچھا۔ ”جس کی بہن، کیا نام تھا اُس  
 کا۔۔۔ ہاں، شمع، ایک لڑکے کے ساتھ پکڑی گئی تھی؟“



”جی سر! — اکبر علی نے کہا — اس نوکرانی کو آپ نے تھانے میں دیکھا ہوگا۔ لیفٹیننٹ اقبال کی ماں کے ساتھ پولیس اسٹیشن میں آئی تھی۔“

”اچھا... وہ لڑکی! — کیپٹن طارق نے کہا — وہ تو بہت خوبصورت لڑکی ہے... صوبیدار صاحب! مجھے اس خاندان پر شک ہے۔“

”نہیں سر! — اکبر علی نے کہا — میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ خاندان بالکل صاف ہے۔ ان لوگوں پر جاسوسی کا شک نہ کریں۔ لیفٹیننٹ اقبال صاحب بیدیاں سیکڑ سے زخمی ہو کر لاہور سی۔ ایم۔ ایچ میں پڑے ہیں۔ مجھے کئی اطلاع مل چکی ہے کہ ان کے بینائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہے۔“

”آپ نوکرانی کی بات کمر رہے تھے۔“ کیپٹن طارق نے کہا — ”پہلے یہ بتائیں کہ یہ لڑکی کیسی ہے۔ کیا وہ جاسوسی کر سکتی ہے؟“

”اللہ کی گائے ہے۔“ اکبر علی نے کہا — ”مقبوضہ کشمیر سے آئی تھی۔ ماں باپ مر گئے اور یہاں تک پہنچ گئی۔ میں نے اُسے جنگ سے پہلے دیکھا ہے۔ بہت سیدھی بلکہ بدھو ہے۔“

اکبر علی نے کیپٹن طارق کو یہ تو نہ بتایا کہ وہ اس لڑکی کو پھانسنے کی کوشش کرتا رہا ہے اس نے ۲۰ ستمبر کے بعد کی بات سنائی کہ ہجرہ کو اُس نے بڑی اچھی طرح دیکھا تھا کہ کیسی لڑکی ہے۔ دیکھنے کی جہ یہ بتائی کہ وہ افضال کے پاس جاتی تھی۔ افضال کے متعلق تو اُسے شک ہو ہی گیا تھا۔ اُس نے کیپٹن طارق کو یہ بھی بتایا کہ وہ ایک روز افضال کے کمرے میں اُس وقت چلا گیا تھا جب ہجرہ اُس کے پاس موجود تھی۔

”میں نے اس کمرے کو دیکھا تھا۔“ اکبر علی نے کہا — ”مجھے کوئی مشکوک چیز نظر نہیں آئی تھی۔ میں اُسی رات لیفٹیننٹ اقبال صاحب کے گھر چلا گیا۔ گھر کے تمام افراد اقبال کو دیکھنے لاہور چلے گئے تھے، ہجرہ اکیلی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ افضال کے کمرے میں جاتی رہا کمرے اور اگر اُس کی کوئی مشکوک حرکت دیکھے تو مجھے فوراً بتائے۔“

”آپ نے اس لڑکی کو بتایا تھا کہ افضال انڈیا کا جاسوس ہے؟“ کیپٹن طارق نے صوبیدار اکبر علی سے پوچھا۔

”جی سر! — اکبر علی نے جواب دیا — میں نے اُسے...“

”صوبیدار صاحب! — کیپٹن طارق نے اُس کی بات کاٹ کر کہا — ”کیا آپ انٹیلی جنس کے صوبیدار ہیں؟ ایک بدھو اور اُن پڑھ لڑکی کو آپ نے اعتماد میں لے لیا اور توقع یہ رکھی کہ وہ آپ کے کہنے پر عمل کرے گی اور اس آدمی کو گرفتار کرے گی جسے وہ چاہتی ہے۔“

”اس غلطی کا احساس مجھے پہلے ہی ہو چکا ہے سر! — صوبیدار اکبر علی نے خفت کے لہجے میں کہا — ”کل لڑکی نے اُسے جانتایا کہ میں کتنا ہوں کہ افضال جاسوس ہے۔“

”آپ کی حماقت سے شکار ہاتھ سے نکل گیا ہے۔“ کیپٹن طارق نے کہا — ”آپ نے

دشمن کے پورے رنگ کو چومنا کر دیا ہے۔ افضال نے اپنا ٹھکانہ تبدیل کر لیا ہے... اور صوبیدار صاحب! ان لوگوں نے آپ کو راستے سے ہٹانے کی بڑی اچھی کوشش کی ہے۔ خدا نے آپ کو بچالیا ہے۔“

”میں سمجھ گیا ہوں سر! — اکبر علی نے کہا — جس وقت اس آدمی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اُس وقت میں اقبال صاحب کے گھر سے نکلا تھا۔ میں نے مسجد والی گلی سے گزرنا

تھا۔ مجھے یاد آ گیا ہے کہ میں جب اقبال صاحب کے گھر سے نکلا اور مسجد والی گلی کی طرف گیا تھا، اُس وقت دو یا تین آدمی پیچھے سے آرہے تھے یا کھڑے تھے۔ آگے جا کر میں مسجد والی گلی میں جانے کی بجائے بائیں والی گلی میں چلا گیا۔ میں جب اس گلی میں مڑا تو آگے سے کوئی آدمی آرہا تھا۔ وہ مسجد والی گلی میں مڑ گیا۔ حملہ آوروں نے مجھے دوسری گلی میں جاتے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ اُس آدمی کے پیچھے چلے گئے ہوں گے جو میرے قریب سے گزر گیا تھا۔ وہ اُسے اکبر علی سمجھ کر اُسے مار گئے۔“

”وہ لڑکی رات کو بھی گھر میں اکیلی تھی؟“

”جی سر! —

”اب وہ گھر میں نہیں ہوگی۔“ کیپٹن طارق نے کہا — ”وہ افضال کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔“

”میرا خیال ہے نہیں گئی ہوگی سر! —

”مجھے آپ کے کسی بھی خیال سے اتفاق نہیں۔“ کیپٹن طارق نے کہا — ”صبح ہو رہی ہے۔ جا کر دیکھیں اور مجھے رپورٹ دیں۔“

صوبیدار اکبر علی اٹھا اور تھانے سے نکل گیا۔ صبح کا اجالا صاف ہو رہا تھا۔ اکبر علی اُس گلی سے آیا جس میں افضال رہتا تھا۔ ہجرہ افضال کے کمرے کے سامنے کھڑی تھی۔ افضال کے پاس آئی ہو ہجرہ؟ — اکبر علی نے اُس سے پوچھا۔

”ہاں جی! — ہجرہ نے کہا — ”لیکن اُس کا کمرہ خالی ہے۔ اپنا سامان بھی لے گیا ہے۔“

”وہ بھاگ گیا ہے ہجرہ! — اکبر علی نے اُسے کہا — ”اُس کا پردہ اٹھ گیا ہے اس لیے بھاگ گیا ہے... وہ نہیں بتا کر نہیں گیا؟“

”نہ جی! — ہجرہ نے جواب دیا۔“

”اُس کے دل میں تمہاری محبت ہوتی تو تمہیں بتا کر جاتا۔“ اکبر علی نے کہا — ”جاؤ ہجرہ اپنے

گھر چلی جاؤ۔ یہ خیال بھی رکھنا کہ رات کو کوئی تمہارا دروازہ کھٹکھٹائے تو دروازہ نہ کھولنا۔“

★

وہ کیا جذبہ تھا، وہ کیا شان تھی! بھارت محاذوں پر نفری اور ہتھیاروں میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا ادھر پاک فوج کی نفری شہیدوں کی وجہ سے گھٹتی چلی جا رہی تھی۔ ادھر تازہ دم گمک آرہی تھی ادھر وہی لڑ رہے تھے جو ۶ ستمبر کی صبح مورچوں میں موجود تھے۔ اُن کے جسم ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ جنگی پیانوں کے مطابق وہ لڑنے کے قابل نہیں رہے تھے۔



آتی تھی کہ ہم پیچھے ہٹ آتے ہیں لیکن ہم نے کتاب بند کر دی اور توپوں اور مشین گنوں کے منہ کھول دیئے۔

کتاب سے ہٹ کر لڑنے والوں میں توپ خانے کا ذکر خاص طور پر آتا ہے۔ میڈیم اور ہیوی توپیں اگلے مورچوں سے بہت پیچھے، میلوں کے حساب سے پیچھے رکھی جاتی ہیں۔ ان کے لیے گڑھے کھود کر انہیں ان میں رکھا جاتا ہے، اوپر زمین کے رنگ کا جال ہوتا ہے تاکہ اوپر سے انہیں طیارے نہ دیکھ سکیں۔ یہ دور مار توپیں ہوتی ہیں۔ ان کی بیرلیں دائیں بائیں، اوپر نیچے ہوتی ہیں۔ ان کی پوزیشنیں نہیں بدلی جاتیں کیونکہ یہ بہت بڑی توپیں ہوتی ہیں لیکن دشمن نے چونکہ میں ٹینکوں کی افراط کی بدولت ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ ان بڑی توپوں کی پوزیشنیں بار بار بدلتی پڑتی تھیں۔

پاک آرٹلری کے کمانڈروں نے یہ کارنامہ کر دکھایا کہ میڈیم اور ہیوی توپوں کو گڑھوں میں رکھنے کی بجائے انہیں کھلے میدان میں لے آئے اور ٹینکوں کے ساتھ آگے سامنے کا معرکہ لڑا جسے توپ خانے کی زبان میں "اوپن سائٹ" کہتے ہیں۔ اس قسم کے معرکے میں نقصان توپ کا ہی ہوتا ہے کیونکہ ٹینک بھاگ دوڑ سکتا ہے، ہینٹرے بدل سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں توپ اپنی پوزیشن نہیں بدل سکتی۔ اس کی بیرل کو گھمایا پھرایا جاسکتا ہے لیکن اس کی رفتار ٹینک کی حرکت سے سست ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹینک ایک سے زیادہ ہول توڈہ ایک توپ کو بڑی جلدی ختم کر سکتے ہیں۔

ان تمام خطروں کو جانتے ہوئے چونکہ کے چوتیس میل وسیع و عریض میدان میں پاک آرٹلری کو ٹینکوں کے خلاف "اوپن سائٹ" معرکے کئی جگہوں پر لڑنے پڑے۔

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء ایک جذبے کی اور ایشیا کی کہانی ہے۔ یہ قوم اور فوج کی اس دیوار کی کہانی ہے جسے قرآن نے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کہا ہے۔ زندہ قومیں دیوار کھڑی نہیں کیا کرتیں دیوار بن جایا کرتی ہیں۔ وطن کے سرفروش اس عہد کے ساتھ محاذ پر جاتے ہیں کہ جسم اور زندگی کوئی چیز نہیں۔ ان کی اہمیت کچھ نہیں۔ مسلمان نام ہے روح اور ایمان کا۔ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے مردان نے ہر کی روایت کو زندہ کر دیا تھا۔

چونکہ میں پاکستان کے مجاہدین نے جنگ قادسیہ کی تاریخ کو دہرایا تھا۔ جنگ قادسیہ میں ایرانی ہاتھی لائے تھے جن کی پیشانیوں اور سونڈوں پر لوہے کے خول چڑھے ہوئے تھے، اور ان کے پہلوؤں میں اور پیچھے زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ اس طرح ہاتھیوں کو بکتر بند کیا گیا تھا۔

چونکہ میں دشمن کے جو ٹینک آگے تھے، ان میں ایک سولہویں کیو بری جنٹ تھی۔ اس کے ٹینکوں کا اقداری نشان سیاہ ہاتھی تھا۔ برٹینک کے آگے سیاہ ہاتھی کا سیکج بنا ہوا تھا۔ قادسیہ میں مسلمانوں نے ایرانیوں کے بکتر بند ہاتھیوں کو بڑی طرح زخمی کر کے بھکایا تھا۔ اس روایت کو مسلمانوں نے صدیوں بعد چونکہ میں تازہ کیا اور ہندوؤں کا آگنی غور توڑ ڈالا۔

یہ ان کا جذبہ تھا جو انہیں لڑا رہا تھا۔ یہ ایمان کی قوت تھی جس نے روح کی قوتوں کو بیدار کر دیا تھا، ورنہ جنگوں کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں کہ اکیس ڈویژنوں کا حملہ ساڑھے چار ڈویژنوں نے روک لیا ہو، جہاں پیادوں نے ٹینکوں کو روک لیا ہو، جہاں پچاس توپوں نے پانچ سو توپوں کو خاموش کر دیا ہو، جہاں ایک سو پینتیس پرانے اور سست رفتار طیاروں نے چھ سو بڑے اور جدید طیاروں کو فضا سے بے دخل کر دیا ہو اور جہاں دشمن کی ایروفرس کے کمانڈر انچیف نے اعلان کیا کہ دیا ہو کہ میں اپنے آسمانوں کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتا۔

بھارت کی نیوی کے مقابلے میں پاکستان کی نیوی ماہی گیروں کا بیڑہ لگتی تھی۔ بھارتی نیوی میں سب سے زیادہ خوفناک بحری جنگی طیارہ بردار جہاز "ڈکرائٹ" تھا۔ یہ سمندر پر تیار ہوا ہوائی اڈہ تھا۔ ہر لمحہ توقع تھی کہ بھارتی نیوی کا یہ جہاز کراچی کے قریب آجائے گا اور اس کے لڑاکا مہار طیارے کراچی بندرگاہ، ہوائی اڈے اور دیگر فوجی تنصیبات وغیرہ کو تباہ کر دیں گے اور یہ طیارے پاکستان نیوی کے جنگی جہازوں کو کھلے سمندر میں جانے ہی نہیں دیں گے۔

اس کے علاوہ بھارت کے پاس کئی اور بہت بڑے بڑے بحری جنگی جہاز تھے جو پاکستان نیوی کو ایک دن میں بیکار کر سکتے تھے لیکن پاکستان نیوی جس دلیری سے اور سرفروشی کے جس جذبے سے باہر نکلی اور جس عزم سے بحری غازیوں نے دشمن کی نیوی کو للکارا اس نے دشمن پر دہشت طاری کر دی۔ دہشت بھی ایسی کہ دشمن کا طیارہ بردار جہاز سامنے ہی نہ آیا۔ دوسرے جنگی جہاز بھی جہاں تھے وہیں دبکے رہے۔

سیالکوٹ سیکٹر میں چونکہ میدان حشر بنا ہوا تھا۔ بھارت نے ٹینک جھونکتا چلا جا رہا تھا۔ پاک فوج کے پاس ایک بھی فالتو ٹینک نہیں تھا جو چونکہ کی ٹینکوں کی جنگ میں بھیجتا ہو، ڈیڑھ سو ٹینک تھے جو پہلے روز میدان میں اترے تھے۔ اب ان کی تعداد کم ہو گئی تھی جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، بھارت باؤلا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی چالیں اور داؤد بولتے جا رہے تھے۔ اس نے راتوں کو مونٹین اور انفنٹری ڈویژنوں کے بریگیڈوں سے صحیح الفاظ میں، جہوم کی صورت میں پاکستانی پوزیشنوں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔

غیر ملکی جنگی مبصرین نے کہا تھا کہ بھارت چونکہ سے آگے نکلنے اور وزیر آباد تک پہنچنے کے لیے بہت بڑی قربانی دے رہا ہے لیکن پاکستانی جن کی تعداد بہت کم ہے اور جن کے پاس ٹینک بھی بہت تھوڑے ہیں، حیران کر دینے والی شجاعت سے لڑ رہے ہیں۔ زیادہ تر نقصان بھارت کا ہو رہا ہے اور بھارت اپنی پیادہ فوج کو پاکستانیوں کے ہاتھوں بے دردی سے موارہا ہے۔

پاک فوج جنگی ٹریننگ اور کتابی قاعدوں سے آزاد ہو کر لڑ رہی تھی۔ جنگ کے بعد ایک پاکستانی بریگیڈ نے کہا تھا "ہم نے دشمن کی جنگی طاقت دیکھی تو یہی ایک صورت سامنے



یہی کیفیت دوسرے محاذوں کی تھی جنگ کا عروج تھا شہیدوں اور زخمیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ فوجی ہسپتالوں میں جگہ نہیں رہی تھی۔ لاہور کے سی۔ ایم۔ ایچ میں تو زخمی کو کھڑا کر کے بھی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ جن زخمیوں کو دوسری چھانڈنیوں کے ہسپتالوں میں بھیجا جاسکتا تھا انہیں بھیج دیا گیا۔

لیفٹیننٹ اقبال کو کھاریاں سی۔ ایم۔ ایچ میں بھیج دیا گیا۔ اُس کے زخم زیادہ خطرناک نہیں تھے۔ مزید آپریشن یا خون دینے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ یہ صرف مرہم ٹی کا کیس تھا۔ اُس کی بینائی کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔ اُسے اب کسی بھی ہسپتال میں رکھا جاسکتا تھا۔ یہ اُس سے اگلے روز کا واقعہ ہے جب اکبر علی نے ہاجرہ کو افضال کے خالی کمرے کے باہر کھڑے دیکھا اور اُسے گھر بھیج دیا تھا۔ دن کے بارہ بجے کے لگ بھگ اقبال کا باپ اُس کی ماں اور بنیں لاہور سے واپس آ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گھر عورتوں اور مردوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔

صوبیدار اکبر علی کیپٹن طارق کو رپورٹ دے چکا تھا کہ ہاجرہ یہیں ہے اور اُسے افضال کے غائب ہو جانے کا علم نہیں۔

”کیا اس لڑکی کو یہاں بلا کر نہ پوچھا جائے؟“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”در کمر بول پڑے گی۔“

”نہیں سر!“ اکبر علی نے کہا۔ ”اس معصوم لڑکی کو تھانے نہیں بلاتیں گے۔ مجھے افضال کے غائب ہو جانے کی اس لحاظ سے خوشی ہے کہ یہ لڑکی اُس سے نکاح گئی ہے۔“

”صوبیدار صاحب!“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”مجھے آپ کی باتوں سے کچھ شک ہو رہا ہے۔ اس لڑکی کے ساتھ آپ کی خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ آپ کو شاید احساس نہیں کہ کتنے بڑے طاقتور دشمن کے ساتھ ہم لڑ رہے ہیں جس کا فتنہ کالم اور جاسوس ہمارے درمیان سرگرم ہیں۔ آپ کو میں ایٹلی جنس کے قابل نہیں سمجھتا۔ میں آپ کو آپ کی بتائیں میں واپس بھیج دوں گا اور آپ کو سیدھا فرنٹ پر بھیج دیا جائے گا۔“

”میرے ساتھ اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے کہ مجھے کوئی فرنٹ پر بھیج دے۔“

صوبیدار اکبر علی نے کہا۔ ”میں تھوڑی سی گستاخی کروں گا سر آپ کی مرضی ہے معاف کر دیں چاہے نہ کریں۔ آپ مجھے ایٹلی جنس کے قابل نہیں سمجھتے۔ کیپٹن طارق صاحب آپ کی اتنی عمر نہیں جتنی میری سروس ہو چکی ہے۔ میں جس وقت ایٹلی جنس میں آیا تھا اُس وقت آپ کے والد صاحب کی شاید شادی نہیں ہوئی تھی۔ آپ ابھی کتابوں کی باتیں کر رہے ہیں اور میں تجربے کی بات کر رہا ہوں۔“

”صوبیدار صاحب!“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”میری بات سمجھنے کی۔۔۔“

”سر!“ اکبر علی نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اگر میرا کوئی بچہ زندہ ہوتا تو وہ آپ جیسا جوان ہوتا۔ کوئی بھی زندہ نہیں۔ میری بیوی، میرے نیٹے، میرے ماں باپ،

میرا تایا، میرے چچے اور میرے خاندان کے اٹھارہ فرد اس ملک پر قربان ہو چکے ہیں۔ آپ ادھر کے رہنے والے ہیں۔ پاکستان نے قربانی تو ہم سے لی ہے جو ادھر سے آئے ہیں۔ میں نے تو بریگیڈ کمانڈر صاحب سے عرض کی تھی کہ مجھے ’ری کال‘ کیا ہے تو ففٹری بتائیں میں بھیج دیں، میں اُس ہندو کے ساتھ حساب برابر کرنا چاہتا ہوں جس نے دھوکے میں میرے پورے خاندان کو شہید کر دیا تھا مگر کمانڈر صاحب نہیں مانے۔“

”نہیں نہیں صوبیدار صاحب!“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ نے پاکستان کے لیے کوئی قربانی نہیں دی، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ غلطی کر رہے ہیں۔“

یہ سن کر کہ ۱۹۴۷ء میں صوبیدار اکبر علی کا پورا خاندان شہید ہو گیا تھا، کیپٹن طارق کا لب ولہجہ بدل گیا تھا اور اکبر علی کے متعلق اُس کی رائے بدل گئی تھی۔

”یہ نوکرائی کشمیر کی مہاجر ہے سر!“ اکبر علی نے کہا۔ ”یتیم ہے۔ اکیلی ہے۔ کردار کی اتنی پکی ہے کہ میں آپ کو بتاؤں تو آپ یقین نہیں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے صوبیدار صاحب!“ کیپٹن طارق نے کہا۔ ”اگر آپ یہی بہتر سمجھتے ہیں تو میں آپ سے اتفاق کروں گا۔“

”میں آپ کا مشکور ہوں سر!“ صوبیدار اکبر علی نے کہا۔ ”اللہ آپ کا اقبال بلند کرے۔ میں آپ کو آج ہی بتا دیتا ہوں کہ یہاں کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور۔ کوئی واقعہ ہو گا۔۔۔ سر!“

میں تو رات کو کم ہی سوتا ہوں۔“

”اللہ مددگار ہے صوبیدار صاحب!“ کیپٹن طارق نے کہا۔

★

لیفٹیننٹ اقبال کے ماں باپ پچھلے پہر کھاریاں چلے گئے۔ شمع نہ جاسکی کیونکہ اُسے لاہور میں ہی بخار ہو گیا تھا۔ دوائیاں لینے کے باوجود بخار ذرا سا بھی کم نہیں ہوا تھا۔ شمع کی چھوٹی بہن اور ہاجرہ شمع کے لیے گھر رہ گئی تھیں۔

اقبال کھاریاں سی۔ ایم۔ ایچ میں پہنچ چکا تھا اور وہ افسروں کے انگ کمرے میں تھا۔ اُس کے ماں باپ جب اُس کے کمرے میں گئے اُس وقت کیپٹن عصمت اُس کے پاس بیٹھی ہوتی تھی۔ اقبال کی ذہنی حالت بالکل نارمل تھی۔ وہ کیپٹن عصمت کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے ماں باپ کمرے میں داخل ہوئے تو کیپٹن عصمت نے اُسے بتایا۔

”عصمت بیٹی!“ اقبال کی ماں نے کہا۔ ”اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ تم یہاں ہو۔ میرے بیٹے کی دیکھ بھال ہوتی رہے گی۔“

”لیکن خالہ جان!“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”میں ہر وقت ان کے ساتھ تو نہیں رہ سکتی۔ مجھے تو ایک منٹ کی فرصت نہیں ملتی۔ کبھی کبھی دیکھ جایا کروں گی۔ ان کی آپ فکر نہ کریں۔ یہ تو جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے گھر کا کوئی ایک آدمی یا ایک عورت ان کے ساتھ رہ سکتی ہے۔“



”کون رہے گا بیٹی؟“ اقبال کی ماں نے کہا۔  
 ”شمع رہ جائے گی۔“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آتی؟“  
 ”ایک سو دو سے اوپر بخار ہے اُسے۔“ اقبال کی ماں نے کہا۔ ”لے دے کے ایک نوکرانی ہے۔“

”اُس کو بھیج دیں۔“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”اُس کے کھانے کا انتظام ہو جائے گا۔  
 فرش پر بچھانے کے لیے اُسے گدامل جائے گا۔ اقبال کے ساتھ کسی کاربنا ضروری  
 ہے۔ یہ چلنا پھرنا چاہے گا جو اس کے لیے ضروری ہے۔ کوئی ساتھ ہونا چاہیے۔“  
 اقبال کی ماں کے آنسو نکل آئے۔ کیپٹن عصمت اُسے اور اقبال کے باپ کو باہر  
 لے گئی۔

”اُس کے سامنے رونا نہیں۔“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”اُس کے ساتھ کوئی جذباتی  
 بات نہ کرنا۔ اسے اس معذوری کا احساس نہ دلانا۔ خالہ جان بڑی بڑی تلخ حقیقتیں قبول  
 کرتی پڑتی ہیں۔ اس وقت مطمئن ہے، بلکہ خوش ہے کہ اس نے ملک کی خاطر قربانی دی ہے۔  
 اس کی اس خوشی کو قائم رہنے دیں۔ میں آپ کو یہ مشورہ بھی دوں گی کہ آپ ہر روز نہ آئیں  
 ورنہ اس کے اندر محرومی اور معذوری کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ آپ اس کے ماں باپ ہیں۔  
 آپ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ کریں، مرنے سے کوئی نہ کوئی ایسی بات نکل ہی جاتی ہے جو اس کے  
 جذبات کو مجروح کر سکتی ہے۔ آپ ٹھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھیں اور واپس چلے جائیں۔ وزیر آباد وہیں  
 یہ قریب ہی تو ہے۔ رات کو نوکرانی کو ان کے پاس چھوڑ جائیں۔“

★

اقبال کے باپ کیپٹن عصمت کے کہنے پر عمل کیا۔ اقبال کی ماں کو جلدی واپس لے  
 گیا اور رات آٹھ بجے تک باجرہ کو ساتھ لے آیا۔

”میری روح بھی تم پر فخر کیا کرے گی اقبال بیٹا!۔“ باپ نے اقبال سے کہا۔  
 ”میں نے پاکستان بنایا تھا، تم نے پاکستان کو بچایا ہے۔“

”مجھے آنکھوں کا افسوس نہیں آتا جان!۔“ اقبال نے کہا۔ ”افسوس یہ ہے کہ میں  
 بڑی جلدی زخمی ہو گیا ہوں۔ میں تو آخر دم تک لڑنے گیا تھا۔ مجھے خدا نے اس مقدس فرض  
 سے بڑی جلدی سکدوش کر دیا ہے۔ میں نے ابھی پاکستان کو نہیں بچایا آتا جان! ابھی جنگ جاری  
 ہے۔ آج کی خبریں کیا ہیں؟ بیدیاں سیکڑ کی کوئی خبر؟“

باپ نے جو خبریں سنی تھیں وہ اُسے سنا دیں اور اُسے بتایا کہ وہ اس کے لیے ٹرانسٹر  
 لے آیا ہے اور یہ بھی کراب باجرہ اُس کے ساتھ رہے گی۔

”یہ آپ نے اچھا کیا ہے۔“ اقبال نے کہا اور سنس پڑا۔ کہنے لگا۔ ”اب تو کسی کا  
 ہاتھ پکڑ کر ہی چل سکوں گا۔۔۔ ماں ابا جان! عصمت نے مجھے بتایا ہے کہ شمع کارشہ جس لیفٹیننٹ  
 لطیف کے ساتھ طے ہوا ہے وہ بھی زخمی ہو کر یہاں آیا ہوا ہے۔ عصمت مجھے اُس کے

کمرے تک لے جاتے گی۔ عصمت نے یہ بھی بتایا ہے کہ شمع اس ہسپتال میں زخموں کی دیکھ بھال  
 کے لیے آئی تھی اور اتفاق سے وہ اُسی کمرے میں رہی جس میں لیفٹیننٹ لطیف ہے۔“

”ماں بیٹا!۔“ باپ نے کہا۔ ”ایسے ہی ہوا ہے۔“  
 ”ابا جان!۔“ اقبال نے پوچھا۔ ”باجرہ کی بجائے شمع آجاتی تو اچھا نہ ہوتا؟“  
 ”ہم نے کہیں بتایا نہیں اقبال!۔“ باپ نے جواب دیا۔ ”شمع کو لاہور میں ہی  
 بخار ہو گیا تھا۔ آج ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ یہ مائینٹائیڈ ہے۔ تمہاری چھوٹی بہن کو بھیجنا نہیں  
 چاہتا تھا اور تمہاری ماں یہاں رہ نہیں سکتی۔ رہ بھی جائے تو تمہیں دیکھ دیکھ کر روتی رہے  
 گی اور تمہیں بھی پریشان کرے گی۔“

باپ جانے کے لیے اٹھا اور اقبال کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر  
 چوما اور چلا گیا۔

★

باجرہ کمرے میں رکھے ہوئے بیچ پر بیٹھی اقبال کو دیکھے جا رہی تھی۔ اُس کا دھیان ادھر  
 آیا ہی نہیں تھا کہ باپ بیٹا کیا باتیں کر رہے ہیں۔ وہ اپنی سوچوں اور خیالوں میں گم تھی۔ اُسے  
 وہ اقبال یاد آ رہا تھا جس نے باورچی خانے میں اُس کی عزت صرف دو روپوں میں خریدنی چاہی  
 تھی، پھر اُس نے قیمت بڑھا کر بیس روپے کر دی تھی۔  
 یہ خیال آیا اور گزر گیا۔

وہ سوچنے لگی کہ یہ اقبال تو بے بس ہے، محتاج ہے جو کسی کا ہاتھ پکڑے بغیر چل ہی نہیں  
 سکے گا۔ باجرہ کو یاد آیا کہ اُس نے ایک بار اقبال کی ایک یہودہ حرکت پر چل بھن کر بددعا دی  
 تھی۔ ”خدا کرے تو امدھا ہو جائے اور ٹھوکریں کھاتا پھرے۔“

ایک تیر باجرہ کے دل میں اُتر گیا۔ اُسے خدا پر غصہ آنے لگا جس نے اُس کی ایک ہی  
 دُعا قبول کی اور کون سی قبول کی۔ باجرہ کو یہ خیال بھی آ گیا کہ اقبال اپنی آنکھوں کی روشنی کہاں  
 دے آیا ہے۔

”آہ، ماں کا شہزادہ بیٹا!۔“ باجرہ کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ ”زخمی ہو کر نہ جلنے کتنی  
 دیر محاذ کی مٹی میں تڑپتا رہا ہو گا۔“

ایک وہ خوبصورت اقبال تھا جس کا چہرہ بھرا بھرا اور آنکھوں میں جوانی کا خمیر تھا۔ باجرہ کو اُس  
 چہرے سے نفرت تھی۔ ایک یہ چہرہ تھا جس پر ٹپیاں بندھی تھیں اور جس کا رنگ محاذ کی مٹی جیسا  
 ہو گیا تھا۔ اور وہ آنکھیں جن میں شباب کی نشلی چمک تھی، بے نور تھیں۔ باجرہ کو یہ چہرہ اتنا اچھا لگا  
 کہ وہ بے تاب اور بے قابو ہو گئی۔ اُس وقت اقبال کا باپ جا چکا تھا۔ کمرے میں زیر و کاہلب  
 چل رہا تھا کیونکہ بیک آؤٹ تھا۔ روشنیوں، کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں پر سیاہ ہاتھ  
 چڑھا دیئے گئے۔ روشنی باہر نہیں جانی تھی پھر بھی زیر و کے بلب جلانے جاتے تھے۔  
 اقبال کے باپ کے جانے ہی باجرہ تیزی سے اٹھی اور اقبال کے بیڈ کی پانچ



کے قریب جا پہنچی۔  
”اقبال جی!— اُس نے یوں کہا جیسے بچکی لی ہو اور سر اقبال کے پاؤں پر رکھ کر سک سک کر رونے لگی۔

”کون؟— اقبال نے جو بیڈ پر ناگیں لمبی کر کے بیٹھا ہوا تھا، ہاتھوں سے ٹٹول کر ہاتھ ہاجرہ کے سر پر رکھے اور بولا— ”ہاجرہ! یہ تم ہو؟ .... کیا ہو گیا ہے تمہیں ہاجرہ؟“  
”اقبال جی!— ہاجرہ نے اُس کے پاؤں سے سر اٹھا کر بے تابی سے اقبال کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اس ہاتھ کو کتنی بار چوم کر بولی— ”مجھے بخش دینا اقبال جی! مجھے بخش دینا۔ میری زبان کالی ہے۔ اللہ نے میری دعا کبھی نہیں سنی بد دعا سن لی ہے۔ میں نے کہا تھا، خدا کرے تو اندھا ہو جاتے۔“

”اوہ بھلی ہاجرہ!“ اقبال نے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا— ”تجھے کس نے بتایا ہے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ میری آنکھیں شہید ہوتی ہیں ہاجرہ! میں نے اپنی آنکھیں اللہ کی راہ میں قربان کی ہیں۔ شہیدوں پر رونا گناہ ہے۔“ اقبال ہنس پڑا۔

ہاجرہ بیڈ پر بیٹھ گئی اور اُس نے نظریں اقبال کے چہرے پر جمادیں۔ وہ تصور میں اُس اقبال کو دیکھ رہی تھی جو باورچی خانے میں اُسے چھیڑ کر ہنسا کرتا تھا۔ وہ ہنسی مکروہ تھی۔ ہاجرہ کو اقبال کے اتنے اچھے دانت بہت بُرے لگتے تھے .... اقبال آج ہسپتال کے بیڈ پر بھی ہنسا تھا۔ ہاجرہ کو یہ ہنسی بڑی پیاری لگی۔ اقبال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ہاجرہ نے بے اختیار چاہا کہ وہ اقبال کی اس ہنسی اور اس مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں میں سمیٹ لے۔ وہ سیدھی سادی لڑکی جو محبت اور نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھتی تھی، جان نہ سکی کہ اقبال کی اس ہنسی اور مسکراہٹ میں کیا جادو ہے۔ اس ہنسی میں شگفتگی، مردانگی اور روح کا نور شامل تھا۔

”ہاجرہ!— اقبال نے کہا— ”تم مجھے بخش دینا۔ میں تمہیں بہت تنگ کیا کرتا تھا۔ تم نے مجھے معاف نہ کیا تو خدا میری یہ قربانی قبول نہیں کرے گا۔“

”ایسی باتیں نہ کرو نا، اقبال جی!“ ہاجرہ نے اپنی فطری سادگی سے کہا— ”میں کون ہوتی ہوں بخشنے والی۔ تمہیں اس حال میں دیکھ کر میں خوش تو نہیں ہوں اقبال جی! .... ان باتوں کو چھوڑنا، مجھے کچھ اور بتاؤ۔“ وہ چُپ ہو گئی۔

ہاجرہ اُس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتی تھی، بہت سی باتیں کہنا چاہتی تھی مگر دہس میں پوچھنے اور کہنے والی باتوں کا جوم ایسا گڑبڑا کہ وہ چُپ چاپ اقبال کے چہرے کو دیکھنے لگی جس کے ایک کمال پر روتی اور اس پر پٹی کا پیڈ رکھا تھا اور اس پر ٹیپ لگی ہوتی تھی اور جو چہرہ نہ لگا تھا اُس پر دھوپ، پھٹتے گولوں کی تپش، گرد و غبار اور شب بیداری نے سالوں کی تہ جہادی تھی۔ ہاجرہ کو بچھا بچھا، پھیکا پھیکا سارنگ بڑا پیارا لگا۔ اُس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اقبال کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”اقبال جی!“ ہاجرہ نے کہا— ”تمہاری طرح بہت سے خوبصورت جوان زخمی

ہوتے ہوں گے!“

”شہید بھی ہو گئے ہیں ہاجرہ!“ اقبال نے کہا— ”اور شہید ہو رہے ہیں .... نہیں شہید ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں کی قربانی دینی چاہیے تھی۔“  
”پر اقبال جی!“ ہاجرہ نے معصوم آواز میں کہا— ”اندھا ہونا اچھی بات تو نہیں ہے ناجی! تم اتنے خوبصورت اور جوان ہو۔“

”اندھا میں نہیں ہوا ہاجرہ!“ اقبال نے کہا— ”اندھا ہمارا دشمن ہو گیا ہے۔ وہ پاکستان کو ہندوستان میں شامل کرنا چاہتا ہے، پھر وہ ہندوستان سے اسلام کا نام و نشان مٹانا چاہتا ہے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں سے محمد بن قاسم اور غزنوی کا انتقام لینا چاہتا ہے۔“  
”یہ دونوں کون ہیں؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

اقبال ہنس پڑا۔ وہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ کس کے ساتھ بات کر رہا ہے۔

”ایک اور بات بتاؤ نا، اقبال جی!“ ہاجرہ نے اپنا پہلا سوال نظر انداز کر کے پوچھا— ”تم نے کتنے ہندوؤں کو قتل کیا ہے؟“  
”میں اکیلا نہیں تھا ہاجرہ!“ اقبال نے کہا— ”ہم سب نے مل کر بہت سارے ہندوؤں کو مارا ہے۔“

”بہت سارے کتنے ہوتے ہیں اقبال جی؟“ ہاجرہ نے پوچھا— ”بیس سے کم ہوتے یا زیادہ؟“  
”بیس بہت تھوڑے ہوتے ہیں ہاجرہ!“ اقبال نے کہا— ”کتنی سوبلہ کتنی ہزار سمجھ لو۔“

”بس اقبال جی؟“ ہاجرہ نے بچوں کے اشتیاق سے کہا۔

”تمہیں خوشی ہوئی ہے ہاجرہ؟“

”ہاں ناجی!“ ہاجرہ نے کہا— ”کشمیر میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو گھروں میں آکر قتل کیا تھا۔ بچوں کو بھی اقبال جی عورتوں کو بھی۔ اور جو بچ گئے تھے وہ ادھر بھاگ آئے تھے .... کشمیر میرا وطن ہے نا، اقبال جی!“

”ہاں ہاجرہ!“ اقبال آہ لے کر بولا— ”کشمیر تمہارا وطن ہے۔ کشمیر کشمیریوں کا ہے، اور کشمیر .... وہ چُپ ہو گیا۔ اُسے خیال آ گیا کہ وہ جو کہنے لگا ہے وہ ہاجرہ کی سمجھ سے بالا ہے۔

★

اتنے میں اقبال کا کھانا آ گیا۔ اُس نے کھانا لانے والے سے پوچھا کہ وہ ہاجرہ کے لیے بھی کھانا لاسکتا ہے؟

”کیوں نہیں سر!“ کھانا لانے والے نے کہا— ”محاذ کے زخمیوں کی ہر بات کو ہم تم سمجھتے ہیں سر! ابھی اور لے آتا ہوں۔“

ہاجرہ نے اقبال کے سامنے رکھی اور اُسے کھانا کھلانے لگی اور اس کے ساتھ



ہی ہجرہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”میں اپنے ہاتھ سے کھانا کھا کر جاؤں گا۔“ اقبال نے کہا۔ ”ابھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔“ اقبال نے کھانا کھالیا۔ ایسا ہی کھانا ہجرہ کے لیے آیا تھا۔ اُس نے بھی کھالیا، پھر وہ اقبال کو اٹھا کر غسل خانے تک لے گئی اور بیڈ پر لے بھی آئی۔

”میں نے تم سے بہت باتیں کرائی ہیں اقبال جی!“ ہجرہ نے کہا۔ ”اب سو جاؤ۔“ ”نہیں ہجو!“ اقبال نے کہا۔ ”تمہیں نیند آتی ہے تو سو جاؤ۔ میں ابھی نہیں سوؤں گا۔“ آنکھ لگ جاتی ہے تو آوازیں سی آنے لگتی ہیں جیسے کوئی مجھے بلا رہا ہو۔ اقبال، اقبال۔۔۔ پھر آنکھ کھل جاتی ہے پھر گولے پھٹنے لگتے ہیں یا خواب میں ایک شہید عورت اور اُس کے بچے کی لاش نہریں بہتی نظر آتی ہے۔ میں ان کی طرف دوڑتا ہوں تو آنکھ کھل جاتی ہے اور باقی رات جاگتے گزر جاتی ہے۔“

”پھر میں تمہارے ساتھ جاگوں گی اقبال جی!“ وہ اقبال کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور اُس سے پوچھا۔ ”لوگ ایک نہر کا نام لیتے ہیں۔۔۔ بی بی یا جانے کیا۔۔۔ تم بھی اُس نہر پر لڑے تھے اقبال جی؟“

”بی بی نہیں ہجو!“ اقبال نے کہا۔ ”بی۔ آر۔ بی۔۔۔ یہ ایک نہر ہے ہجو! یہ نہر کے ساتھ ساتھ بڑی دور تک چلی جاتی ہے۔“ اقبال کا لب و لہجہ پھر جذباتی ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ”بی۔ آر۔ بی کو ہم پاکستان کی آبرو سمجھ بیٹھے تھے ہجو! یہ نہر ہماری ماؤں اور بہنوں کی مانگ بن گئی ہے۔ میں نے اس نہر کی روانی میں جلال دیکھا ہے، تکنت دیکھی ہے۔ ایسا جلال کسی بادقار ماں کے چہرے پر اُس وقت نظر آتا ہے جب وہ اپنے جوان اور غیور بیٹوں کو دیکھتی ہے۔۔۔ جب اس نہر میں دشمن کے گولے بیٹھتے تھے تو پانی دُور اُوپر تک اچھلتا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمارے جسموں میں بجلی کی طاقت آ جاتی تھی۔ کبھی تو خیال آتا ہے ہجو! یہ نہر نہ ہونی تو شاید ہم اتنی جانبازی سے لڑ بھی نہ سکتے۔ ہمیں بی۔ آر۔ بی لڑا گئی ہے، اس لیے نہیں کہ یہ نہر دشمن کے راستے میں آگئی تھی اور دشمن اسے عبور نہیں کر سکتا تھا، بلکہ اس لیے کہ اس نہر کو وطن کی عصمت سمجھ کر پاک فوج کے غازی اس نہر اور دشمن کے درمیان آگئے تھے۔“

لیفٹیننٹ اقبال بولتا جا رہا تھا۔ وہ بولنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ چپ ہو جاتا ہے تو دُشمن کے سینے میں سیاہ دھواں سا بھر جاتا ہے جو اٹھتا ہے تو اُس کی آنکھوں کو لگتا ہے، آنکھیں جلتی ہیں اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہجرہ اُس کے بہت سے الفاظ اور کئی باتیں سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی، وہ بولے جا رہا تھا۔

”تم نے مرے ہوتے دشمن کو دیکھا تھا اقبال جی؟“ ”دشمن کی لاشوں کے ڈھیر دیکھے تھے ہجو!“ اُس نے بات شروع کی تو ہجرہ کو بھارتی حملے کی اور پاک فوج کے حملہ روکنے کی بڑی لمبی رو تید و سنا ڈالی۔ بھارتی توپوں کی گولہ باری، ہنگامی مجاہدوں کے نعرے، جہم کر لٹنا، ان کا کمانڈو ایٹشن، دشمن کے طیاروں

کے زنائے، ہم راکٹ اور مشین گنوں کی بوچھاڑیں، بی۔ آر۔ بی میں بہتی پاکستان کے سرحدی دیہاتیوں کی لاشیں۔ اقبال اس طرح سنا رہا تھا جیسے محاذ پر لڑ رہا ہو۔

ہجرہ یوں محو ہو گئی تھی جیسے بی۔ آر۔ بی کے کنارے بیٹھی اپنی آنکھوں سے پاک فوج کی معرکہ آرائی دیکھ رہی ہو۔ اقبال نے اُن عورتوں اور بچوں کا ذکر کرتے ہوئے تسمیہاں بھیج لیں جنہیں بھارتی فوجی دیہات سے اپنے ساتھ لے گئے یا قتل کر دیا تھا۔ غاب سے اقبال کا چہرہ سُرخ ہوا جا رہا تھا۔ ہجرہ اپنے آپ میں شدت جذبات کا لرزہ محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے پہلی بار محاذ کی تفصیلات سنی تھیں۔

اکثر ڈاکٹر رات کے راؤنڈ پر نہ آ جاتا تو اقبال ساری رات جاگتا اور بولتا رہتا۔

”نیند نہیں آرہی؟“ ڈاکٹر نے جو سبیر تھا، اقبال سے پوچھا۔

”شاید آجائے۔“ اقبال نے کہا۔ ”لیکن ذہن بیدار رہتا ہے۔“

”یہ ٹھیک نہیں۔“ میجر ڈاکٹر نے کہا۔ ”نیند آنی چاہیے۔ میں ایک گولی لکھ دیتا ہوں۔“

ابھی نرس دے جائے گی۔

ڈاکٹر لیفٹیننٹ اقبال کو دیکھ کر کمرے سے نکلا تو ہجرہ اُس کے پیچھے گئی۔

”ڈاکٹر صاحب جی!“ اُس نے ڈاکٹر کو پکارا اور اُس کے قریب جاڑکی۔

”کیا بات ہے؟“ ڈاکٹر نے رُک کر پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب جی!“ ہجرہ نے پوچھا۔ ”اس کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی؟“

”قسمت کی بات ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”شاید نہیں۔“

”ڈاکٹر صاحب جی!“ ہجرہ نے پوچھا۔ ”کیا یہ ٹھیک ہے کہ ایک انسان کی آنکھیں

دوسرے انسان میں لگائی جاسکتی ہیں؟“

”ہاں ہاں!“ میجر ڈاکٹر نے کہا۔ ”لگائی جاسکتی ہیں۔ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔“

”پھر میری آنکھیں نکال لیں ڈاکٹر صاحب جی!“ ہجرہ نے التجا کے لہجے میں کہا۔

”میری آنکھیں اقبال جی کو دے دیں۔“

ڈاکٹر نے چونک کر ہجرہ کی آنکھیں دیکھیں پھر اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”تم ان کی کیا لگتی ہو؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”اُن کی نوکرائی ہوں۔“ ہجرہ نے کہا۔ ”آپ میری آنکھیں نکال لیں ڈاکٹر صاحب جی!“

”نہ لڑکی!“ میجر ڈاکٹر نے کہا۔ ”زندہ انسان کی آنکھیں نہیں نکالا کرتے۔“ اور ڈاکٹر

چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد نرس آگئی۔ اُس نے ڈاکٹر کی لکھی ہوئی ذہنی سکون اور نیند کی گولی دیکھی تو

اُس نے دوا تیوں کی جوڑے اٹھا رکھی تھی اس میں سے ایک گولی اقبال کو کھلا کر پانی ملا دیا۔ نرس

باہر لگی تو ہجرہ اُس کے پیچھے چلی گئی اور اُسے روک لیا۔

”میم صاحب جی!“ اُس نے التجا کی۔ ”ڈاکٹر۔۔۔ ب جی سے کہہ دیجئے۔“

”نکال کر اقبال جی کو لگا دیں۔“



نرس نے بھی ڈاکٹر کی طرح اُسے چونک کر دیکھا۔ ایک نظر اُس کی آنکھوں کو دیکھا۔  
 ”اتنی خوبصورت آنکھیں؟“ — نرس نے کہا — ”نہیں... نہیں... یہ نہیں ہو سکتا“ — اور  
 نرس تیز تیز قدم اٹھاتی چل پڑی۔  
 ”میم صاحب جی!“ — ہجرہ نے اُسے پکارا پھر بلند آواز سے آواز دی — ”میم صاحب  
 جی...“

نرس کسی اور کمرے میں چلی گئی تھی۔ ہجرہ جب اقبال کے کمرے میں آتی تو وہ مایوسی  
 اور اداسی کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔

”تم باہر چلی گئی تھیں ہاجرہ؟“ اقبال نے پوچھا۔  
 ”ہاں جی!“ — ہجرہ نے جواب دیا۔  
 ”اس کمرے میں جی گھبراتا ہو گا تمہارا“ — اقبال نے کہا — ”جاؤ ذرا باہر گھوم پھر آؤ۔“  
 ”نہیں اقبال جی!“ — ہجرہ نے کہا — ”اتنے اچھے کمرے میں جی کیوں گھبراتے گا۔“  
 وہ چپ ہو گئی پھر التجا کے لہجے میں کہنے لگی — ”اقبال جی! کیا یہ ٹھیک ہے کہ ایک انسان  
 کی آنکھیں نکال کر دوسرے انسان میں لگائی جاسکتی ہیں؟“  
 ”ہاں ہاجرہ!“ — اقبال نے کہا — ”یہ بالکل ٹھیک ہے... کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“  
 ”تمہارے لیے پوچھ رہی ہوں نا!“ — ہجرہ نے کہا — ”پر ڈاکٹر نہیں مانتا۔ میں نے  
 اس میم صاحب کو بھی کہا تھا جو تمہیں ابھی گولی دے کر گئی ہے... وہ بھی نہیں مانتی۔“  
 ”کیا کہہ رہی ہو ہاجرہ!“ — اقبال نے کہا — ”ایسا کون ہو گا جو اپنی آنکھیں نکال کر مجھے دے  
 دے گا۔ تم نے ڈاکٹر اور نرس کو یہی کہا ہو گا کہ کسی کی آنکھیں نکال کر مجھے لگا دیں۔“ اقبال کی  
 ہنسی نکل گئی۔ کہنے لگا — ”تم بہت سیدھی لڑکی ہو۔ ڈاکٹر میرے لیے کسی زندہ آدمی کے  
 آنکھیں نہیں نکالیں گے۔“  
 ”میں نے کسی اور کا تو نہیں کہا اقبال جی!“ — ہجرہ نے کہا — ”میں نے انہیں کہا تھا کہ  
 میری آنکھیں نکال کر آپ کو لگا دیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی کہا اور میں نے میم صاحب  
 کو بھی کہا۔“  
 ”ادہ پگلی ہاجرہ!“ — اقبال نے پیار سے لہجے میں کہا — ”نہ وہ تمہاری آنکھیں نکالیں  
 گے نہ میں تمہاری آنکھیں لوں گا۔“  
 ”اقبال جی!“ — ہجرہ اقبال کے بیڈ پر بیٹھ گئی اور اُس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں  
 میں لے کر بھکاریوں کے لہجے میں بولی — ”اے لونا اقبال جی میری آنکھیں۔“  
 اقبال نے اپنا دوسرا ہاتھ اٹھا کر ہوا میں ٹٹولا اور جب ہاتھ ہجرہ کے سر پہنچ گیا تو اقبال ہاتھ اُس  
 کے گالوں پر لے آیا۔  
 ”تم رو رہی ہو ہاجرہ؟“  
 ”روؤں نہ تو اور کیا کروں؟“ — ہجرہ نے کہا — ”میں ان آنکھوں کا کیا کروں گی؟ اگر انھوں  
 کی مجھے قیمت دینا چاہو تو اتنی سی قیمت دے دینا کہ اپنے گھر میں پڑی رہنے دینا۔ غریب  
 کو کیا چاہیے؟ بس دو وقت کی روٹی۔“

اسکین بدست محمد طارق اقبال  
 ون اردو ڈاٹ کام ممبیز





اقبال کو دھچکا سا لگا اور اُس پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ حلق میں اٹک کے رہ گئے۔ اُس کے سینے سے ایک احساس لہروں کی طرح اٹھا اور اُسے یوں لگا جیسے وہ شکستہ کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگا ہو۔ کبھی اُسے محسوس ہوتا جیسے ہجرہ نے اُس کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا ہو اور کبھی ایسے لگتا جیسے ہجرہ نے اُس پر طنز کی ہو۔

”بولو اقبال جی!“ ہجرہ نے کہا۔ ”ڈاکٹر آئے گا تو اُسے کہہ دینا۔۔۔“  
”نہیں ہجو!“ اقبال نے رقت سے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے اُنہیں اپنے ملک پر۔۔۔ خدا کی راہ میں۔۔۔ سن رہی ہو ہجو! میں نے اُنہیں قربان کر دی ہیں۔ دی ہوئی قربانی واپس نہیں لی جاتی ہجو!“

”تم مانگ نہیں رہے اقبال جی!“ ہجرہ نے کہا۔ ”میں اپنی خوشی سے اپنی اُنہیں دے رہی ہوں۔ پر تم سوچتے ہو گے کہ غریبوں کی اُنہیں امیروں کے چہروں پر اچھی نہیں لگی گی۔۔۔ غریب کے پاس دینے کے لیے ہوتا ہی کیا ہے اقبال جی! اپنی جان دے دے گا۔۔۔ تم قبول کر لو اقبال جی!“

ہجرہ کے بولنے کا انداز اور لہجہ ایسا تھا جیسے وہ کچھ مانگ رہی ہو۔

”ہجو!“ اقبال نے کہا۔ ”انسان کچھ کھوکھو پاتا ہے۔ میں نے وہ حاصل کر لیا ہے جس سے میں نا آشنا تھا۔“ اقبال ذرا چپ ہو گیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہجرہ اُس کی بات نہیں سمجھ سکے گی۔ وہ جو کچھ محسوس کر رہا تھا، کہہ ڈالا۔ ”میں خوش ہوں کہ اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکوں گا میں اب اُس اقبال کو نہیں دیکھ سکوں گا جو گناہگار تھا۔ وہ اُنکھوں والا اقبال تھا جسے بدی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اُس سے نابینا اقبال اچھا ہے۔ اُنکھوں کے اندھیرے میں اُسے اللہ کا نور نظر آتا ہے۔ یہ اقبال مجھے بند اُنکھوں سے نظر آ رہا ہے۔۔۔ مجھے نابینا رہنے دو ہجو!“

ہجرہ خپ چاپ بیٹھی اقبال کے منہ کی طرف دیکھے جارہی تھی۔  
”کہاں ہو ہجو!“ اقبال نے ایک ہاتھ آگے کر کے ٹٹولا اور بولا۔ ”تم یہیں ہو ہجو!“

”ہاں جی!“  
”چپ کیوں بیٹھی ہو؟“ اقبال نے کہا۔ ”کچھ کہو ہجو!۔۔۔ یہ میری باتیں سمجھ رہی ہو؟“  
”کیا کہوں اقبال جی!“ ہجرہ نے کہا۔ ”میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ تمہاری اُنکھیں نہیں ہیں اور میری تمہیں اپنی اُنکھیں دینا چاہتی ہوں جو تم قبول نہیں کرتے۔ پھر بتاؤ نا، میں کیا کروں؟“

”دعا کرو ہجو!“ اقبال نے کہا۔ ”میرے لیے دعا کرو کہ میں اپنے آپ کو اندھانہ سمجھنے لگ جاؤں۔۔۔ ایک کام کرو ہجو! باہر جاؤ۔ کوئی بھی نرس ملے تو اُس سے پوچھنا کیپٹن عصمت کا کمرہ کہاں ہے۔ وہ ہمیں مل جائے تو کہنا آپ کو اقبال نے بلایا ہے۔“ ہجرہ ابھی اقبال کی بات سن ہی رہی تھی کہ نرسنگ اردلی آگیا۔ اقبال نے اُسے کہا کہ وہ کیپٹن عصمت کو بلا لے۔

اقبال اور عصمت کا بچ میں کلاس فیو تھے۔ میں سے ان کی محبت شروع ہوئی تھی جو اس

حد تک پہنچی کہ انہوں نے شادی کا فیصلہ کر رکھا تھا عصمت نے اقبال کا فوٹا اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ عصمت آرمی نرسنگ سروس کی افسر بنی اور اقبال لیفٹیننٹ بن گیا۔ اب اقبال زخمی ہو کر آیا تو اُسے توقع تھی کہ عصمت اُس کے کمرے سے نکلے گی نہیں بلکہ اُس کے بیڈ پر ہی بیٹھی رہے گی لیکن عصمت آئی اور اقبال کے ساتھ دو چار باتیں کر کے چلی گئی اقبال کو عصمت کی مصروفیت کا اندازہ تھا۔ وہ اُسے اپنے پاس بٹھانا نہیں چاہتا تھا لیکن رات کو وہ بیتاب ہو گیا اور اُس نے عصمت کو بلا بھیجا۔

اُس وقت عصمت لیفٹیننٹ لطیف کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے کچھ فراغت مل گئی تھی۔ اقبال کے کمرے میں جانے کی بجائے وہ لطیف کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

”شمع پسند آئی آپ کو؟“ عصمت نے لیفٹیننٹ لطیف سے پوچھا۔ ”آپ اسی کے ساتھ شادی کر رہے ہیں نا!“

”شمع؟“ لطیف نے حیران سا ہو کر پوچھا۔ ”کہاں ہے شمع؟“  
”دوڑ آباد کی وہ لڑکی جو آپ کے کمرے میں رہ گئی ہے“ عصمت نے کہا۔ ”لیفٹیننٹ اقبال کی بہن!“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے“ لطیف نے کہا۔ ”وہ کوئی اور تھی۔ اُس نے اپنا نام کچھ اور بتایا تھا۔“

کیپٹن عصمت نے قہقہہ لگایا اور لطیف کو بتایا کہ وہ شمع تھی اور اُس نے اپنا نام اس لیے کچھ اور بتایا تھا کہ وہ شرمیلی تھی۔

”زندہ دل معلوم ہوتی ہے۔“ لطیف نے کہا۔ ”میرے ساتھ اچھا خاصا مذاق کر گئی ہے۔ کہتی تھی کہ جس شمع کے ساتھ میری شادی ہو رہی ہے وہ بد صورت لڑکی ہے۔۔۔ اقبال کا

کیا حال ہے؟“ لیفٹیننٹ لطیف نے پوچھا۔ ”شمع اُسے دیکھنے آئی ہوگی!“

”وہ تو گھر میں پڑی ہے۔“ عصمت نے کہا۔ ”اُسے ٹائیفا ڈھونڈنا ہے۔۔۔ اقبال کا حال آپ نے پوچھا ہے۔ اُس کی تو بینائی ختم ہو گئی ہے۔ چپکے چپکے ایک زخم ہے جو گہرا تو نہیں لیکن خنک ہو جانے کے بعد زخم کا نشان بڑا بھدا رہ جائے گا۔“

”کیا کوئی لڑکی اقبال کو قبول کر لے گی؟“ لیفٹیننٹ لطیف نے کہا۔ ”شاید کوئی جذباتی لڑکی اسے قبول کر لے۔“

”کوئی جذباتی لڑکی اُسے قبول تو کر لے گی۔“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”لیکن جذباتی بن زیادہ دیر قائم نہیں رہا کرتا۔ ایک تلخ حقیقت کے سامنے جذبات بنم کی طرح اڑھس یا کرتے ہیں۔“

عصمت نے لطیف کو نہ بتایا کہ اقبال کے ساتھ اُس نے شادی کا عہد کر رکھا ہے۔

لطیف کے ساتھ ایک دواور باتیں کر کے کمرے سے نکلی تو نرسنگ اردلی نے اُسے کہا کہ لیفٹیننٹ اقبال صاحب بلا رہے ہیں۔



”کیا کہتے ہیں؟— عصمت نے پوچھا— ”کوئی تکلیف ہے؟“  
”صاحب نے یہ نہیں بتایا۔“ نرسنگ آردلی نے کہا۔

”صاحب سے کہنا میں بہت مصروف ہوں۔“ کیپٹن عصمت نے کہا۔ ”صبح وقت ملا  
نو آؤں گی۔۔۔ تم خیال رکھنا، اگر اقبال صاحب کو کوئی تکلیف ہو جائے تو نرس کو بتا دینا میرے  
پاس نہ آنا۔“

نرسنگ آردلی نے لیفٹیننٹ اقبال کو یہی جواب دیا جو اُسے کیپٹن عصمت نے کہا  
تھا۔ اقبال کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں طنز تھی اور بے بسی بھی۔ اُس نے آہ  
بھری اور لیٹ گیا۔ اُس نے ہجرہ کو بھی سوچا اُسے کو کہا۔ ہجرہ نے فرش پر گدایا بچھایا اور  
لیٹ گئی۔



ستمبر ۱۹۶۵ء میں فوجی ہسپتالوں میں دن رات کا تصور ختم ہو گیا تھا۔ سورج طلوع ہوتا  
تھا اور ڈوب جاتا تھا۔ رات کو زخمیوں کے وارڈوں اور کمروں میں دن جیسی سرگرمیاں رہتی  
تھیں۔ نعرے جو دن کو سائی دیتے تھے وہ راتوں کو بھی گرجتے رہتے تھے۔ آپریشن ٹیبل کسی  
بھی وقت خالی نہیں رہتے تھے۔ ایمبولینس اور دوسری فوجی گاڑیاں زخمیوں کو دن رات لانی  
رہتی تھیں۔ ڈاکٹر ایک آرام کیے بغیر زخمیوں کے آپریشن اور مرہم پٹی میں لگے رہتے تھے۔

دن رات کا تصور محاذوں پر بھی ختم ہو گیا تھا۔ دشمن امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس سے  
اکٹھا کیا ہوا گولہ بارود بے دردی سے پھونک رہا تھا۔ اُس کی فوج اتنی زیادہ تھی کہ تازہ دم  
پلٹنیں جنگ میں جھونکتا جا رہا تھا۔ ادھر پاکستان کے پاس جو کچھ تھا وہ سب داؤ پر لگا دیا گیا  
تھا۔ فالٹو اسلحہ نہ تھا، ایمونیشن نہ تھا، نفری نہ تھی۔ ملک کے دفاع میں وہی نفری لڑ رہی تھی  
جو ۶ ستمبر کے روز محاذوں پر تھی۔ شہیدوں اور شدید زخمیوں نے اس نفری میں خاصی کمی کر دی  
تھی۔ وطن کے جاں نثار اس کمی کو جذبے کی شدت سے پورا کر رہے تھے۔ جنگی قوت  
گھٹتی جا رہی تھی، جذبہ بڑھتا جا رہا تھا۔

دشمن کا اتنا شدید اور اتنا زوردار حملہ نہ صرف روک لیا گیا تھا بلکہ دشمن کا دم ختم توڑ کر کئی  
محاذوں پر اُسے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔ بعض محاذوں پر جنگ دشمن کے علاقوں میں لڑی جا  
رہی تھی۔ دشمن کے عزائم، اُس کی توقعات اور پاکستان کو تہ تیغ کر کے بھارت میں شامل  
کر لینے کے خواب اُس کی اپنی فوج کے خون میں ڈوب گئے تھے۔ دشمن اب خفت مٹانے  
کے لیے لڑ رہا تھا اور فائر بندی کے لیے داویلہ بپا کیے ہوئے تھا۔

پاکستان کی فضا میں اب دشمن کے طیارے کم ہی نظر آتے تھے۔ پاک فضا تیہ کے  
شہبازوں نے انڈین ایرویز کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ پاکستان کی فضا جنگی ترانوں سے  
مرغش ہوتی رہتی تھی۔

ہجرہ کی آنکھ بہت سویرے کھل گئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور لیفٹیننٹ اقبال پر چبک  
کئی جو گہری نیند سویا ہوا تھا۔ رات کو ڈاکٹر اُسے نیند کی گولی دے گیا تھا۔ ہجرہ اُسے دیکھتی  
رہی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”فکر نہیں نا تب صاحب فکر نہیں۔“ اقبال نیند میں بڑبڑایا۔ ”ادھر سے دشمن ایک  
قدم آگے نہیں آ سکتا۔“

ہجرہ کھڑی سنتی رہی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اقبال خواب میں محاذ پر پہنچا ہوا ہے۔  
تھوڑی سی دیر بعد اقبال کی آنکھ کھل گئی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اُس نے ہجرہ کو آواز دی۔  
”متھارے پاس کھڑی ہوں اقبال جی!— ہجرہ نے کہا۔  
”غسل خانے تک بے چلو۔“ اقبال نے کہا۔

ہجرہ نے ایک بازو اُس کی کمر کے گرد لپیٹ کر دوسرا ہاتھ اُس کی بغل میں رکھا۔  
”نہ ہجو!— اقبال نے کہا۔“ میں اٹھنے اور چلنے سے تو معذور نہیں ہوا خود اسٹول کا۔  
رات کی طرح مجھے غسل خانے تک پہنچا دو۔ میرا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لو۔  
اقبال اٹھا۔ ہجرہ نے اُس کا بایاں ہاتھ اپنے دائیں کندھے پر رکھ لیا اور اُسے غسل خانے  
میں چھوڑ آئی۔

اُسے جب ہجرہ واپس لائی اور بیڈ پر بٹھایا تو کیپٹن عصمت آگئی۔  
”ہجو!— اقبال نے ہجرہ سے کہا۔“ تم برآمدے میں جا کر بیٹھو، میں تمہیں بلاؤں گا۔“  
ہجرہ نوکرائی تھی۔ اُسے حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے کے فرش  
پر بیٹھ گئی۔

”رات مجھے کیوں بلایا تھا؟— عصمت نے ایسے لہجے میں پوچھا جس میں بیگانگی سی تھی۔  
”تم آئی کیوں نہیں تھیں؟— اقبال نے پوچھا۔“ اُس وقت مصروف تھیں تو بعد  
میں آجائیں۔“

اقبال نے عصمت کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ عصمت کو اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا لیکن  
عصمت ذرا پیچھے ہٹ گئی۔

”میری اگر ضرورت نہ ہو تو میں جاؤں؟— عصمت نے پوچھا۔  
اقبال پر رومانی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ رات کو اقبال نے عصمت کو اسی لیے تو بلایا  
تھا۔ اقبال کا ہاتھ آگے بڑھا ہوا میں ٹپٹول رہا تھا اور عصمت اس ہاتھ سے پرے ہٹ  
گئی تھی۔ ایک وقت تھا کہ عصمت اس ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ  
مسلا کرتی تھی۔ کبھی اس ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھ کر دبا کر تھپتی تھی مگر آج یہ ہاتھ اُسے ڈھونڈ  
رہا تھا اور وہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔

”کہاں ہو عصمت!— اقبال نے کہا۔  
”یہیں ہوں۔“ عصمت نے خشک سے لہجے میں کہا۔



"میرے پاس بیٹھو نا۔ اقبال نے رومانی سے لہجے میں کہا۔ "نوکرانی کو میں نے باہر بھیج دیا ہے۔ دروازہ کھلا ہے تو بند کر دو۔"

"میٹھنے کی فرصت ہی کہاں ہے میرے پاس؟" کیپٹن عصمت نے کہا۔

"عصمت! "

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" اقبال نے پوچھا۔ "مجھے تو امید تھی کہ تمہیں پہلے کا کہ اقبال زخمی ہو کر آیا ہے تو تم اڑ کر پہنچو گی اور میرے کمرے سے بکلا ہی نہیں کرو گی لیکن تم..."

"میں بہت مصروف ہوں لیفٹیننٹ اقبال!۔ کیپٹن عصمت نے کہا۔ "تمہیں کوئی تکلیف ہے تو وہ مجھے بتاؤ۔ میں انتظام کر دوں گی۔"

"اوہ!۔ اقبال نے دبی دبی آواز میں کہا۔ "کیپٹن عصمت بول رہی ہے میں تو عصمت سے بات کرنا چاہتا تھا۔۔۔ صرف ایک بات بتا دو۔ ڈاکٹر میری بینائی کسے متعلق کیا کہتے ہیں؟"

"ڈاکٹروں کی رپورٹ مایوس کن ہے۔" عصمت نے کہا۔ "دونوں آنکھیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہیں۔"

"عصمت!۔ اقبال نے پوچھا۔ "تمہارے اس نشک روئیے سے میں کیا سمجھوں؟"

"تم جو کچھ بھی سمجھتے ہو سمجھتے رہو۔" عصمت نے کہا۔ "میں نے تو یہ کہا ہے کہ تمہاری آنکھیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہیں۔"

"تم مجھے یہ احساس دل رہی ہو کہ میں اندھا ہو گیا ہوں۔" اقبال نے کہا۔ "مجھ سے پلو چھڑانے کا یہ طریقہ اچھا ہے عصمت! میں تمہیں اس آستان میں کبھی نہیں ڈالوں گا کہ ایک اندھے کے ساتھ شادی کر لو، اندھا بھی وہ جس کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔ میری آنکھیں ہی نہیں میری سروس بھی ختم ہو گئی ہے۔ میرا گزارہ اب اسی پر ہو گا جو مجھے حکومت دے گی۔ فوج مجھے ویسے ہی اٹھا کر باہر نہیں پھینک دے گی۔"

"ہاں ہاں اقبال!۔ عصمت نے کھیا نے سے لہجے میں کہا۔ "فوج تمہیں بہت کچھ دے گی۔ معذوری کی پیش دے گی۔ اور بھی کچھ دے گی۔"

"مجھے ستارہ عرآت بھی مل رہا ہے عصمت!۔ اقبال نے کہا۔ "لیکن میں کسی تمغے کے لیے اور کسی انعام کی خاطر نہیں لڑا، اور عصمت! مجھے اپنی بنیائی ختم ہونے کا کوئی غم نہیں۔ اگر میں کہوں کہ آنکھیں بے نور ہو جانے سے میری روح روشن ہو گئی ہے تو تم ہنس پڑو گی اور کہو گی کہ اقبال! تم ایسے تو نہیں بنوا کر تے تھے۔۔۔ خدا نے میری آنکھیں قبول کر کے مجھے اپنے قریب کر لیا ہے۔ تم مجھے پہلے والا، کالج والا اقبال سمجھ رہی ہو۔۔۔"

نہیں عصمت! اس اتہال کو میں سرحد کی مٹی میں دفن کر آیا ہوں۔ یہ اقبال جسے تم دیکھ رہی ہو اس نے تو یوں اوٹھیں کی گولہ باری اور ہوائی جہازوں کی بمباری کے دھماکوں سے جنم لیا ہے۔ یہ اقبال بغیر آنکھوں کے دیکھ سکتا ہے، بغیر زبان کے بول سکتا ہے، بغیر کانوں کے سن سکتا ہے۔"

"نہیں اقبال!۔ عصمت نے کہا۔ "میں نے تمہارے جذبے کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ میں یہ ضرور کہوں گی کہ تمہاری یہ باتیں انبارل سی لگتی ہیں۔ تم واقعی بدل گئے ہو، میں نہیں سمجھ سکتی تم کس طرح بدل گئے ہو۔"

"ہاں عصمت!۔ اقبال نے کہا۔ "میں خود اپنے آپ کو انبارل لگتا ہوں۔۔۔ میں تمہیں سمجھاؤں کہ میں کس طرح بدل گیا ہوں۔ دشمن کے گولے جو پاکستان کی زمین پر گرتے تھے وہ مجھے یوں لگتے تھے جیسے میرے سینے میں پھٹ رہے ہوں۔ ایک احساس تھا جو بیدار ہو گیا، ایک جذبہ تھا جو اڈ پڑا اور ان دونوں نے اس اقبال کو جان سے مار ڈالا جس کے ساتھ تم نے کالج میں محبت کی تھی۔ تم اس اقبال کے ساتھ محبت نہیں کر سکو گی جو تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ کھل کر بات کرو عصمت! صاف کہ دو کہ تم ایک اندھے کے ساتھ شادی نہیں کرو گی! ایسی بے رخی کی حرکتیں کر کے نہ مجھے دھوکہ دو نہ اپنے آپ کو۔"

عصمت چپ چاپ سن رہی تھی۔ اس کی زبان اکڑ سی گئی تھی۔

"تمہیں اس اقبال کے ساتھ شادی نہیں کرنی چاہیے تھی جو تمہارے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔" اقبال کہہ رہا تھا۔ "وہ بدکار، عیاش، بے اعتبار اور کلی کلی کارس جو سنے والا کالا بھنورا تھا۔ ایسے خاوند بے وفا ہوتے ہیں۔۔۔ میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا عصمت! میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ تم آنکھوں والی ہو لیکن تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ مجھے دیکھنے کے لیے روح کی آنکھوں کی ضرورت ہے۔ یہ آنکھیں میری اس نوکرانی کے پاس ہیں۔۔۔"

"ایک اور بات سناؤں۔۔۔ اکتا تو نہیں جاؤ گی؟ یہ میری نوکرانی ہے۔ اس کی خوبصورتی تم نے دیکھی ہے؟ میں نے اس پر بھی جال پھینکا تھا لیکن ہاتھ نہ آئی۔ میں نے اسے دس دس کے نوٹ دیتے تھے جو اس نے میرے منہ پر دے مارے تھے۔ میں اسے ہمیشہ انہی نظروں سے دیکھتا رہا اور میں نے اسے اس کمرے میں بھی دیکھا ہے۔ میں نے اسے بغیر آنکھوں کے دیکھا ہے۔ اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں کو پکڑتے ہیں، اس کا جسم میرے جسم کے ساتھ لگتا ہے۔ اس کے گال میرے گالوں کے ساتھ لگتے ہیں لیکن اس کے لمس میں تقدس ہے۔ اس کے جسم کو میں قابل احترام سمجھتا ہوں۔ میں نے اس جیسی، تم جیسی، پاکستان کی ہر عورت جیسی ایک عورت کی لاش بی آر بی میں ہتی دیکھی تھی۔ اس لاش نے ایک بچے کی لاش کو اپنے مردہ سینے کے ساتھ چپکا رکھا تھا۔ اس لاش کی کھلی ہوئی آنکھیں مجھے دیکھتی آگے چلی گئی تھیں۔ پھر عصمت! میں نے ایک بچی کی لاش دیکھی تھی جو توپ کے گولے سے شہید ہوئی تھی۔ اس کی بھی آنکھیں کھلی تھیں اور مجھے دیکھ رہی تھیں۔۔۔ ان مردہ آنکھوں نے میری روح کی آنکھیں کھول دیں۔"

"تم نے ایسی باتیں کیوں شروع کر دی ہیں؟" کیپٹن عصمت نے پوچھا۔

"تمہارے رویے سے مجبور ہو کر!۔ اقبال نے کہا۔ "جاو عصمت! میں تم سے ایسی



قربانی نہیں مانگوں گا کہ تم ایک اندھے سے شادی کر لو۔ میرے لیے محبت کا تصور بدل گیا ہے۔  
کیپٹن عصمت آہستہ آہستہ چلتی کمرے سے نکل گئی۔ اقبال اُس کے قدموں کی چاپ  
سناتا رہا اور ہنس پڑا۔

”ہجو! — اُس نے آواز دی۔

ہجرہ دوڑی آئی اور اُس کے پیچھے پیچھے ناشتہ آگیا۔ ہجرہ نے ناشتہ لانے والے کے  
ہاتھ سے ٹرے لے کر اقبال کے بیڈ پر رکھ دی اور ٹوسٹ پر کھن اور جام لگانے لگی۔  
”ہجو!“

”جی!“

”اپنے لیے بھی چائے بنا لو۔“ اقبال نے کہا۔ ”اور ناشتہ میرے ساتھ کرو۔“

”ایسے اچھا تو نہیں لگتا نا اقبال جی!“ ہجرہ نے معصوم سے لہجے میں کہا۔

”مجھے ایسے ہی اچھا لگتا ہے ہجو!“ اقبال نے کہا۔



ناشتے کے کچھ دیر بعد اقبال کا باپ، ماں اور کچھ قریبی رشتہ دار آ گئے۔ اقبال کی چھوٹی  
بہن اس لیے نہ آ سکی کہ شمع کو تیز بخار تھا۔ اقبال کے چہرے پر عروج کی تپش کے اثرات  
بڑے صاف تھے۔ رنگ گہرا سا نوا ہو گیا تھا پھر بھی چہرے پر رونق تھی۔ اداسی اور یاسدیت  
کا نام و نشان نہ تھا۔ اُس نے ہنستے ہوئے سب کا استقبال کیا۔

عورتوں نے اقبال کے بیڈ کو زونے میں لے لیا۔ ہجرہ اقبال کے باپ کو باہر لے گئی۔

”اقبال جی نہیں مانتے۔“ ہجرہ نے اقبال کے باپ سے کہا۔

”کیا نہیں مانتے؟“

”میں نے انہیں کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو کہیں کہ میری آنکھیں نکال کر اقبال جی کو لگا دیں“

— ہجرہ نے کہا۔ ”پر یہ نہیں مانتے۔“

”اللہ تمہیں خوش رکھے ہجو بیٹی!“ اقبال کے باپ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

— ”یہ کوئی ماننے والی بات تو نہیں۔“

اقبال کا باپ اسے رسمی یا جذباتی پیشکش سمجھ رہا تھا۔

”میں نے ڈاکٹر صاحب کو کہا تھا۔“ ہجرہ نے کہا۔ ”وہ بھی نہیں مانتا۔ اقبال جی کو ایک

میم صاحب دوائی دینے آتی ہے، میں نے اُسے بھی کہا تھا۔ اُس نے بھی میری بات نہیں

سنی۔۔۔ آپ ڈاکٹر صاحب کو کہیں۔“

”نہ بیٹی!“ اقبال کے باپ کی آواز اکھڑ گئی۔ ہکلا تے ہوئے بولا۔ ”نہ بیٹی۔۔۔ نہیں

ہجرال بی بی!“

”میں ان آنکھوں کو کیا کروں گی!“ ہجرہ نے پُر عزم اور بڑے ہی معصوم لہجے میں کہا۔

— ”اقبال جی جوان آدمی ہیں۔ انہوں نے بہت سارے کافروں کو مارا ہے۔“

”نہ بیٹی!“ اقبال کے باپ نے سنبھلی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کسی زندہ انسان کی آنکھیں  
نکال لینا گناہ ہے۔۔۔ اپنے بیٹے کی خاطر کوئی باپ کسی کی بیٹی کو اندھا نہیں کرے گا۔۔۔ تم میری  
بیٹی ہو ہجو!“

صوبیدار اکبر علی کے بعد چوہدری کرامت دوسرا آدمی تھا جس نے ہجرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر  
اُسے بیٹی کہا تھا۔ پہلے تو وہ حیران ہوئی پھر یہ حیرت ایک احساس بن گئی۔ احساس یہ کہ وہ دنیا  
میں بے کار شے نہیں اور اُس کی کچھ نہ کچھ اہمیت اور قدر و قیمت ضرور ہے۔ اس احساس  
نے اُس کے دل میں کچھ کر گزرنے کی تڑپ کو اور زیادہ شدید کر دیا۔

اُس نے اقبال کی ماں سے بھی کہا کہ وہ اپنی آنکھیں اقبال کو دینا چاہتی ہے۔ ماں کا ردِ عمل بھی  
اقبال کے باپ جیسا تھا۔

اقبال کو دیکھنے کے لیے وزیر آباد سے عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم آ گیا تھا۔ ہجرہ باہر  
برآمدے میں فرش پر بیٹھ گئی۔ اُس کے ذہن میں اُس کی آنکھیں گھوم پھر رہی تھیں۔ افضال نے  
دو تین بار اُسے کہا تھا، ہجرہ! تمہاری آنکھیں بہت ہی دل کش ہیں۔ ان میں تو جادو ہے۔۔۔  
اُسے یاد آ رہا تھا کہ اُسے چھپڑنے والے ایک لڑکے نے کہا تھا۔ ”ادھالما، ان آنکھوں  
پر پردہ ڈال کے رکھو۔ یہ تو قتل کرتی ہیں۔“

ہجرہ کو غصہ آنے لگا۔ اُسے اپنی آنکھیں بُری لگنے لگیں۔ اُسے جس طرح ان آوارہ  
لڑکوں سے نفرت ہو گئی تھی اسی طرح اُسے اپنی آنکھوں سے نفرت ہونے لگی۔ اس قدر  
نشیلی آنکھیں اُسے چوری کا مال نظر آنے لگیں جیسے اُس نے اقبال کی آنکھیں چُرا لی ہوں۔  
اُسے ساتھ کے وارڈ سے محاذ کے زخمیوں کے نعرے سنائی دینے لگے۔ اُس کی رگوں  
میں خون کھولنے لگا۔ پھر اُسے فضا میں ایک گرج اور گرجدار زناٹہ سنائی دیا۔ اس آواز کو وہ پہچانتی  
تھی۔ پاک فضا بیہ کے لڑاکا مہارٹیا رے اوپر سے گزر گئے تھے۔

وہ سوچنے لگی کہ قوم کا ہر فرد کسی نہ کسی طور جنگ میں شریک ہے۔ لوگ خون دے رہے  
ہیں، دفاعی فنڈ میں پیسے دے رہے ہیں، فوجیوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں اور تحفے  
بھیج رہے ہیں لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر رہی تھی۔ اُس کے سینے میں دھماکے ہونے لگے۔

وہ محاذ پر نہیں جاسکتی تھی۔

وہ انڈین ایئر فورس کے طیاروں کے پر نہیں لوچ سکتی تھی۔

اُس کے پاس کپڑے نہیں تھے، فوجیوں کو دینے کے لیے تحفے نہیں تھے۔

وہ اپنے جسم کا سارا خون پاک فوج کی نذر کر سکتی تھی۔

وہ اپنی آنکھیں لینٹینٹ اقبال کو دے سکتی تھی۔

مگر اُس کی آنکھیں کسی نے قبول نہ کیں۔ اُسے یوں دکھ ہوا جیسے اُس کی قربانی خدا نے  
ٹھکرا دی ہو۔ وہ تڑپ اٹھی اور اُس کے آنسو نکل آئے۔

اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے پاس کوئی کھڑا ہو۔ اُسے پاؤں نظر آئے۔ اُس نے اوپر



”تمہاری ساری زندگی برباد جائے گی اقبال جی!“ — ہاجرہ نے کہا — ”مجھے ان دونوں پر بہت غصہ آیا تھا۔ میرے دل میں آتی تھی کہ انہیں کہوں کہ تم اقبال جی کو بیٹی دینے سے انکار نہ کرو، میں اقبال جی کو اپنی آنکھیں دے دوں گی، پر میں ایسی بات نہیں کہہ سکتی ناجی!“

”ضرورت ہی کیا ہے کہنے کی ہاجرہ!“ — اقبال نے کہا — ”یہ لوگ مجھے اندھا سمجھتے ہیں۔ سمجھتے رہیں ہاجرہ! میں نے اپنے اللہ سے دل لگا لیا ہے.... اور دیکھو ہاجرہ! اب تم میرے ساتھ میری آنکھوں کے متعلق اور اپنی آنکھوں کے متعلق کوئی بات نہ کرنا!“

”اقبال جی!“ — ہاجرہ نے پوچھا — ”یہ لڑائی کب تک ہوتی رہے گی؟“

اقبال نے اُسے جذباتی سا جواب دیا اور اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ جنگ فیصلہ کن ہوگی اور فتح پاکستان کی ہوگی لیکن صورت حال کچھ اور ہوتی جا رہی تھی۔ لڑنے کا جذبہ ایک بنیادی ضرورت ہے لیکن اسلحہ اور ایمونیشن کے بغیر جذبہ بیکار ہوتا ہے۔ پاکستان کے حکمرانوں کا بھکاری پن محاذوں پر رنگ دکھانے لگا تھا۔ ایمونیشن کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔

ہمارے حکمران ایک مدت سے بھکاری بنے ہوئے تھے۔ امریکی امداد ان کے منہ کو لگ گئی تھی اور امریکہ نے انہیں مانگنے کا عادی بنا دیا تھا۔ اگر امریکہ سے صرف گندم اور مالی امداد ہی لی جاتی تو اور بات تھی، حادثہ یہ ہوا کہ ہمارے حکمران دفاعی ضروریات کے لیے بھی امریکہ کے دست نگر ہو گئے۔ امریکہ نے کبھی چند ایک توپیں دے دیں تو پاکستان کے حکمران مطمئن ہو گئے کہ بس کام ہو گیا۔ اب اپنا اسلحہ بارود بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ کبھی وقت آن پڑا تو چچا سام فوجی سامان دے دے گا۔

اُدھر پاکستان کے خون کا پیاسا اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن اسلحہ بارود سے اپنے سٹور بھرتا رہا اور اُس نے روس کے ساتھ دفاع کے معاملے میں معاہدہ کر لیا، ادھر اقتدار کی سیاست چلتی رہی اور ایک دوسرے کو تیجا دکھانے کے حربے استعمال ہوتے رہے۔ دفاع کی وزارت پر سیاسی لیڈر قابض رہے جو ملک کا نہیں صرف اپنی کرسی کا دفاع کرنا جانتے تھے۔ انہیں اقتدار کی رسکشی میں ہوش ہی نہیں تھی کہ سرحد پار کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ پاکستان کے فضائی بیڑے میں امریکہ کے دیتے ہوئے قدیم طیارے تھے جو دشمن کے مقابلے میں بہت تھوڑے تھے۔

کسی بھی حکمران نے ضرورت محسوس نہ کی کہ اپنے دشمن کے عزائم کو اور اُس کی جنگی تیاریوں کو دیکھتے ہوئے تینوں مسلح افواج کی نفری ہی بڑھا دیتے۔ یہ تو فوج کا جذبہ تھا کہ کہیں فوجیوں کے مقابلے میں ساڑھے چار ڈویژن جم گئے اور قوم کا کچھ بچہ اپنی قلیل فوج کی پشت پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر ہماری مسلح افواج اسلحہ کے بھروسے پر لڑتیں تو ایک دو دن ہی لڑ سکتیں لیکن انہوں نے بدر اور قادسیہ کی روایت کو تازہ کر دیا اور اتنے طاقتور دشمن کا حملہ پساکر دیا۔ یہ جذبے کا کوشمہ تھا مگر حقائق کو دیکھا جاتے تو جنگ جنگی ترالوں اور بہادری کے ٹکٹوں سے نہیں لڑی جاسکتی یا یوں کہتے کہ زیادہ عرصے تک نہیں لڑی جاسکتی۔

بیچھا۔ وہ اقبال کا ماموں تھا اور اُس کے پاس اُس کی بیوی کھڑی تھی۔ ہاجرہ انہیں جانتی تھی دونوں اقبال کے گھر آیا کرتے تھے۔ گھر میں جو باتیں ہوتی تھیں ان سے ہاجرہ کو پتہ چلا تھا کہ اقبال کا ماموں اقبال کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے رہا ہے۔ آج ماموں اپنی بیوی کے ساتھ اقبال کو دیکھنے دوسرے رشتہ داروں کے ہجوم کے ساتھ آیا تھا۔ یہ دونوں کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ اُن کے قدموں میں اقبال کے گھر کی نوکرائی بیٹھی ہے۔ برآمدے میں زخمیوں کے زخموں کا ہجوم روال دوال تھا۔

”بے چارہ ہمیشہ کے لیے اندھا ہو گیا ہے“ — اقبال کے ماموں نے اپنی بیوی سے کہا۔

”ساری عمر غارت گئی بے چارے کی!“ — ماموں کی بیوی نے کہا — ”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“

”ڈاکٹروں نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ بینائی ماری گئی ہے“ — ماموں نے جواب دیا۔

”اللہ کو ہی منظور تھا“ — ماموں کی بیوی نے کہا — ”لیکن میری ایک بات سن لیں۔ اقبال کا مال اقبال کے لیے ہماری بیٹی لے رہی تھی، بلکہ ہم دے رہے تھے لیکن اب نہیں!“

”اسے ہسپتال سے تو نکل لینے دینا تھا“ — اقبال کے ماموں نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

”میں آپ کو بہانے سے باہر لاتی ہوں“ — ماموں کی بیوی نے کہا — ”میں ڈرتی ہوں کہ پچھلے جذبات میں آکر جی کہہ دیں گے کہ اقبال پر وہ نہ کرو۔ اللہ مالک ہے۔ میں اپنی بیٹی ہتھ سے رہا ہوں.... یہ وقت جذبات کا ہی تو ہے لیکن ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ لو کا اچھا تھا۔ فوج افسر تھا لیکن آنکھوں سے محروم ہو جانا.... اللہ تو بہ!“

”میں اتنا بیوقوف تو نہیں“ — ماموں نے کہا — ”لیکن ذرا احتیاط کرنا۔ زبان کو قابو میں رکھنا۔“

”یہ لوگ افسوس میں ہیں جب کبھی ان کی طرف سے بات ہوتی تو جواب دے دیں گے... اب اندر چلو“

ہاجرہ کے دل میں جیسے تیر اتر گیا ہو۔ اُس کا خون پہلے ہی اُبل رہا تھا، اب اُس کا سارا وجود جلنے لگا۔ اُس کے جی میں آتی کہ کمرے میں جا کر سب کے سامنے کہہ دے کہ اقبال کے ماموں اُس کی بیوی نے کیا کہا ہے لیکن وہ بہت سیدھی اور خاموش طبع لڑکی تھی۔ اُسے ڈھنگ سے بات کرنی بھی نہیں آتی تھی۔ وہ سوچ سکتی تھی بول نہیں سکتی تھی۔ اپنا خون جگر پی کے رہ گئی۔

شام کے بعد جب سب لوگ چلے گئے تو ہاجرہ اقبال کے پاس بیٹھ گئی۔

”اقبال جی!“ — ہاجرہ نے کہا — ”میری بات مان لو نا!“

”پھر وہی بات ہاجرہ!“

”اب وہی بات نہیں اقبال جی!“ — ہاجرہ نے کہا — ”اب کوئی اور بات ہے۔“

”اور کیا بات ہو گئی ہے؟“

ہاجرہ نے اقبال کو اُس کے ماموں اور اس کی بیوی کی وہ ساری باتیں سنا دیں جو انہوں نے اُس کے پاس کھڑے ہو کر کہی تھیں۔

اقبال سنس پڑا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھیں کھلی گئی۔



پر لگا دیا گیا تھا۔ اب تو سرحدوں کے رکھوالے روح اور جذبے کے زور پر لڑ رہے تھے۔ انہوں نے دشمن پر واضح کر دیا تھا کہ پاک فوج کا ایک بھی جوان زندہ رہا تو وہ دشمن کو بی آبرو کے قریب نہیں آنے دے گا۔

جذبہ ایک جنون بن گیا تھا۔ اسی مثالوں کی کمی نہیں تھی کہ شدید زخمیوں نے پیچھے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ توپ یاٹینک کے گولے کے بڑے ٹکڑے سے ایک ہاتھ اڑ گیا اور جوان نے زخم پر فیلڈ سٹی باندھ کر اوپر تولیہ لپیٹ لیا تاکہ اُسے پیچھے نہ بھیج دیا جائے۔ دشمن کے ٹینکوں کے سامنے پندرہ بیس گز کے فاصلے پر کھڑے ہو کر راکٹ لاپچر فائر کرنے کی مثالیں بھی سامنے آئیں۔ ٹینک کی مشین گن فائر ہوئی، ادھر سے جوان نے راکٹ فائر کیا۔ ادھر ٹینک تباہ ہوا۔ ادھر جوان شہید ہو گیا۔

جوان اب کھانا نہیں مانگتے تھے، پانی نہیں مانگتے، وہ صرف ایمونیشن مانگتے تھے۔ محاذوں پر ہر قسم کے ایمونیشن کی کمی محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ دشمن آخری حربے کے طور پر تباہ توڑ حملے کر رہا تھا۔ اُس کی حالت زخمی دندے کی سی ہو گئی تھی جو باؤ لاہو کر مرنے سے پہلے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اپنے ریر ایشلان کو اگلے مورچوں سے صرف یہی پکار سانی دیتی تھی — ایمونیشن .... فوراً .... ایمونیشن۔

دوسرے دن لیفٹیننٹ اقبال کو دیکھنے اُس نے ماں باپ، چھوٹی بہن اور رشتہ دار آتے تو بہن نے ضد کی کہ وہ اپنے بھائی جان کے پاس رہنا چاہتی ہے۔ اُس کے جذبات تھے جنہیں دبایا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کپڑوں کے فالتو جوڑے لے کر گئی تھی۔ شام کو سب واپس آنے لگے تو باجرہ کو ساتھ لے آئے۔ اقبال کی بہن اقبال کے پاس رہ گئی۔ اُس شام سورج غروب ہونے سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے راولپنڈی ریلوے اسٹیشن سے ایک بڑی لمبی مال گاڑی روانہ ہوئی۔ اسے لاہور تک رن تھرو ہونا تھا۔ اس کے ڈرائیور کو سختی سے حکم دیا گیا تھا کہ کسی بھی جگہ رفتار کم نہ کرے اور ہوائی حملے کی صورت میں رفتار اوتیز کرے تاکہ دشمن کے طیاروں کو سسٹ یا ساکن ٹارگیٹ نہ ملے۔ اُسے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ گاڑی میں تین ٹینک بھی جا رہے ہیں۔ ان میں طیارہ شکن مشین گنیں ہیں اور ہوائی حملے کی صورت میں ستر طیاروں کا مقابلہ کریں گے۔ گاڑی کے ساتھ ایک حفاظتی پارٹی بھی جا رہی تھی۔

چند ہی دن پہلے پاک فضائیہ کے ہوا بازوں نے دشمن کی اسی قسم کی ایک مال گاڑی گورداسپور کے ریلوے اسٹیشن پر اور ایک دھارلوال کے مقام پر تباہ کر دی تھی۔ یہ دونوں گاڑیاں گولہ بارود سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کی تباہی نے بھارتی مورچوں کو خاصا کمزور کر دیا تھا۔ انڈین ایئر فورس کے ہوا بازوں نے بہت کوشش کی کہ پاکستان کی کوئی ریل گاڑی تباہ کریں۔ ان کے جاسوس ان کی رہنمائی بھی کرتے رہے اور انہیں گاڑیوں کا صحیح وقت بھی بتاتے رہے لیکن وہ کسی بھی گاڑی پر کامیاب حملہ نہ کر سکے تھے۔

جس امریکہ پر پاکستان کے حکمرانوں نے بھروسہ کیا تھا کہ دفاعی ضروریات پوری کرے گا، امریکہ نے فوجی امداد بند کر دی۔ فوجی امداد تو امریکہ نے بھارت کی بھی بند کر دی تھی لیکن اسے درپردہ اسلحہ بارود دیتا رہا۔ اس کا ثبوت کھیم کرن کے کھیتوں میں ملا تھا۔ وہاں انڈین پاک فوج کے جوابی حملے سے ایسی بے طرح بھاگی کہ ایمونیشن کے بند بکس پیچھے چھوڑ گئی۔ اس امریکہ سے آتے تھے اور ان پر پاکستان کا نام لکھا ہوا تھا، یعنی امریکہ سے یہ پاکستان بھیجے جا رہے تھے لیکن بھارت کو دے دیتے گئے۔

دوسری مشکل یہ پیدا ہو رہی تھی کہ ہمارے حکمران جن بڑی طاقتوں کا دیا کھاتے رہے تھے وہ فائر بندی کے لیے دباؤ ڈال رہی تھیں۔ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ فتح مسلمانوں ہو۔ یہ طاقتیں درپردہ بھارت کے ساتھ تھیں۔ ہمارے حکمرانوں میں اتنی اخلاقی جرات بس تھی کہ آزادانہ کوئی فیصلہ کر سکتے۔ وہ کس بل بوتے پر آزادانہ فیصلہ کرتے؟ انہوں نے نیشنل کی امداد اور قرضوں کے عوض پاکستان کا وقار اور قومی عزت بگڑی رکھی ہوئی تھی

اس بے بسی کی ایک مثال چونڈہ میں سامنے آئی۔ ۱۷/۹ ستمبر تک چونڈہ کے میدان بس پاک فوج کے تھوڑے سے ٹینکوں نے بھارت کے آرمڈ ڈویژن کو بیکار کر دیا تھا۔ بھارت کے آرمڈ ڈویژن کے کمانڈر نے دشمن پر جوابی حملے کا پلان بنایا اور منظوری کے لیے ہائی کمانڈ کو بھیجا۔ اس پلان کے ساتھ ہائی کمانڈ کو بتایا گیا تھا کہ دشمن کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا۔ اگر اس پر فوری طور پر حملہ کیا جائے تو اسے نہ صرف سرحد سے دُور پیچھے دھکیلا جاسکتا ہے بلکہ ہم پٹھانکوٹ تک پہنچ سکتے ہیں، مگر پاکستان کے اُس وقت کے صدر نے حملے کی منظوری نہ دی۔

غیر ملکی نامہ نگاروں نے لکھا تھا کہ پاکستان نے جوابی حملے کا پلان بنایا تھا مگر حملہ سیاسی وجوہ کی بنا پر روک لیا گیا۔ یہ سیاسی وجوہ وہ مجبوریاں تھیں جو ہمارے اقتدار پرست حکمرانوں نے اپنے لیے خود پیدا کی تھیں اور پاکستان کی قسمت امریکہ کے ہاتھ میں دے رکھی تھی۔ وہ نوہم سے فائر بندی کر رہے تھے، جوابی حملے کی وہ کیسے اجازت دے دیتے!

فائر بندی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ دن اور وقت کا ابھی تعین نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھارت نے تصور کھیم کرن سیکڑ اور لاہور سیکڑ میں تازہ دم فوج جھونک دی مقصد یہ تھا کہ فائر بندی سے پہلے پہلے پاک فوج سے کھیم کرن کا قصبہ اور اردگرد کا علاقہ واپس لیا جائے اور پاک فوج کو بھارتی علاقے سے نکالا جائے۔ بھارتیوں کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ لاہور سیکڑ پر اتنا زیادہ دباؤ ڈالا جائے کہ پاک فوج کا یہ ڈویژن پیچھے ہٹ جائے اور انڈین آرمی بی آبرو بن کر پارکر کے شالیمار تک کے علاقے پر قابض ہو جائے تاکہ پاکستان سے اپنی شرطیں منوائی جاسکیں۔ یہ دباؤ اس قدر زیادہ تھا کہ پاک فوج کے تھکے ہوئے افسروں اور جوانوں کے لیے ناقابل برداشت ہوا جا رہا تھا۔ پاکستان کے پاس کوئی تازہ دم فوج نہیں تھی۔ جو کچھ تھا وہ داغ



اب یہ کام کرنل گپتا نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور لاہور سے راولپنڈی تک کے جاسوسوں کو کہہ دیا تھا کہ ادھر سے کوئی بھی گولہ بارود کی گاڑی چلے، اُس کا وقت نوٹ کرو اور اُسے خود ہی ڈائنامیٹ سے تباہ کرو۔ چنانچہ بھارتی جاسوس ہماری گاڑیوں کی ٹوہ میں لگے ہوتے تھے۔ آخر اس شام راولپنڈی سے گاڑی چلی تو ان کی نظریں آگئی۔ انہوں نے راولپنڈی سے وزیر آباد تک اس کا صحیح وقت نوٹ کر لیا۔ وزیر آباد تک اس لیے کہ تباہ کار جاسوسوں نے وہیں کہیں اپنا خفیہ اڈہ بنا رکھا تھا۔

جاسوسوں کو اس گاڑی کے متعلق اشارہ تک نہ ملتا۔ گاڑی کے ڈبوں کو ریوے سٹیشن پر بکھیر کر مختلف جگہوں پر ان میں گولہ بارود لاد اگیا تھا۔ صرف ٹینک اور توپیں تھیں جو سب کو نظر آسکتی تھیں۔ ایمونیشن نہایت ڈھکے چھپے طریقے سے لاد اگیا تھا لیکن ریوے کا ایک کمرک تھا جسے جنگ کے دوران سنی خیز خبریں سنانے کا ضبط تھا۔

”کل صبح پاک فوج کھیم کمرن سے جالندھر پر حملہ کر رہی ہے“۔ اس بابو نے اپنی بیوی کو یہ خبر سنائی۔ ادھر لاہور سے جوابی حملہ ہوگا اور امرتسر پر قبضہ کیا جائے گا اور ایک ہفتے کے اندر اندر پاک فوج دلی پہنچ جائے گی۔ آج رات باون ڈبوں کی مال گاڑی گولہ بارود سے لدی ہوئی لاہور جا رہی ہے۔ اس میں ٹینک بھی ہیں، توپیں بھی ہیں۔“

بیوی نے پروسن کو بتایا اور کہا۔ ”ساتھ ڈبوں کی مال گاڑی گولے اور توپیں لاہور لے جا رہی ہے۔ منے کے ابا کو ایک فوجی افسر نے بتایا ہے کہ کل صبح ہماری فوج امرتسر اور جالندھر پر حملہ کرے گی۔ پروسن نے آگے چلائی اور چلتے چلتے بات محلے سے نکل کر قریبی ہوٹل میں پہنچ گئی۔ وہاں تک بات پہنچانے والے نے اپنے آپ کو اہم اور باخبر شخصیت ثابت کرنے کے لیے بلا خوف تردید کہا۔ ”میرا چچا زاد بھائی میجر ہے۔ اس وقت واہگہ سیکڑ میں ہے۔ ابھی ابھی اُس کا خط آیا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ کل تک امرتسر ہمارے قبضے میں ہوگا اور یہ بھی کہ ریوے کا سٹاف امرتسر جا رہا ہے۔ ستر، اسی ڈبوں کی مال گاڑی ہم، گولے، ٹینک، توپیں اور پٹرول لے کر پنڈی سے روانہ ہونے والی ہے۔“

یہ خبر ہوٹل میں پھیل گئی اور سب نے سچ مان لی۔ کسی نے بھی نہ سوچا کہ واہگہ سیکڑ میں لڑنے والے کسی میجر کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ خط لکھ سکے اور نہ کوئی پاکستانی میجر جنگی سیکس اپنے رشتہ داروں کو بتایا کرتا ہے۔

ہوٹل میں ایک جواں سال آدمی کھانے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ ادھر یہ خبر اُس کے کان میں پڑی ادھر بیرے نے اُس کے سامنے کھانا لا رکھا۔ وہ آدمی کھانے کی طرف دھیان دیتے بغیر اٹھا اور ہوٹل سے نکل گیا۔ بیرے نے سوچا شاید ہاتھ دھوئے گیا ہے لیکن وہ لوٹ کے نہ آیا۔ ہوٹل کے عادی گپ ہازوں نے ذرہ بھر دھیان نہ دیا کہ ایک اجنبی صورت آدمی ان کی باتوں کو ذہن نشین کر کے بڑے ہی خطرناک ارادے سے کھانا کھاتے بغیر ہوٹل سے اُٹھ گیا ہے۔

ذرا سی دیر بعد وہ آدمی ریوے سٹیشن کے پل پر کھڑا ایک کتاب پڑھ رہا تھا مگر کسی کو علم نہ تھا کہ اُس کے ہاتھ ہونٹ کتاب نہیں پڑھ رہے بلکہ جالندھر کے انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر کو گاڑی کی تفصیلات اور اس کی روانگی کا وقت بتا رہے ہیں۔ گاڑی اُس کی نظروں کے سامنے تھی اور چلنے کو تیار تھی۔



چند لمحوں میں راولپنڈی سے لاہور تک پھیلے ہوئے بھارتی جاسوسوں کو اس گاڑی کی اطلاع مل گئی۔ وہ گاڑی کو کسی بھی مقام پر تباہ کر سکتے تھے لیکن جن جاسوسوں کے پاس ڈائنامیٹ اور ڈینمو ایکلوٹر تھا وہ وزیر آباد کے علاقے میں تھے کیونکہ وہ کئی روز سے چناب کے پل کو اڑانے کی فکر میں تھے لیکن پلوں پر پہرے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ اب راولپنڈی کے جاسوسوں نے انہیں خبردار کر دیا کہ مال گاڑی آرہی ہے۔ انہوں نے انجن کا نمبر بھی بتا دیا تھا، رفتار بھی بتادی اور وزیر آباد سٹیشن پر پہنچنے کا وقت بھی بتا دیا۔ انہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس گاڑی کو وزیر آباد سے آگے نہ جانے دیں۔

اس گاڑی میں ہر طرح کا چھوٹا بڑا ایمونیشن تھا۔ ورکشاپ سے نکلے ہوئے تین ٹینک اور چار میڈیم توپیں بھی اسی گاڑی میں جا رہی تھیں اور اسی گاڑی کے ساتھ پانچ پٹرول ٹینک بھی تھے۔ پاکستانی ایک ہی گاڑی میں اس قدر مختلف اور اس قدر زیادہ سامان بھجنے کی غلطی کرنے والے نہیں ہوتے۔ یہ بھی غلطی تھی کہ تیل پٹرول اور ایمونیشن والی ریل گاڑی دن کو چلا دی گئی تھی۔ ایسی مال گاڑیاں رات کو چلائی جاتی تھیں تاکہ دشمن کے ہوائی حملوں سے محفوظ رہیں لیکن محاذوں کی ضرورت کے پیش نظر اتنا بڑا خطرہ مول لینا پڑا۔ فضائیہ کے دو طیاروں کو اس گاڑی کی حفاظت کے لیے بھیج دیا گیا تھا جو گاڑی کے اوپر اوپر چکر میں اڑ رہے تھے۔ محوڑی دیر بعد دو تازہ دم طیارے اُڑتے اور پہلے طیارے واپس چلے جاتے تھے۔ پلوں پر پولیس اور فوج کے پہرے تھے لیکن کوئی بھی نہ دیکھ سکا کہ وزیر آباد کے قریب بھارتی جاسوسوں نے گاڑی کو تباہ کرنے کا سامان تیار کر رکھا ہے۔

یہ مال گاڑی راولپنڈی سٹیشن سے نکل کر ابھی دو تین میل ہی گئی ہوگی کہ ہوا کی لہروں پر تیرتی ہوئی اطلاع جالندھر کرنل گپتا کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئی کہ ایک اہم مال گاڑی راولپنڈی سے نکل گئی ہے۔

کرنل گپتا کو اپنے جاسوسوں پر کوئی ایسا بھروسہ نہیں تھا کیونکہ وہ جنگ کے اتنے دنوں میں پاکستان میں کوئی نمایاں تباہی نہیں کر سکے تھے۔ اُس نے انہیں اس گاڑی کو تباہ کرنے کی ہدایت دے دی لیکن انڈین ایئر فورس کے ڈائریکٹر آف آپریشن کو بھی ٹیلی فون کیا اور اُسے راولپنڈی کے جاسوسوں کی رپورٹ کے مطابق بتایا کہ رات کو فلاں وقت ایک ایسی مال گاڑی وزیر آباد اور جہلم کے درمیان ہوگی، اسے تباہ کرنے کے لیے چار لاکھ بمباری تیار ہیں۔ ڈائریکٹر آف آپریشن نے چٹانکوٹ، ہواڑہ اور آدم پور کے ہوائی اڈوں کا وقت کی



کیفیت کا جائزہ لیا تو اُسے معلوم ہوا کہ ہواڑہ اور آدم پور کے رن دے پاک فضائیہ کی بمباری سے بریکر ہیں۔ پٹھانکوٹ کی کیفیت بھی تسلی بخش نہیں تھی۔ صرف انبالہ کا ہوائی اڈہ مکمل طور پر صحیح سلامت تھا جہاں کم ڈیش پچاس لڑاکا بمبار طیارے موجود تھے لیکن اُس رات اُن طیاروں کا مشن کچھ اور تھا۔ انہیں اُس رات سرگودھا کے ہوائی اڈے پر فیصلہ کن حملہ کرنا تھا۔

انڈین ایئر فورس سرگودھا کے ہوائی اڈے کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کر چکی تھی لیکن یہ کوشش اُسے بہت ہنگامی پڑ رہی تھی۔ ستمبر کے پہلے ہی حملے میں پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے دشمن کے گیارہ طیارے گرا لیے تھے۔ اس کے بعد بھارتی ہوا بازوں کو دن کے وقت سرگودھا پر حملے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ رات کے وقت غول درغول آتے رہے مگر پاک فضائیہ کے اس عظیم اڈے پر خراش تک اُسے بغیر اپنے ایک دو طیارے ہر رات دے جاتے رہے۔

اُس رات جب ایمنویشن لٹاکاڑی راولپنڈی سے چلی، انڈین ایئر فورس کے اکیس لڑاکا بمبار طیارے انبالہ کے ہوائی اڈے پر تین میں کھڑے تھے اور ان کے ہوا بازوں کو سرگودھا پر حملے کی ہدایت دی جا رہی تھیں۔ اُن بتایا جا رہا تھا کہ وہ راکٹوں اور ہزار ہزار پونڈ کے بموں کے علاوہ نیپام (آگ پھیلانے والے) بم بھی لے جا رہے ہیں۔ انہیں چھ چھ کے غول میں رات بھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے سرگودھا پر حملہ کرنا تھا۔

اتنے میں کرنل گپتا کا فون چلا گیا تو ڈائریکٹر آف آپریشن نے اُسے جواب دیا کہ چار کینبرا طیارے پاکستانی گاڑی کو وزیر آباد سے پورے تباہ کر دیں گے۔ اُس نے سرگودھا کے حملے کی ہدایت کو ذرا سی دیر کے لیے ملتوی کر کے کینبرا سکواڈرن کے چار ہوا بازوں کو بلایا اور انہیں نقشے پر جہلم سے لاہور تک کی ریلوے لائن دکھا کر ہدایت دی کہ ایک مال گاڑی آرہی ہے۔

”اس گاڑی کی نشانی یہ ہے کہ اس پر چار ٹینک لدے ہوتے ہیں اور چار پٹرول ٹینک بھی ہیں۔“ اُس نے اپنے ہوا بازوں سے کہا۔ ”گاڑی کا انجن ڈیزل نہیں ہے۔ ٹینک کا موٹلاڑ نہیں ہیں۔ رات چاندنی ہے۔ ایک ہزار فٹ کی بلندی سے پہچان سکو گے۔ غلط گاڑی کو ہٹ کر کے نہ آجائے۔ یہ تمام گاڑی ایمنویشن سے بھری ہوتی ہے۔ اگر یہ گاڑی لاہور سے پرے ختم ہوگئی تو انڈین آرمی کھیم کرن والپس لے سکتی ہے۔ ورنہ یاد رکھو، جالندھر بھی خطرے میں ہے۔ تم مشین گن اور راکٹ استعمال کرو گے۔ اگر طیاروں میں بم لگے ہوتے ہیں تو اترو دو۔ اگر تارگیٹ اچھی طرح نظر نہ آئے تو فلیئر پھینک لینا۔“

تھوڑی دیر بعد انبالہ کے ہوائی اڈے پر جو اکیس طیارے کھڑے تھے ان کی تعداد پچیس ہوگئی۔ سرگودھا پر حملہ کرنے والے پہلے چھ ہوا بازوں اور گاڑی کو تباہ کرنے والے چار طیاروں کو ایک ہی وقت میں ٹیک آف کرنا تھا۔ ڈائریکٹر آف آپریشن کا خیال تھا کہ گاڑی اور سرگودھا پر ایک ہی وقت حملہ کیا جائے تاکہ گاڑی کو پہچاننے کے لیے سرگودھا سے کوئی طیارہ نہ اڑ سکے۔

رات جب گاڑی جہلم سے فور پرے ہی تھی، انبالہ کے ہوائی اڈے پر پچیس لڑاکا بمبار

طیاروں میں بم اور راکٹ لگاتے جا رہے تھے۔ ان کی مشین گنوں میں ایمنویشن ڈالا جا رہا تھا۔ وہ رات پاکستان کے لیے دہشت ناک رات تھی۔ پاکستان کے آسمان پر چاند بھلا کھسا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اگلے لمحے کیا ہوگا۔ پاک فوج کی قسمت کا انحصار باون ڈبوں کی اس مال گاڑی پر تھا جسے تباہ کرنے کے لیے انڈین ایئر فورس کے چار کینبرا طیارے انبالہ کے ہوائی اڈے سے اڑنے والے تھے اور سرگودھا کے ہوائی اڈے کی عظمت کے محافظ پاک فضائیہ اور پاک فوج کے زمینی توپچی تھے جنہیں ابھی گماں تک نہ تھا کہ اُن پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

عین اُس وقت جب انبالہ میں پاکستان کی تباہی کے فضائی انتظامات مکمل ہو رہے تھے، پاک فضائیہ کے ایک ہوائی اڈے پر بمبار شاہبازوں کو انبالہ پر بمباری کی ہدایت دی جا رہی تھیں، اُس وقت تک پاک فضائیہ نے انبالے کے ہوائی اڈے پر حملہ نہیں کیا تھا۔ انبالہ انڈین ایئر فورس کا سب سے اہم ہوائی اڈہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس اڈے کو جدید ترین اور فوری ریڈار سے لیس کرنے کے علاوہ اس کے دفاع کے انتظامات دہشت ناک تھے۔ وہاں زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل بھی نصب تھے جن کا نشانہ خطا ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں ہوتی پٹھانکوٹ، ہواڑہ، آدم پور، جام نگر اور جموں کے ہوائی اڈوں کو پاک فضائیہ بے کار کر چکی تھی۔ اب انڈین ایئر فورس کے فضائی حملے انبالہ سے ہوتے تھے۔ پاک فضائیہ کے شاہبازوں کے لیے انبالہ کا اڈہ چیلنج بن گیا تھا۔ آج رات پاک فضائیہ نے تمام تر دشواریوں، فاصلے اور خطروں کے ساتھ یہ چیلنج قبول کر لیا تھا۔



تھوڑی دیر بعد پاک فضائیہ کے دو بمبار طیارے انبالہ کا رخ کیے جنگ کے خطرناک اور اہم ترین مشن پر جا رہے تھے۔ انبالہ سے چار کینبرا طیارے گاڑی کو تباہ کرنے کے لیے اڑنے والے تھے اور سرگودھا پر حملہ کرنے والے چھ ہوا باز بھی طیاروں کی طرف چل پڑے تھے۔ پاک فضائیہ کے بمبار شاہبازوں کو کچھ علم نہ تھا کہ انبالہ کے ہوائی اڈے پر ان کے لیے پچیس لڑاکا بمبار طیارے کھڑے ہیں۔

پاک فضائیہ کے دونوں بمبار اس قدر کم بلندی پر انبالہ تک جا پہنچے کہ انبالہ کا ریڈار انہیں دیکھ ہی نہ سکا۔ یہ پاک فضائیہ کے شاہبازوں کا کمال تھا کہ انہوں نے دشمن کو بے خبری میں جالیا۔ اچانک انبالہ کی فضا لرزے لگی۔ انبالہ کے طیارہ شکن توپچیوں نے آسمان کو آگ سے بھر دیا۔ ڈائریکٹر ایمنویشن نے فضا میں آگ کی لکیروں کا جال تن دیا اور پاک فضائیہ کا پہلا بمبار شاہباز انکو ٹھانٹا۔ پراور ہونٹوں پر خدا کا نام لیے دشمن کے پچیس طیاروں کی صف کے اوپر پہنچ گیا۔ اُس نے طیارہ شکن فائر کے جہنم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بمباری کا بیج دبا دیا۔ ہزار ہزار پونڈ کے چار بم گرے نیچے بھیانک دھماکے ہوئے جن کا لرزہ دلی تک محسوس کیا گیا ہوگا۔ نیچے اندھیرا تھا۔ بمبار شاہباز کو ابھی علم نہ تھا کہ اُس نے انڈین ایئر فورس کی کمر توڑ ڈالی ہے۔

اُس کے پیچھے جب دوسرا شاہباز بم گرانے آیا تو اُس نے دیکھا کہ نیچے جانے کتنے طیارے جل رہے تھے۔ ان شعلوں کی روشنی میں اُسے کچھ محفوظ طیارے نظر آ گئے۔ اُس نے بھی خدا



ہے۔ یہ پیغام بیٹری کمانڈر کے لیے تکلیف دہ تھا۔  
کچھ ایسی ہی ہدایت لاہور کے ایک محاذ کے بمالین کمانڈروں کو دی گئی کہ مارٹر شیل  
ذرا سنبھل کر فائر کرو۔ ایمونیشن آ رہا ہے۔ مارٹر کی ضرورت پڑے تو آرٹلری سپورٹ کرے گی،  
فورا آرٹلری اور ٹینک سکواڈرن سے ملاپ کرو۔

ایمونیشن ہوا کی رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ گاڑی جہلم سے نکل آئی تھی اور لالہ موسیٰ کاٹیشن قریب  
آ رہا تھا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ چاندنی کھنی کھنی تھی۔ گاڑی کو لاہور پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ  
گھنٹہ چاہیے تھا۔

وزیر آباد سے ذرا آگے ریلوے لائن پر ایک ضعیف بوڑھی عورت لاٹھی کے سہارے  
کھڑی تھی۔ قریب کے گاؤں کے دو آدمی اُس کے قریب سے گزر گئے تھے۔ انہیں ذرہ بھر شک نہ  
ہوا تھا کہ وہ بڑھیا کے روپ میں ایک بہت خطرناک جاسوس ہے جس نے لائن کے سلیپر کے  
نیچے بڑا ہی طاقتور ڈائنامیٹ (بارود) رکھ دیا ہے اور دُور پر سے ایک درخت کے نیچے دو  
ملنگوں نے تار کا ایک سرسٹیموائیکپلوڈر کے ساتھ لگا کر دوسرا سرسٹیم لائن کے قریب ایک جھاڑی  
تک پہنچا دیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ تار ڈائنامیٹ سے ملنے والا تھا۔

ضوبیدار اکبر علی کو اس گاڑی کی اطلاع مل چکی تھی اور یہ بھی کہ یہ گاڑی کس قدر اہم ہے۔  
وہ اپنے خفیہ دفتر میں وائس سید سے کان لگائے بیٹھا تھا۔ اُسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ  
گاڑی کی اطلاع جاسوسوں کو بھی مل چکی ہے۔ وزیر آباد کی فضا میں اجنبی پراسرار اور دشمن آوازیں  
اُسے پاگل کیے جا رہی تھیں۔ وہ اتنی جلدی سخت قبول کرنے والا نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ  
اُس کا بڑا مقابل انڈین آرمی کا کنٹرول گپتا ہے جس کے ہاتھوں تربیت پاتے ہوئے جاسوس  
انٹری نہیں ہو سکتے۔

آج کی رات کنٹرول گپتا، اُس کے جاسوسوں اور اکبر علی کے لیے آزمائش کی رات تھی۔  
ایمونیشن سے لدی گاڑی گزر رہی تھی جسے خیریت سے لاہور پہنچانا اکبر علی کا فرض تھا اور اسے  
راستے میں تباہ کرنا کنٹرول گپتا اور اُس کے جاسوسوں کا عزم تھا۔

اکبر علی اپنے سید پر بیٹھا وائس کے گتھم گتھا پیغامات سن رہا تھا۔ کوئی آواز عجیب سے  
اُکوڑ میں تھی۔ ان ہی میں ’مورس کوڈ‘ کی آوازیں بھی تھیں اور ایک آواز کسی کسی وقت صاف  
سنائی دیتی تھی۔ ”رانا کالنگ.... نائن ٹو فور.... بونگی.... راجا۔ راجا۔ آؤٹ!“

اکبر علی کے دماغ کی نیس تنی ہوئی تھیں۔ اُس نے گھڑی دیکھی اور اُسے جو ہدایات ملی تھیں  
ان کے پیش نظر اندازہ کیا کہ اس وقت مال گاڑی کس مقام پر ہوگی۔ جوں جوں گاڑی قریب آ رہی  
تھی، اکبر علی کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ جاسوس وزیر آباد  
کے علاقے ہی میں ہیں اور یہ بھی کہ گاڑی شدید خطرے میں ہے۔ گاڑی کو روکا نہیں جاسکتا تھا۔  
اگر محاذوں کی ضرورت شدید نہ ہوتی تو اکبر علی کیپٹن طارق سے کہہ کر گاڑی کو کہیں پیچھے ہی رُکوا

کا نام لے کر چار بم گرا دیتے جو ان پچیس طیاروں پر گرے۔ دشمن کے ان طیاروں کے ساتھ بم  
نیپام بم اور راکٹ لگے ہوئے تھے۔ پاک فضائیہ کے بمباروں کے بموں سے یہ بھی پھٹے اور  
اپنے ہی اڈے کو بھیانک کھنڈروں میں بدل دیا۔

پاک فضائیہ کے بمبار دوسرے حملے کے لیے غوطے میں گئے اور ہنگروں اور دیگر اہم  
عمارتوں کا صفایا کر کے خیریت سے پاکستان کا رخ کر لیا۔

پاک فضائیہ کی راست گوئی کا سب سے بڑا ثبوت انبالہ کے ہوائی اڈے کی تباہی ہے  
کیونکہ پاک فضائیہ کے ان بمبار شاہبازوں نے واپس آ کر کہا تھا کہ ہم نے نیچے بے شمار جگہوں  
سے آگ کے شعلے اٹھتے دیکھے تھے جن میں شاید چار پانچ شعلے جلتے طیاروں کے تھے چنانچہ  
پاک فضائیہ نے اخباروں اور ریڈیو کو خبر دیتے ہوئے دشمن کے صرف چار طیاروں کی تباہی بتائی  
تھی لیکن ایک امریکی رپورٹر اتفاق سے اُس وقت انبالہ میں موجود تھا اُس نے خبر دی تھی کہ  
پاک فضائیہ گذشتہ رات انڈین ایئرفورس کے پچیس طیارے تباہ کر گئی ہے۔ اسی نامہ نگار نے  
خبر دی تھی کہ یہ پچیس طیارے پاکستان کے کسی اڈے پر فیصلہ کن ہوائی حملہ کرنے کے لیے  
تیار ہو رہے تھے۔

پاک فضائیہ کے ان دو بمبار شاہبازوں نے نہ صرف سرگودھا کو بچا لیا بلکہ پاکستان کی  
ایک اہم ترین مال گاڑی کو بھی بچا لیا اور بھارت کے سب سے بڑے ہوائی اڈے کو بچپیاں  
سمیت تباہ کر کے پاکستان کے آسمان کو دشمن کے طیاروں سے محفوظ کر لیا۔

لیکن وزیر آباد سے ذرا آگے ریلوے لائن سے کوئی ڈیڑھ میل دور ایک درخت تلے  
دوست ملنگ بیٹھے ”علی حیدر، علی حیدر“ کے نعرے لگا رہے تھے۔ کسانوں نے انہیں لکھا  
اور ملنگ سمجھ کر ان کے قریب سے گزر گئے جس جگہ پر ملنگ بیٹھے ہوئے تھے، وہاں اُنہوں  
نے چھوٹا سا ایک بکس اور ڈیڑھ میل لمبی تار زمین میں دبا رکھی تھی۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ اگر  
گاڑی رستے میں کہیں بھی نہ رُکی تو وہ کتنے بچے وزیر آباد سے گزرے گی۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ گاڑی جہلم سے پرے ترکی اور ڈومیلی کے پہاڑوں میں سے  
گزر رہی تھی۔ رفتار بہت تیز تھی اور گاڑی ہرٹیشن سے دن تھوڑا ہو رہی تھی۔

پسرور کے قریب پاکستان کی ہیوی آرٹلری رجمنٹ کی ایک دوسو پونڈر توپ کے توپچیوں  
نے اپنے حوالدار سے چلا کر کہا۔ ”ایمونیشن، ایمونیشن“۔ دشمن کے ٹینک ایک اور پہلو سے  
حملہ آور ہونے کے لیے جمع ہو رہے تھے۔ توپچیوں نے دیکھا کہ ٹریکٹر میں بہت تھوڑے گولے  
رہ گئے تھے، کمانڈر کے انہیں دوسری گولوں سے تھوڑے تھوڑے گولے منگوا دیے لیکن  
وہ سوچنے لگا کہ اس محاذ پر ایک بھی توپ خاموش ہو گئی تو دشمن کو راہ مل جائے گی۔ اس محاذ کو  
سنبھالنا انفسطری کے بس کی بات نہ تھی۔ یہاں ٹینکوں اور بڑی توپوں کی ضرورت تھی۔ ریر انٹیلان  
سے اسے ایمونیشن مل تو گیا لیکن ساتھ یہ پیغام بھی ملا کہ ذرا احتیاط سے فائر کرو، ایمونیشن آ رہا



”تم ادھر خیال رکھو“۔ صوبیدار اکبر علی نے کہا۔ ”میں ذرا باہر کا چکر لگاؤں“۔ اُس نے آہ لے کر کہا۔ ”اللہ مددگار ہے“۔

وہ باہر نکل گیا۔ باہر جا کر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اندر رہ کر بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ باہر جا کر اُسے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ کچھ کر رہا ہے۔ متحرک رہنے سے اُسے اطمینان سا ہوتا تھا۔ گلی سے نکل کر وہ ذرا کھلی جگہ گیا تو فضا میں مانوس گر جدار زناٹہ سنائی دیا۔ پاک فضا تیرہ کے دو سیدہ طیارے بڑی کم بلندی پر اڑتے گزر گئے۔ صوبیدار اکبر علی یوں لرز گیا جیسے طیاروں کی گرج اس کے سینے میں داخل ہو گئی ہو۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

طیارے آگے جا کر واپس آ گئے۔ اب اُن کی بلندی کچھ اور کم تھی۔ اکبر علی سمجھ گیا کہ یہ اپنے طیارے ہیں۔ اگر دشمن کے ہوتے تو چناب کے پُل پر لگی ہوئی طیارہ شکن گنیں آسمان کو آگ سے بھر دیتیں۔ پُل کے محافظوں کو ہدایات مل چکی تھیں۔

سیدہ طیاروں کے آگے جانے اور واپس آنے سے ظاہر ہوتا تھا کہ گاڑی وزیر آباد کے قریب آگئی ہے۔ اپنے یہ دو طیارے صوبیدار اکبر علی کو نظر نہیں آتے تھے۔ چاندنی تو تھی لیکن طیارے نظر نہیں آ سکتے تھے۔ اکبر علی کو اتنا اطمینان ہو گیا کہ اپنے طیارے ساتھ ہیں۔ ان کی موجودگی میں دشمن کے طیارے ریل گاڑی پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ اکبر علی کو معلوم نہ تھا کہ دشمن کے بمبار طیارے آگے تو اپنے سیدہ طیارے کچھ بھی نہیں کر سکیں گے کیونکہ سیدہ طیارے نائٹ فائبر نہیں تھے، یعنی یہ رات کو لڑنے کے قابل نہیں تھے۔ یہ صرف دن کو لڑ سکتے تھے۔ یہ احتیاط کے طور پر یا اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے گاڑی کے ساتھ بھیج دیئے گئے تھے۔

اپنے طیاروں کی آواز سن کر صوبیدار اکبر علی کے خیالوں کا دھارا رُخ موڑ گیا۔ اسے بھارت کے حملے کا پہلا دن یاد آ گیا اور معاہدہ عورتیں نظروں کے سامنے آ گئیں جنہیں بھارتی سپاہی سرحدی دیہات سے اٹھا لے گئے تھے اور جو گاؤں میں شہید ہو گئی تھیں اور وہ بھی جو بچ نکلی تھیں اور بڑی بڑی حالت میں لاہور پہنچی تھیں۔ اُسے وہ نیچے یاد آتے، معصوم، بھولے بھالے بچے جن کی تو ملی زبانون نے ابھی ”پاکستان زندہ باد“ کہنا بھی نہ سیکھا تھا مگر

لیتا لیکن گاڑی کو ہر قیمت پر خیریت سے لاہور پہنچانا تھا۔ اُس نے اپنے طور پر اندازہ لگایا کہ جاسوس چناب کے پُل کی طرف نہیں ہو سکتے کیونکہ پُل پر پہرہ ہے۔ اس سے آگے نالہ لکھو کے پُل پر بھی پہرہ تھا۔ لہذا گاڑی کو تباہ کرنے والے جاسوس وزیر آباد سے آگے لاہور کی طرف ہو سکتے ہیں۔ اُسے انتہائی تلخ خیال آیا۔ ”اگر وہ اس سے بھی آگے ہوئے تو؟“۔ وہ ٹرپ اٹھا۔ اُس نے وائرلیس کی جواوازیں سنی تھیں، ان کے مطابق اُسے یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ گاڑی کو طیاروں سے تباہ نہیں کرایا جاسکے گا جو کچھ ہو گا زمین پر ہو گا۔ یہ مال گاڑی اکبر علی کے لیے اپنی بیٹیوں کی آبرو کی طرح مقدس بن گئی۔ اُس کے ساتھ ایک حوالدار اور دو لانس نامک تھے جن میں سے ایک وائرلیس آپریٹر تھا۔

اکبر علی نے تھانے میں فون کیا اور تھانے کے انچارج سے کہا۔ ”وزیر آباد سے دھونکل تک ریلوے لائن کا خیال رکھو۔ کانسٹیبلوں کو راتوں کی جگہ پستول دینا اور وہ وردی میں نہ ہوں پستول چھپا کر رکھیں۔۔۔ فون کمیٹین طارق صاحب کو دو۔۔۔ السلام علیکم سر! میں ہر طرح تیار اور چوکس ہوں سر! گڈ ہے۔۔۔ فکر نہیں سر! میں نے اسپیکر کو تباہ دیا ہے اسے کیا کرنا ہے۔ آپ ذرا سختی سے کہہ دیا۔“

کمیٹین طارق نے اکبر علی کو کچھ ہدایات ایسے اشاروں میں دیں جنہیں اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وزیر آباد پولیس کی نفری اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ریلوے لائن پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کانسٹیبل کھڑے کیے جاسکتے کمیٹین طارق کے کہنے پر اسپیکر نے چھ کانسٹیبلوں کو تیار کر کے انہیں ہدایت دی کہ وزیر آباد سے دھونکل تک ریلوے لائن کے دونوں طرف بکھر کر گھومتے رہیں اور پانچ چھ میل کے اس علاقے کو نظر میں رکھیں۔ جب گاڑی گزر رہی ہو تو کسی بڑی آدمی کو لائن کے قریب مشکوک حالت میں دیکھیں تو اُسے پکڑ لیں۔

”اگر وہ دور ہو تو اُسے گولی مار دیں“۔ کمیٹین طارق نے کہا۔ ”اگر کوئی بے گناہ مارا جاتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ گاڑی ایک انسانی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔ جب گاڑی گزر رہی ہو تو کسی کی پرواہ نہ کرنا کسی پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں۔ گولی کی زبان میں بات کر دو۔ گاڑی کو وزیر آباد سے ٹھیک گزانا ہے۔ اگر گاڑی کو اس علاقے میں کچھ ہو گیا تو تھانے میں واپس نہ آنا، اپنے آپ کو گولی مار لینا۔ جاؤ اور پاپیادہ دھونکل تک چلے جاؤ، پھر واپس آؤ۔ دوسرے حکم تک ٹھہرتے رہو۔“

ریلوے لائن سے ڈیڑھ میل دور بیٹھے ہوئے دو ملنگوں نے ریل گاڑی کو تباہ کرنے کا مکمل انتظام کر لیا۔ ریلوے لائن میں ڈائنامیٹ رکھا جا چکا تھا۔ یہ ملنگ کمیٹین طارق، صوبیدار اکبر علی اور پولیس کی نظروں سے بہت دور تھے۔

”پُل کا فکر نہیں“۔ اکبر علی نے کہا۔ ”وہاں ایک نائب صوبیدار ہے۔ اُس کے ساتھ بتا ہو چکی ہے۔ اُس کا بندوبست ٹھیک ہے۔“

”گاڑی قریب ہی ہوگی“۔ حوالدار نے کہا۔



لے۔ رن کچھ کے معرکے کے دوران اُس نے اپنے کانڈنگ آفیسر کو نہیں بریگیڈیر سے کہا تھا کہ اُسے ایٹلی جنس ڈیوٹی سے ہٹا کر کسی ٹالین میں بھیج دیا جائے لیکن بریگیڈیر نے اُسے احساس دلایا تھا کہ جو محاذ اُسے سونپا گیا ہے وہ فیلڈ سے زیادہ اہم ہے۔

اُسے غصہ آنے لگا۔ وہ اپنی ڈیوٹی کی اہمیت کو سمجھتا تھا لیکن وہ اس سے بڑھ کر کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کے ساتھ حساب چکانے کو بیتاب ہوا جا رہا تھا۔ وہ دشمن کی تڑپتی لاشیں اور بہتا خون دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنا خون دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کرنل گپتا کے سامنے جا کر اُسے لکارنے کو اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا مگر کرنل گپتا جالندھر میں بیٹھا تھا اور جالندھر بہت دور تھا۔

اُس نے پہلی جنگ عظیم کی باتیں سنی تھیں اور دوسری جنگ عظیم میں خود لڑا تھا۔ اُس نے جنگ وامن کے فلسفے پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ وہ فوجی تھا فلاسفر نہیں تھا۔ اُس کا ایک ذاتی نظریہ ضرور تھا کہ جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ اُس نے انگریزوں کا راشن کھایا تھا اور وہ ان کی طرف سے لڑا تھا مگر اُسے انگریزوں سے نفرت تھی۔ اُسے ہر اُس قوم سے نفرت تھی جو جنگ میں شریک تھی۔ آج جب جنگ اس کے اپنے وطن میں سرحد پھلانگ آئی تو اُسے احساس ہونے لگا کہ جنگ کس قدر اہم اقدام ہے۔ ایک زندہ اور خوددار قوم کا جنگجو ہونا کس قدر لازمی ہے اور اُس پر یہ انکشاف بھی از خود ہو گیا کہ پاکستانی جنگجو ہیں جنگ پسند نہیں اور اگر ان پر جنگ ٹھونس دی جائے تو وہ اپنے وطن کے ایک ایک انچ اور مٹی کے ایک ایک ذرے کے لیے کھڑے رہیں گے۔

”اب کفر کے ساتھ فیصلہ کن معرکہ لڑ کے ہی دم لیں گے۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ دوسرا روز تھا اُس نے شیو بھی نہیں کی تھی اور چائے اور چند ایک لکڑیوں کے سوا کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ اُس کے سٹاف کا بھی یہی حال تھا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی اُس نے اپنے حوالدار اور ڈولہ لانس نائیکوں سے کہا تھا کہ کھانا ہمیں منگو اور باری باری جا کے کھاؤ۔“

”کھالیں گے صاحب!“ ایک لانس نائیک نے کہا تھا۔ ”گاڑی گزر جانے دیں“ اور وہ اپنے کام میں محو رہے۔ اکبر علی خراماں خراماں چائے کی سامنے والی دکان کی طرف چل پڑا بلیک آؤٹ کی وجہ سے دکان کے اندر کونے میں ایک موم بتی جل رہی تھی۔ اکبر علی کا ارادہ تھا کہ اپنے سٹاف کے لیے چائے اور بند وغیرہ بھجوا دے گا۔ رات زیادہ تو نہیں گزری تھی، لیکن گلیاں اور سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ لوگ گھروں میں بند تھے۔ سو گتے تھے یا گپ شپ لگا رہے تھے۔

اکبر علی چائے کی دکان سے دور ہی تھا کہ ایک جوان سال عورت نے اُس سے روک لیا۔ وہ کوئی دیہاتی عورت تھی۔ بال پریشان، دوپٹہ، شلوار اور قمیض جگمگ سے بھٹی ہوئی اور حال حلیے سے وہ مفلوک الحال معلوم ہوتی تھی۔

”میں سیالکوٹ سے آئی ہوں۔ عورت نے خوفزدہ آواز میں کہا۔“ پہلے تو پیدل چلتی رہی

اس مال گاڑی کو خیریت سے لاہور تک پہنچایا، اسے کم از کم وزیر آباد سے خیریت سے گزارنا اکیلے صوبیدار اکبر علی کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ اس ذمہ داری کا زیادہ تر حصہ کیپٹن طارق کے کندھوں پر تھا۔ اسی لیے تو وہ تھانے میں موجود رہتا تھا کہ بوقت ضرورت تھانے کی ساری نفی کو استعمال کرے۔ اس کے علاوہ جناب کے پل کی حفاظت کے لیے کسی رجنٹ کی جو پلاٹون تھی، اُسے بھی یہ حکم دیا گیا تھا کہ کیپٹن طارق کو جتنے جوانوں کی ضرورت پڑے اُسے دیتے جائیں۔

ان تمام انتظامات کے ہوتے ہوئے بھی صوبیدار اکبر علی کچھ اپنے محسوس کر رہا تھا جیسے اس ریل گاڑی کو لاہور تک خیریت سے پہنچانا اُس اکیلے کا فرض ہو اور اُسے یہ فرض براہ راست خدا نے سونپا ہو۔ کبھی اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ ریل گاڑی اُس کی ذاتی ملکیت ہو اور بھاری ایٹلی جنس کا کرنل گپتا اُس کا ذاتی دشمن ہو۔

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک افواج کے براہِ سر اور بر جوان نے اپنے آپ میں یہ احساس پیدا کر لیا تھا کہ ملک کو دشمن سے بچانا اُس اکیلے کا فرض ہے۔ اس طرح جنگ ستمبر ہر لڑنے والے کی ذاتی جنگ بن گئی تھی۔ احکام جو انہیں کمانڈروں سے ملتے تھے انہیں وہ خدا کے احکام سمجھتے تھے۔

صوبیدار اکبر علی کو بھی یہی احساس پریشان کر رہا تھا کہ اس ریل گاڑی کو تباہ کار جاسوسوں سے بچانے کے لیے وہ اکیللا رہ گیا ہے۔ کیپٹن طارق کے سلیپ فون پر بات کر کے اُس نے وائرلیس سٹیٹ کے ساتھ کان لگا لیے۔ اُسے زیادہ تر ”مورس کوڈ“ کی ٹٹ ٹٹیں سنائی دے رہی تھی۔ اُس کا وائرلیس آپریٹر ان آوازوں کو لکھ رہا تھا لیکن پیغامات کا تبادلہ خفیہ کوڈ میں ہو رہا تھا۔ اکبر علی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ان الفاظ کو ڈیسیٹیفیر کرانے کے لیے لاہور بھیجتا۔ ریل گاڑی قریب آرہی تھی۔

”صاحب!“ حوالدار نے کہا۔ ”کچھ ہو گا ضرور اور ہو گا وزیر آباد کے آگے یا پیچھے.... دریا کے پل کے نیچے بھی پٹرولنگ ہونی چاہیے۔ دشمن نیچے ڈائنامیٹ نہ رکھ چکا ہو۔“

کفار کے ہاتھوں کھٹ گئے۔

اُسے اپنے خاندان کے اٹھارہ شہید یاد آگئے جنہیں وہ ٹرک میں ہی بھارت کی ایک نہر میں پھینک آیا تھا۔ اُس نے اپنے وجود میں تیش سی محسوس کی جیسے اُسے بخار ہو رہا ہو۔ اُس کا دل بوجھ سے دبنے لگا اور ایک بار پھر اُس کے سینے سے خواہش ابھری کہ وہ اس زمین دور ڈیوٹی سے ہٹ کر کھلے میدان میں دشمن سے دو بدو لڑے اور مصوموں کے خون کا بدلہ اپنے ہاتھوں



راستے میں ایک رطیر سے والامل گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ رطیر سے میں لے آیا۔ پھر پیدل چلنے لگی۔ کچھ اور آگے آئی تو ایک بس والے نے بٹھالیا۔ ابھی ابھی یہاں پہنچی ہوں۔  
”کس گاؤں سے آئی ہو؟“ اکبر علی نے پوچھا۔

”ظفر وال!“ عورت نے زندھیائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”گاؤں میں کافروں نے کچھ نہیں چھوڑا۔ جو بھاگ سکے بھاگ گئے اور ہم جو قسمت کے مارے پھنس گئے۔“ اُس کی زبان لڑکھڑاگئی۔ بچکی لے کے بولی۔ ”نہ پوچھو.... میں کچھ نہ بتا سکوں گی۔ ایک ہی بچپن تھا، وہ بھی، بچکے کا باپ بھی۔“ وہ دھاڑیں مار مار روئے لگی۔

”یہاں تمہارا کوئی رشتہ دار ہے؟“

”کوئی نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔“ عورت نے روتے ہوئے کہا۔ ”لاریوں کے اڈے سے بس سے اُتری تو اس طرف چل پڑی۔ سمجھ نہیں آتی کہاں جاؤں؟“  
”تم اپنے آپ کو پاکستان میں اجنبی سمجھتی ہو؟“ اکبر علی نے کہا۔ ”ظفر وال کی بیٹی وزیر آباد والوں کے لیے غیر تو نہیں۔ بس سے اُتر کر کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتیں، گھر والے تمہیں سینے سے لگا لیتے.... خیر.... اچھا کیا جو میرے پاس آگئی ہو۔“

اس ایک عورت کو پناہ میں لے لینے سے اکبر علی کو ایسا روحانی سکون محسوس ہوا جیسے اُس نے سرحد کی تمام عورتوں کو پناہ میں لے لیا ہو۔ اُس کے دل پر جو بوجھ سا تھا، بھاری کی اٹھ گیا۔ وہ اس عورت کو ساتھ لیے گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر میں وہ اکیللا رہتا تھا۔ دونوں بیٹیاں اپنے اپنے سسرال میں تھیں۔ اُس نے راستے میں چھوٹے سے ایک ہوٹل سے چار روٹیاں اور چنہ کباب لے لیے۔

گھر پہنچ کر اُس نے موم بتی جلائی اور روٹیاں عورت کے سامنے رکھ دیں۔ وہ خود بھی بھوکا تھا۔ کھڑے کھڑے ایک روٹی پر کباب رکھا اور جلدی جلدی نوالے حلق میں ٹھونسنے لگا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔

جب صوبیدار اکبر علی اس ڈری سہمی ہوئی بے گھر عورت کے سامنے روٹی پر کباب رکھ کر کھارہا تھا، ہجرہ ایک گلی میں جا رہی تھی۔ چودھری کرامت کی رشتہ دار دو جوان لڑکیاں اُن کی بیٹی شمع کو دیکھنے آئی تھیں۔ شمع کا بخارا بھی اُترا نہیں تھا۔ لڑکیوں کو دیر ہوگئی۔ شمع کی ماں نے ہجرہ سے کہا کہ وہ ان لڑکیوں کے ساتھ ان کے گھر وں تک جائے۔ شمع کی ماں نے یہ تو سوچ لیا کہ لڑکیاں جوان ہیں، رات کے وقت اکیلی نہ جائیں لیکن اُس نے یہ نہ سوچا کہ ہجرہ بھی جوانی ہے اور دونوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ یہ لڑکیوں کو چھوڑ کر اکیلی آئے گی۔ سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی! ہجرہ نوکرانی تھی۔ نوکر وں نوکرانیوں کی عزت اور عصمت کا خیال رکھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

دونوں لڑکیاں اٹھکیاں کرتی جا رہی تھیں اور ہجرہ چپ چاپ اُن کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔

”اقبال کی ممانی کی سنی تم نے؟“ ایک لڑکی نے دوسری سے کہا۔ ”کہتی پھرتی ہے کہ میں تو اپنی بیٹی اقبال کو نہیں دوں گی۔ وہ تو ساری عمر کے لیے اندھا ہو گیا ہے۔“  
”میں سن چکی ہوں۔“ دوسری لڑکی نے کہا۔ ”وہ اس لیے کہتی پھرتی ہے کہ عورتیں اقبال کے ماں باپ کو بتادیں۔“

ہجرہ کے دل پر بڑی سخت چوٹ پڑی۔ اُسے اقبال کی ممانی پر غصہ آنے لگا لیکن وہ اپنا خون پینے کے سوا کچھ ہی کیا سکتی تھی!

وہ لڑکیوں کو اُن کے گھر وں تک پہنچا کر واپس آ رہی تھی۔ رات کا پہلا پہر گزر رہا تھا۔ چاندنی نکھرتی آ رہی تھی۔ ہجرہ کی جذباتی دنیا میں زلزلے بپا تھے۔ اُس کی طبیعت میں ہیجان اور بے قراری تھی۔ اس بے قراری میں رہ رہ کر اُسے تلخی کا احساس ہوتا تھا اور اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ کھاریاں اقبال کے پاس چلی جائے اور اُس سے باتیں سنے یا افضال کے پاس جا بیٹھے۔ یہ تو اُسے یقین ہو چکا تھا کہ افضال جانوس نہیں۔

افضال کا خیال آتے ہی اُسے میٹھی میٹھی سی تھکن محسوس ہونے لگی۔ وہ یوں افضال کے گھر کی طرف چل دی جیسے تھکا ماندہ راہ رومنز کی طرف جا رہا ہو۔

شہر میں مکمل بلیک آؤٹ تھا۔ گلیاں سنسان تھیں۔ لوگ برآمدوں میں سوتے ہوئے تھے یا پھتوں پر باتوں میں محو تھے۔ ہجرہ افضال کی گلی سے ذرا ہی دور تھی کہ اسے گلی کی نگر پر سفید برقعے میں لپیٹی ہوئی کوئی عورت کھڑی نظر آئی۔ گلی سے ایک آدمی نکلا اور عورت کو ساتھ لے کر تیز قدم دوسری سمت چل پڑا۔ ہجرہ کو یقین کی حد تک شک ہوا کہ وہ افضال ہے لیکن اُسے خیال آیا کہ افضال کا کسی عورت سے کیا کام؟

وہ تقریباً دوڑنے کی رفتار سے افضال کی گلی میں داخل ہوئی اور اُس کے دروازے پر جا رُکی۔ دستک دی تو دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ اندر اندھیرا اور سکوت تھا۔ اُس نے افضال کو پکارا کوئی جواب نہ ملا۔ اُسے یاد آ گیا کہ افضال تو یہاں سے جا چکا ہے۔ اُسے اکبر علی پر غصہ آنے لگا جس نے افضال پر جاسوسی کا الزام لگایا تھا۔ ہجرہ کو خیال آیا کہ افضال شریف آدمی ہے، اس ڈر سے کہیں اور چلا گیا ہے کہ اکبر علی اُسے گرفتار کرادے گا۔

ہجرہ کو یقین ہو گیا کہ سفید برقعے والی عورت کے ساتھ جو آدمی گیا ہے وہ افضال ہی تھا۔ وہ عورت افضال کی ماں بھی ہو سکتی تھی، بہن بھی یا سب لکھٹ کے کسی گاؤں سے بھاگی ہوئی کوئی پناہ گزین عورت بھی، مگر ہجرہ کی نگاہ میں وہ عورت تھی۔ اُسے دھچکا سا لگا جیسے وہ عورت اُس سے افضال کو چھین لے گئی ہو۔ اُس کی جذباتی حالت پہلے ہی بے ٹھکانہ تھی۔ احساسات میں صاف افراتفری بپا تھی۔ گو وہ تھکن محسوس نہیں کر رہی تھی لیکن اعصاب پر دوراتوں کی شب بیداری اور اقبال کی حالت اور اُس کی باتوں کے ہیجان کا اثر بہر صورت تھا۔ اس نئی صورت حال میں وہ اعصابی تناؤ کا شکار ہو گئی اور اُس کی سوتل مفلوج ہو کے رہ گئی۔

وہ اُن پڑھ لڑکی تھی جو پیار کی محرومی، گھر کیوں، گالیوں، تھپڑوں اور لوگوں کے باورچی خانوں



اور جوتیوں میں پل کر جوان ہوتی تھی۔ نفرت، حقارت اور زود پیشانی اُس کی ذات کے بنیادی عناصر تھے جن کے زیر اثر اُس کا ہر ردِ عمل فوری اور انتہائی ہوا کرتا تھا۔ لوگ اُسے گلیوں میں چھیڑا کرتے تھے تو اُس نے انکار سے نکل کر چپ سادھ لی تھی۔ چپ بھی ایسی جیسے پتھر بن گئی ہو لیکن اشیاء پر اتنی توانائی نہ تھی کہ اُنہیں تک نکال کر اقبال کو دینے پر تیار ہو گئی۔ جب اقبال اور اکبر علی سے نفرت تھی تو ان کی آنکھیں نوچ لینے کو تیار لیکن جب افضال اچھا لگا تو دنیا بھر کے ڈر خطرے اور شرم و حجاب کو الگ رکھ کر اُس کی گود میں جا سر رکھا۔ اب افضال کے ساتھ ایک عورت کو جلتے دیکھا تو وہ بلا سوچے سمجھے آگ بجولا ہو کر اُسی سمت دوڑ پڑی جہاں افضال چلا گیا تھا۔

صوبیدار اکبر علی نے جلدی جلدی ایک روٹی کھائی اور ظفر وال کی پناہ گزین عورت کو تسلی بخشی دے کر پیٹ بھر کر کھانا کھلایا اور اُسے پانی کا گلاس دیا۔  
”میں شاید رات کو گھر نہ آسکوں۔“ اُس نے اس عورت سے کہا۔ ”تم یہاں اطمینان سے سو جاؤ اور اسے اپنا گھر سمجھو۔ صبح تمہارا کوئی اور بند و بست کر دوں گا۔ آج کی رات یہیں گزار دو۔“  
”نہیں! عورت نے ڈر سے ہوتے بچے کی طرح کہا۔“ خدا کے لیے اکیلے چھوڑ کے نہ جانا۔ مجھے ساتھ لے چلو۔ ڈر آتا ہے۔“

اکبر علی نے اُس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بہت سی باتیں کیں مگر عورت اس قدر خوفزدہ تھی کہ اکبر علی کی راہ روک کے کھڑی ہو گئی۔ ”اللہ تیرا بھلا کرے، مجھے پناہ دی ہے تو اپنے ساتھ رکھو۔“  
اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔  
”میں تو یہ موم بتی بھی بجھا دینا چاہتا ہوں۔ شہروں میں بلیک آؤٹ ہوتا ہے مگر تم اندھیرے میں کیسے رہو گی؟“ اکبر علی نے کہا۔ ”یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ جنگ وزیر آباد سے بہت دُور ہے۔ یہاں تک دشمن کی ہوا بھی نہیں پہنچ سکتی۔ یہاں سب تمہارے سجن میں۔ اندر سے دروازہ بند کر کے سو جاؤ۔“

”نہیں۔ عورت اٹھ کر اس سے پیٹ گئی اور رو رو کے بے حال ہونے لگی۔“ خدا کے لیے رک جاؤ، نہ جاؤ۔“

اکبر علی پر رقت طاری ہو گئی۔ اس عورت کی یہ ذہنی کیفیت اُس کے لیے قابلِ فہم تھی۔ وہ دوسری جنگِ عظیم کا فوجی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگ کی زد میں آئے ہوئے شہریوں کا کیا حال ہوتا ہے۔ جب برما، ملایا، سنگاپور وغیرہ سے جاپانی شکست کھا کر پاپا ہو گئے تھے اور یہ علاقے ایک بار پھر انگریزوں کے قبضے میں آ گئے تھے تو اکبر علی کو ان علاقوں میں بھیجا گیا تھا۔ فوجیوں نے وہاں کی جوان عورتوں کے ساتھ جو خبیانہ سلوک کیا تھا، وہ بھی اُس نے دیکھا تھا۔ اُس نے ان عورتوں کی چیخیں سنی تھیں جن کے گھر جنگلے تباہ کر دیئے تھے اور انہیں اپنے بچوں کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کہاں ہیں؟ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں۔ اُس نے ایسے بچے بھی دیکھے تھے جو صدمے سے گونگے ہو گئے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے ہر کسی کو دیکھتے رہتے تھے۔

اُس نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی بربریت کی شکار بے شمار عورتیں دیکھی تھیں۔ اب ظفر وال کی اس عورت کو دیکھا جس کا اکلوترا بچہ اور خاوند دشمن کے ہاتھوں کھٹ گیا تھا تو اس پاکستانی عورت اور ملا یا وغیرہ کی عورتوں میں صرف اتنا سا فرق نظر آیا کہ یہ عورت اُس کے اپنے دیس کی تھی..... اپنی بیٹی، اپنی بہن..... اُس نے یہاں تک سوچ ڈالا کہ جہنم میں جائے ایمونیشن کی گاڑی میں پاکستان کی اس بیٹی کو ڈرنے اور تھرتھار کانپنے کے لیے اکیلا چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔

گاڑی کا خیال آتے ہی اکبر علی کو دھچکا لگا جیسے کسی اُن دیکھی فوت نے اُسے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ہو۔ اُس کے دل سے آواز اٹھی۔ ”یہ گاڑی تباہ ہو گئی تو اس عورت جیسی جانے کتنی عورتوں کی عزت تباہ ہو جائے گی۔“

ریل گاڑی کے محافظ، دو سیہ پلار سے ایک بار پھر چیختے چنگھاڑتے اوپر سے گزر گئے اور دوسرے ہی لمحے گھوم کر پھر واپس چلے گئے۔ ان کی ہیبت ناک گرج سے ڈر کر عورت نے چیخ ماری اور اکبر علی کے قدموں میں دوڑا نو ہو کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔  
”وہ آگئے، وہ آگئے۔“ وہ پاگلوں کی طرح چلانے لگی۔ ”تو یہیں.... گو لے.... میرا مننا....“  
نہ جاؤ، خدا کے لیے مجھے کہیں چھپاؤ۔“

صوبیدار اکبر علی نے دوسری عالمگیر جنگ میں بڑے بڑے ہیبت ناک لمحے دیکھے تھے۔ برما فرنٹ پر کرنل گپتا (جب وہ ناک تھا) کے ساتھ انٹیلی جنس ڈیوٹی پر ایک بار وہ دونوں اس قدر آگے نکل گئے تھے کہ جاپانیوں کے زرنے میں آ گئے۔ ان کے بچ نکلنے کی کوئی مصدقہ نہیں تھی۔ اکبر علی داتیں ران میں جاپانیوں کی دو گولیاں کھا کر دو گھنٹے جھاڑیوں، دلدل اور اونچی گھاس میں رینگ رینگ کر اس حالت میں نکل آیا تھا کہ جاپانیوں کی گولیوں سے گپتا کا لہولہان، نیم مردہ جسم، اُس کے کندھوں پر تھا۔ ایسے ہی کسی خوف ناک لمحے آئے تھے مگر وہ ہر بار موت کو جُل دے کر ڈوٹریں ہیڈ کوارٹر کے لیے قیمتی خبریں لے آیا تھا۔

اب جب جنگ اُس کے اپنے وطن میں آئی تو وہ بھوک پیاس اور نیند سے بے نیاز اپنے محاذ پر ڈٹا ہوا تھا۔ وہ بھارتی ٹینکوں سے بھی بھرا جانے کو تیار تھا لیکن ظفر وال کے سرحدی ہیٹ کی ایک مظلوم عورت اُس کی ٹانگ سے لپٹ گئی اور ادھر انموشین سے لدی مال گاڑی وزیر آباد کے قریب آگئی تو اُس کی سوجھ بوجھ شل ہو کے رہ گئی۔ اس جواں سال عورت نے اُسے جذبات کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس کے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑ گیا ہو جو اتر نہ سکے گا۔

اُس کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی اور وہ اپنے وجود میں آسیبی لرزہ سا محسوس کرنے لگا۔ مال گاڑی اور یہ جوان عورت دو متضاد قوتیں بن کر اُسے متضاد سمتوں کو کھینچنے لگیں۔ اُسے یہ خدشہ بھی نظر آ رہا تھا کہ وہ اس عورت کو یہاں اکیلا چھوڑ گیا تو وہ اس ذہنی کیفیت میں دیواروں سے سر بھوڑ لے گی یا پاگل ہو جائے گی۔ اُسے کسی قیمت پر گوارا نہ تھا کہ اُس کی پناہ میں



آئی جوئی کوئی عورت خودکشی کر لے یا پگل ہو جاتے۔ اُسے کسی کے حوالے کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ مال گاڑی لالہ موسیٰ سے زن تھر وہو آئی تھی اور بلا خوف و خطر انتہائی رفتار سے چلی آرہی تھی۔ پولیس کے کانسٹیبل ایک ایک کر کے وزیر آباد سے دور آگے نکل گئے تھے۔ وہ اس ڈانٹا میرٹ کو دیکھ نہ سکے تھے جو گاڑی کو تباہ کرنے کے لیے ایک سلیپر کے نیچے رکھا تھا۔ نہ اُس تار کو دیکھ سکے تھے جس کا سر اجاسوسوں نے جھاڑیوں میں چھپا رکھا تھا۔ یہ سر ڈنیمو ایکسپلوڈر کے ساتھ لگا دیا گیا تھا اور دوسرا ڈیٹونیٹر کے ساتھ تھا۔

عورت کی دیوانگی اور خوفزدگی کو دیکھ کر اکبر علی کی ذات کا جانباز اور فرض شناس سپاہی دم توڑنے لگا اور اس کی جگہ ایک جذباتی شہری نے لے لی۔ اُس نے جھک کر عورت کو کندھوں سے اٹھا اور اُسے اٹھالیا۔ وہ اٹھٹی اور ڈرے ہوئے بچے کی طرح اکبر علی کے سینے سے لگ گئی۔ اُس نے اکبر علی کو اپنے بازوؤں میں زور سے بھینچ لیا۔ اُس کے ملائم اور کجھرے کجھرے ریشمی بال اکبر علی کے ہونٹوں اور گالوں کو چھوئے لگے۔ اکبر علی کا سینہ عورت کے سینے کے اتار چڑھاؤ کی شدت کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگا۔ اکبر علی کا سینہ میدان جنگ بن گیا۔ نہ جانے کیسی کیسی قوتیں، کیسے کیسے جذبات، کیسی کیسی حسیں اور کیسے کیسے بچو لے خونریز معرکے لڑنے لگے۔ اکبر علی آخر مرد تھا، انسان تھا۔

ہجرہ کا سینہ بھی اسی طرح کے خونریز معرکے کا میدان بنا ہوا تھا۔ وہ افضل اور برقعہ پوش عورت کے تعاقب میں چلی جا رہی تھی۔ وہ دونوں تیز قدم چلتے اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہجرہ دوڑ پڑی۔ اُس کا ذہن نارمل نہیں رہا تھا۔ اُس پر بحر و میوں اور پیار کی پیاس کا اور افضل کی محبت کا آسیب طاری تھا۔ وہ گرد و پیش سے بے خبر دوڑتی گئی پھر رک گئی اور کچھ سوچ کر تیز چلنے لگی۔ اُسے زیادہ دیر بھٹکانا نہ پڑا۔ وہ قریبی راستے سے آگے گئی۔ ذرا ہی پیچھے اُسے افضل اور برقعہ پوش عورت اپنی سمت آنے دکھائی دیے۔ وہ ایک بند کھوکھے کی اوٹ میں چھپ گئی افضل اور عورت اُس کے قریب سے گزرے۔

”اب تیز چلو“ ہجرہ کو مردانہ آواز سنائی دی۔ ”وقت تنھوڑا ہے“

ہجرہ افضل کی آواز کو خوب پہچانتی تھی لیکن یہ آواز افضل کی نہیں تھی۔ یہ آواز عورت کی بھی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ آواز مردانہ تھی۔ وہاں کوئی تیسرا آدمی بھی نہیں تھا۔ ہجرہ کو اتنا یقین ضرور تھا کہ یہ آواز برقعے کے اندر سے آئی تھی۔ چند قدم آگے جا کر دونوں رک گئے عورت نے برقعے کا نقاب اٹھا کر گھوم کے دیکھا۔ چاندنی رات میں ہجرہ نے اچھی طرح دیکھا کہ وہ چہرہ عورت کا نہیں تھا اس چہرے پر کھنٹی مٹھنیں تھیں اور اس کے ساتھ جو آدمی تھا وہ افضل ہی تھا۔

”افضل بندوستان کا جاسوس ہے“ ہجرہ کے ذہن میں اکبر علی کی آواز گونجی۔

”جاسوسوں کا یہی تو کمال ہے کہ وہ پہچانے نہیں جاسکتے۔“ ہجرہ کو اقبال کے الفاظ یاد آئے تو اُس نے سوچا کہ افضل کو تو میں پہچان سکتی ہوں۔ اُس نے کوئی بھیس نہیں بدلا، وہ جاسوس نہیں

ہجرہ کی ذات و حصوں میں بٹ گئی۔ ”نہیں، افضل جاسوس نہیں... مگر کون جانے؟... جاسوس نہیں تو بدکار ہے؟... قریبی ہے؟... نہیں... افضل بدکار نہیں ہو سکتا۔ وہ قرآن پڑھتا ہے، نماز پڑھتا ہے... برقعے میں عورت نہیں مرد ہے... مرد کیوں ہے؟... شاید کچھ بچی چاندنی میں غلطی لگی ہو... وہ عورت ہی ہوگی!... عورت ہے تو کون ہے؟ افضل کی کیا لگتی ہے؟ افضل اس کے ساتھ مکان خالی کر کے شہر سے باہر کی طرف کہاں جا رہا ہے؟

وہ غیر یقینی کی کیفیت میں چھپ چھپ کر اُن کے پیچھے چل پڑی۔ اُس کا دماغ سوچنے سے معذور ہو چکا تھا۔ دل اور دماغ کا رشتہ ٹوٹ گیا اور وہ پراسرار برقعے کے بھید کے پیچھے یوں چل پڑی جیسے خواب میں چلی جا رہی ہو۔ افضل اور برقعہ پوش شہر سے نکل گئے اور سڑک سے اتر کر درختوں کے سائے میں چلنے لگے۔

ہجرہ بھی درختوں کی اوٹ میں تعاقب میں بڑھتی گئی۔ دل اور دماغ نے شل ہو کر اُس کے جسم کو بھی معذور کر دیا تھا۔ وہ اب قدم گھسیٹ رہی تھی اور اُسے اب یہ تعاقب بے مقصد محسوس ہونے لگا پھر اُسے سب کچھ ہی بے مقصد نظر آنے لگا۔ افضل کی محبت بے مقصد، اقبال کا اندھا ہو جانا بے مقصد، اکبر علی کی باتیں بے مقصد، یہ جنگ، یہ معرکہ بے مقصد۔ اسے یہ زندگی بے مقصد نظر آنے لگی پھر اسے اپنے جسم سے یوں گھن آنے لگی جیسے گوشت پوست کی یہ غلیظ شے کسی فریبگار مرد کی ملکیت ہو وہ ایک قدم بھی چلنے سے معذور ہو گئی مگر افضل ایک مقناطیسی قوت بن گیا اور وہ کھچی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے چلتی گئی۔

افضل اور برقعہ پوش نظام آباد کی طرف شہر سے دُور نکل گئے۔ ہجرہ اُن کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔ وہ دونوں ریلوے لائن کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں جاڑے۔ ہجرہ کئی قدم دوڑ پیچھے ایک درخت کے تنے کے ساتھ یوں بٹھ گئی جیسے تھک کر، مار کر گر پڑی ہو۔ اُسے اونگھ آنے لگی... مکروہ سی غنودگی جیسے اُسے کسی نے دھوکے میں چرس، افیون یا بھنگ پلا دی ہو جسم اور دماغ کی رہی سہی قوتیں بھی ٹھنڈی ہو گئیں۔ اُسے تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ وہ یہاں تک چلی کیوں آئی ہے؟ اور اب یہاں کیوں ڈھیر ہو گئی ہے؟ اچانک اُسے وہ وقت یاد آ گیا جب نو برس کی عمر میں اُس کی مال کو اور باپ کو لوگوں نے دفن کر دیا تھا تو وہ دونوں قبروں کے درمیان گم سم بٹھ گئی تھی۔ اُس کے آنسو نکل آئے پھر وہ سسکیاں لے لے کے رونے لگی۔

وہ شاید وہیں سو جاتی یا شاید وہاں سے چلی آئی یا جانے کیا کرتی لیکن اُس نے آنسوؤں کے دھندلکے میں دیکھا کہ عورت برقعہ اتار رہی ہے۔ ہجرہ نے آنسو پونچھ کر دیکھا۔ عورت نے برقعہ اتار کر لیٹا اور زمین پر رکھ دیا۔ ہجرہ چونک اٹھی۔ وہ عورت نہیں تھی جس نے برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ ایک آدمی تھا جس نے شلواری قمیض پہن رکھی تھی۔ وہ سر سے ننگا تھا۔

صوبیدار اکبر علی نے پناہ گزین عورت کو چارپائی پر بٹھا دیا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے اچھل کر باہر آجائے گا موم بتی کی تھرتھاتی لومیں اُس نے اس عورت کے



بالوں کو دیکھا۔ اُسے ہجرہ یاد آگئی۔ ہجرہ کے بال بھی اسی طرح جاذبِ نظر تھے۔ ہجرہ کا خیال آتے ہی اُس کا دل بیکارگی بکا پھلکا ہو گیا جیسے اُس کا مسئلہ حل ہو گیا ہو۔

”مجھے ایک ایسی ڈیوٹی پر جانا ہے جو مل نہیں سکتی۔“ اکبر علی نے کہا۔ ”میں تمہیں اپنے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا۔ چلو، میں تمہیں ایک لڑکی کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔ وہاں تمہیں ڈرنیں لگے گا۔ میں ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

اُس نے ٹھیک سوچا تھا۔ ہجرہ کا خیال آتے ہی اُسے یہ سوچ آگئی تھی کہ وہ اس عورت کو اقبال کے والد کے سپرد کر دے گا اور وہ لوگ اسے ہجرہ کے کمرے میں جگہ دے دیں گے۔

”نہیں۔“ عورت بولی۔ ”تم میرے ساتھ رہو۔“

”میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ اکبر علی نے ماری ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں آدھی رات کے بعد آسکوں گا۔“

اُس نے گھڑی دیکھی تو چونک اٹھا۔ گاڑی وزیر آباد کے قریب آرہی تھی۔

”تھوڑی دیر بعد چلے جانا۔“ عورت نے زندگی ہوئی التجا کی۔ ”میں سو جاؤں تو بے شک چلے جانا۔ ذرا دیر بیٹھ جاؤ۔۔۔ میرے قریب بیٹھو۔“ اُس نے سر جھکا لیا۔

اکبر علی گھری سوخ میں کھو گیا۔ اُس نے چونک کر ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ اضطراب اور ذہنی کش مکش اُس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگی۔ اُس نے عورت کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے چہرہ لٹھلی میں تھا، یاس اور ناامیدی کا مرقع بنی بیٹھی تھی۔ موسمِ تہی کی زرد روشنی اُس کے بالوں پر ناچ رہی تھی ان بالوں میں ٹیڑھی مانگ کی سیدھی سپید لکیر اکبر علی کو پریشان کرنے لگی۔ اُس نے سوچا، یہ عورت ظفر وال کی سرحد پر قیامت کی گولا باری سے بچ کر جانے دھول اور مٹی میں کہاں کہاں چھپ چھپ کر پاپیادہ کتنی ہی مسافت طے کر کے آئی ہے۔ جانے کتنے دن بھوک پیاسی بھی رہی ہوگی۔ دل میں بچے اور خاوند کا غم لیے اتنے دنوں سے رو رہی ہوگی۔

اُس نے عورت کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ پھر اس کی جھکی ہلکیوں کو نظر بھر کے دیکھا۔ عورت نے اپنے گال پر انگلیاں پھیلا دیں۔ لمبوتری انگلیوں کا حسن بالوں سے زیادہ مسحور کن تھا۔ اُس کے ہاتھوں، ہونٹوں، ہلکیوں اور رخساروں کی سپیدی مائل کلابی رنگت میں تازگی اور اشتعال انگیز حُسن کا ٹھکانا تھا۔ وہ اُسے دیکھتا رہا۔

دو تین لمحے گزر گئے۔

عورت نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا اور اکبر علی کی طرف دیکھا۔ عورت کی آنکھیں خوف سے کھل گئیں۔ اکبر علی نے دیکھا کہ ان آنکھوں میں جادو کا اثر تھا۔ اس قدر موہنی آنکھیں اُس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

عورت کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں اور ہونٹ لرزنے لگے۔ اُس نے خوفزدہ ہو کر ایک ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ وہی اکبر علی جو ابھی ابھی فرشتہ تھا، اب درندے اور وحشی کے روپ میں اُس کے سامنے کھڑا اُسے چپ چاپ گھور رہا تھا۔ اکبر علی کے ہاتھ میں ریلوور تھا جس کی نالی عورت

کی طرف تھتی۔

عورت پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ہونٹ کپکپاتے مگر کچھ کہ نہ سکے۔ اکبر علی چپ چاپ اُس پر ریلوور تانے اُس کی جادو بھری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ کمرے میں موت کا سا ٹاٹا طاری تھا۔ موسمِ تہی کی لولز نے لگی۔ دیوار پر اکبر علی کا سایہ نیچے بھوت کی طرح ناچ رہا تھا۔

”اٹھو۔“ اکبر علی نے دھیمی مگر قہر آلود آواز میں کہا۔

عورت آہستہ آہستہ اٹھنے لگی اور لڑکھرائی زبان میں بولی۔ ”تم۔۔۔ تم نے۔۔۔ پستول کیوں نکال لیا ہے؟“

اکبر علی چپ چاپ اُس کی طرف بڑھا۔ عورت نے آہستہ سے دونوں ہاتھ اپنی ناف پر رکھ لیے لیکن یوں تیزی سے ہاتھ ہٹا لیے جیسے اُسے کسی نے چونکا دیا ہو۔ اکبر علی کے لیے اتنا سا اشارہ کافی تھا۔ وہ انٹیلی جنس کا صوبیدار تھا۔ اشارے سمجھتا تھا۔

عورت پیچھے ہٹنے لگی لیکن چارپائی نے اُسے پیچھے نہ ہٹنے دیا۔ اکبر علی نے بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ اُس کے ازار بند پر رکھ کر اُسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ عورت نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اکبر علی نے اُسے اسی ہاتھ سے دھکیل کر چارپائی پر چیت گرا دیا اور اُس کے ہاتھوں کو جھٹک کر اُس کی قمیض ناف سے ہٹا دی۔

”بے غیرت!۔“ عورت نے چلا کر کہا۔ ”کافر۔۔۔ مظلوم عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالتے شرم نہیں آتی؟ میں پاکستان کی لٹی پٹی عورت ہوں۔۔۔“

”کرنل گپتا مجھ سے زیادہ جالاک نہیں۔“ اکبر علی نے اُس کے ہاتھوں کو جھٹک کر فاشانہ لہجے میں کہا۔ ”وہ جانتا ہے وزیر آباد میں اُس کا گواہی اور نمبری اکبر علی موجود ہے۔ برافرٹ پر میں اُس کے ساتھ نہ ہوتا تو سالہ ایک رپورٹ ٹھیک سے نہ دے سکتا۔ میں اُسے اٹھا کر نہ لاتا تو آج وہ جالندھر میں کرنل بنا نہ بیٹھا ہوتا۔“

عورت جیسے بے جان ہو گئی ہو۔ اُس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ اکبر علی نے اُس کے ازار بند کو ڈھیلہ کر دیا اور شلوار ذرا سی سرکادی۔ عورت کی کمر کے گرد ناف سے نیچے کپڑے کی ٹیٹی بندھی ہوئی تھی۔ اکبر علی نے ٹیٹی کھول دی۔ اُس کے ساتھ ۳۲۔ بور کا میگزین والا پستول بندھا ہوا تھا جو ریلوور سے چھوٹا اور چپٹا ہوتا ہے۔

عورت بے حس لیٹی رہی۔ اب اُس کے چہرے پر نہ خوف تھا نہ مظلومیت کا کوئی تاثر بلکہ ہونٹوں پر تبسم تھا جس نے اُس کے حُسن کی دل کشی کو اور زیادہ عریاں کر دیا تھا۔

”گاڑی کو کس پوائنٹ پر سبوتاژ کیا جائے گا؟“ اکبر علی نے ذرا پیچھے ہٹ کر پوچھا۔

”کون سی گاڑی؟“ عورت نے حیرت سے پوچھا اور شلوار اوپر کرنے کی بجائے اور پیچھے

سرکادی۔

”فوراً بولو۔ وقت نہیں۔“ اکبر علی نے گرج کر کہا مگر اس قدر حسین اور جوان عورت کی عریانی نے اُس کی گرج میں لرزہ پیدا کر دیا۔



اُسے یوں لگا جیسے اسے اپنے خلاف خونریز جنگ لڑنی پڑے گی۔ عورت کا جسم تروتازہ تھا بھکن کے گرد کے مظلومیت کے کوئی آثار نہیں تھے۔

”تم جیت گئے۔ عورت نے مسکرا کر کہا۔“ میں جاسوس ہوں میں سمجھی تھی کہ پاکستان کے لوگ جذبات سے اندھے ہو گئے ہیں۔ میں تمھاری اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ تم بھی ایک بہن کی بد حالی سے دیوانے ہو گئے تھے مگر...“

”میں پوچھ رہا ہوں ہماری گاڑی کو کس پوائنٹ پر تباہ کیا جائے گا؟“ اکبر علی ایک بار پھر گرجا۔ ”میں جاسوس ضرور ہوں لیکن گاڑی کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔“ عورت نے مسکرا کر کہا اس کی مسکراہٹ میں دعوت گناہ تھی اور یہ مسکراہٹ طلسماتی تھی۔ اُس نے کہا ”میرے پاس بیٹھ جاؤ، سب کچھ بتا دوں گی۔“ وہ لیٹے لیٹے ذرا پر سے سرک گئی۔

یہ ایسی اشتعال انگیز حرکت تھی کہ اکبر علی کی مردانگی انکڑا تیاں لینے لگی۔ اُس نے اپنے خلاف جدوجہد کر کے پاکستانی صوبیدار کے پاؤں اکھڑنے نہ دیتے۔

”سنو کا فریڈ کی... وہ تجھ سے سی سی سی نہیں پڑا اور بولا۔“ جس ملک کو تمھارے ملک کی دس لاکھ فوج اور ساڑھے چار سو طیارے اور ایک ہزار فوجیں فتح نہیں کر سکے اُسے ہندوستان کی ایک عورت تو کبھی جیت نہ سکے گی۔ کہتا ہوں یہی سبب ہے کہ جہاز چورہری کو شاید معلوم نہیں کہ پاک آرمی کا صوبیدار انڈین آرمی کے کرنل سے زیادہ مشکل سمجھتا ہے۔“ اُس نے گھڑی دیکھی اور اندازہ کیا کہ گاڑی چناب کے پل سے کتنی دُور ہے۔ وہ چلا اٹھا۔ ”گاڑی کو کہاں تباہ کیا جائے گا؟“ اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا۔ ”میں تمھیں کوئی نہیں ماروں گا کافر کیچی! میں ابھی دس بارہ چرسیوں، افسیوں اور بھنگیوں کو بلاؤں تمھیں اُن کے حوالے کر دوں گا۔ صبح تک تم خارش سے مرنے ہوئی گتیا کی طرح تڑپ رہی ہو گی، تم پر کوئی رحم نہیں کرے گا۔ میں تمھیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی شلوار اُس کے پاؤں میں گر پڑی۔ ”میں سچ کہہ رہی ہوں سب کچھ بتا دوں گی۔“ اُس نے فحش سی قسم کی مسکراہٹ سے کہا۔ ”تم خود دہیں ہو، خدا کے واسطے مجھے وحشیوں کے حوالے نہ کرنا۔ میں اپنے آپ کو تمھارے حوالے کرتی ہوں... آؤ بیٹھو تو سہی۔“ وہ گناہ کا بنتا مسکراتا پیکر بن گئی۔

اکبر علی کا دل بلند آواز سے دھڑکنے لگا۔ عورت کا یہ وار کام کرنے لگا۔ اکبر علی کی بیوی کو مر سے اٹھارہ سال گزر گئے تھے وہ فرشتہ نہیں تھا، انگریزوں کے دور کا فوجی تھا۔ اب تو وہ اُس عمر کو پہنچ گیا تھا جس عمر کے آدمی کی طرف کوئی برصورت اور زیادہ عمر کی عورت بھی نہیں دیکھتی۔ اُس نے ہاجرہ کو کھمر لانے کے بڑے جتن کیے تھے۔ ہاجرہ نے اُس کی مینڈی حرام کر دی تھیں مگر اُس کے ہاتھ نہ آئی تھی۔ آج کی چپ چاپ رات اس قدر حسین اور ہندو لڑکی عریاں ہو کر اُسے مسکرا کر بلا رہی تھی۔ اُس کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ پاک آرمی کی افسلی جنس کے صوبیدار پر یوں نشہ سا طاری ہونے لگا جیسے اُس کی ناک پر کلوروفارم سے آلودہ زہال رکھ دیا گیا ہو۔

”یا خداوند کریم!۔“ اُس نے سر کو زور سے جھٹک دیا اور دل ہی دل میں دعا کی۔ ”یہ عورت پہلے کی طرح ڈری ہوئی پاکستانی عورت بن جائے اور رو کر مجھ سے پناہ مانگے۔“ اُس نے اپنے وجود میں جھلسا دینے والی تپش محسوس کی۔ الاؤ بھڑک اٹھا۔ اس کے سامنے پاکستانی نہیں ہندوستان کی ایک جاسوس عورت کھڑی تھی... نیم عریاں! ”سوچتے کیا ہو؟“ عورت نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ بڑھا کر اس کی کلاری تھام لی۔ ”مرد سوچا تو نہیں کرتے۔ پندرہ بیس منٹ رک جاؤ، بڑی دلچسپ باتیں سناؤں گی۔“

انیمیشن سے لہری گاڑی چناب سے ذرا ہی دُور رہ گئی تھی۔ ڈرائیور نے گھڑی دیکھی۔ سامنے چاندنی رات میں چمکتی پٹری کو دیکھا پھر رفتار کی سونی دیکھی۔ پھر اُس نے فائر مین کی طرف دیکھا۔ فائر مین نے سر سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے رفتار بڑھا دی اور ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ خدا سے گاڑی کی سلامتی مانگ رہا تھا۔ گاڑی کے پیچھے پٹری سے اٹھنے لگے۔ اس پٹری پر اس قدر تیز گاڑی کبھی نہیں چلی تھی نہ یہ پٹری اتنی رفتار کے قابل تھی۔ ڈرائیور کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اسے لاہور کتنی جلدی اور کیوں اتنی جلدی پہنچنا ہے لیکن اُسے کون بتاتا کہ پندرہ بیس منٹ تک اُس کا انجن ڈائنامیٹ کے اوپر سے گزر رہا ہو گا اور....

اور وہ حسین عورت اکبر علی سے کہہ رہی تھی۔ ”پندرہ بیس منٹ رک جاؤ، بڑی دلچسپ باتیں سناؤں گی۔ میں اقبال جرم کر چکی ہوں میں جاسوس ہوں۔“ وہ اُسے دعوت گناہ دے رہی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اکبر علی آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھا۔ اس کے ریوالتور کی نالی عورت کی طرف تھی۔ ریوالتور پر اُس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط تھی لیکن عورت کی طرف بڑھتے ہوئے اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اور اُس کے وجود میں جو آگ بھڑکی تھی وہ بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ عورت نے شکار مار لیا تھا۔

اکبر علی کے ہاتھ میں جو ریوالتور تھا، اُس کی نالی انجینیئر عورت کی طرف اور اکبر علی کی انگلی ٹریگر پر تھی جب وہ عورت کے قریب پہنچا تو اُس کی سانس یوں پھول چکی تھی جیسے پہاڑی پر چڑھ رہا ہو۔ اُس کی انگلی ٹریگر کارڈ میں رہی اور ریوالتور پر اُس کی گرفت چھوٹ گئی۔ ریوالتور اس کی انگلی میں لٹک گیا۔ عورت کی مسکراہٹ اور زیادہ زہرین ہو گئی۔

عین اُس وقت گاڑی کے محافظ دو طیارے نیچے پرواز کرتے گزر گئے۔ ان کی بلندی اس قدر کم تھی کہ کمرے کی چھت چھن چھن کر رہ گئی۔ اب کے یہ سیبر طیارے نہیں بلکہ دو الیف ام ۱۰ سٹار فائٹر تھے۔ ان کی بجلی جیسی گرج نے وزیر آباد کو فیادوں تک بلا ڈالا۔ اکبر علی کا سینہ اس کی چھت کی طرح لرزا۔ اُس نے عورت کی طرف بڑی آہستگی سے آخری قدم بڑھایا تھا۔ یہ قدم صوبیدار کا نہیں ایک مرد کا تھا جو حسن و عریانی کی طرف کھینچا جا رہا تھا لیکن اپنے طیاروں کی دل ہلا دینے والی گرج سن کر آخری قدم آگے کی بجائے پیچھے آگیا۔ ریوالتور جو نیم عریاں حسن سے مرعوب ہو کر انگلی میں لٹک



گیا تھا، اپنے آپ اچھل کر اکبر علی کے ہاتھ کی گرفت میں آگیا اور مالی عورت کی طرف ہو گئی۔  
اکبر علی کا بایاں ہاتھ بجلی کی طرح لپکا اور عورت کے دکھش بالوں کو مٹھی میں لے کر اس قدر زور سے جھٹکا دیا کہ عورت چیخ اٹھی۔ اکبر علی نے دانت پیس کر عورت کو دوبرا کر دیا اور ریلوور کی مالی اس کی دو انگلیوں کے درمیان رکھ کر انگلیوں کو اپنے ہاتھ کے نیچے میں جکڑا اور زور سے دبایا۔ عورت کی انگلیوں کی ہڈیاں جیسے ٹوٹنے لگی ہوں۔ اس کے بالوں پر اکبر علی کے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ اس نے اسے نیچے کی طرف اس قدر دوبرا کر دیا کہ عورت کی ریڑھ کی ہڈی کے جوڑ چٹختے لگے۔

عورت تڑپنے لگی۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے اس طرح ٹپوٹ آتے جیسے کسی نے پانی کا چھینٹا مار دیا ہو۔ اس کے سپیدی مائل گلابی گال سرخ ہو گئے۔ نیشی آنکھیں خون آلود ہو گئیں۔ اس کے دانت کھٹکنا لگے۔ اکبر علی بھول گیا تھا کہ وہ عورت ہے۔ اس نے اس کے بالوں کو ایک اور جھٹکا دیا اور انگلیوں کو اور زیادہ دبایا۔ عورت کی چپٹیں درد کے سسکیاں بن گئیں اور اس کا جسم کانپنے لگا۔

”گاڑی کو کس پوائنٹ پر سبوتا کر گیا جائے گا؟“ اکبر علی نے غصے سے چلا کر پوچھا اور گرنل کپتا کو ننگی گالی دے کر کہا۔ ”اس روز اکبر علی اپنے ریلوور سے خودکشی کر لے گا جس روز کپتا پاکستان کی گاڑی کو تباہ کرے گا۔ فوراً بولو۔۔۔ میں ابھی آدمیوں کو بلا کر تمہیں ان کے ساتھ اس کمرے میں بند کر دوں گا۔ فوراً بولو۔“ اس نے اس کی انگلیوں کو اور زیادہ دبایا۔

”ڈیڑھ کلومیٹر“ عورت نے کرنباک سسکی لیتے ہوئے کہا۔ ”میری انگلیاں ٹوٹ جائیں گی۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔“

”کس طرف؟“ اکبر علی نے اس کی انگلیوں سے ریلوور کی مالی نکالے بغیر پوچھا۔ ”کہاں سے ڈیڑھ کلومیٹر؟“

”وزیر آباد ٹیشن کے آؤٹ سگنل سے“ عورت نے کرنباک آواز میں کہا۔ ”لابو کی طرف؟“

”کوڈ بولو۔“ اکبر علی نے گرفت ڈھیلی کر کے پوچھا۔ ”کوڈ۔۔۔ فوراً۔“

”رانا۔“ عورت نے ہچکی لی۔

”کہاں کا؟“

”جائیدھر کا؟“

”اور یہاں کا؟“

”راجا۔“

”ماقم بم رکھا ہے یا ڈائنامیٹ؟“ اکبر علی نے اس کے بالوں کو چھوڑ کر اور اس کی انگلیوں سے ریلوور کی مالی نکال کر پوچھا۔

”ڈائنامیٹ۔“ عورت نے اپنی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ سے دباتے ہوئے مرلی سی آواز میں جواب دیا۔

صوبیدار اکبر علی جانتا تھا کہ ڈائنامیٹ جو ریل گاڑیوں کے نیچے رکھا جاتا ہے وہ پہاڑوں کا جگر

چاک کر دیتا ہے۔ اتنے وزنی ریلوے انجن کو ہوا میں کھونے کی طرح اچھال دیتا ہے۔ اسے خیال آیا کہ

ریل گاڑی تباہ ہو گئی تو اس کے ڈبوں میں توپوں کے جوگو لے بھرے ہوئے ہیں وہ پھٹیں گے۔ ہو سکتا ہے ان گولوں کے ٹکڑے اڑ کر وزیر آباد جا پہنچیں۔

”کیا تم یہاں صرف مجھے پھانسنے آئی تھیں؟“ اکبر علی نے اس سے پوچھا۔  
”اور کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ عورت نے کہا۔ ”میں تمہیں یہ بتا دیتی ہوں کہ ایک صوبیدار اتنی اہم شخصیت نہیں ہوتا کہ مجھ جیسی قیمتی عورت اس کے پیچھے ڈال دی جائے۔ مجھے لاہور سے بلایا گیا تھا۔ میرا کام کچھ اور تھا۔ یہاں آکر مجھے یہ کام دے دیا گیا۔“

”کیا تم مجھے اپنا پورا راز نہیں دو گی؟“  
”نہیں!۔“ عورت نے کہا۔ ”جو بتانا تھا وہ بتا دیا ہے۔۔۔ اور سنو! میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گی۔ میری بات غور سے سنو۔ تمہیں اتنی دولت دلاؤں گی جو تمہاری سات پشتوں کے لیے بہت ہوگی۔ بیوی چاہیے تو مجھ سے زیادہ خوبصورت بیوی ملے گی۔“

”میں ہندوستان کا جاسوس بن جاؤں؟“ اکبر علی نے پوچھا۔  
”اگر جاسوس بن جاؤ تو نوابوں جیسی عیش کرو گے۔“ عورت نے کہا۔ ”اس وقت صرف اتنا کام کرو کہ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں صبح تک تمہارے ساتھ رہوں گی اور نقد رقم الگ ڈالوں گی۔“

”اوہ!“ اکبر علی جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ ”گاڑی۔۔۔ میں اس گاڑی کی قیمت نہیں لوں گا۔“  
اس نے بڑی تیزی سے اس چارپائی کی ادوائن کھولی جس پر یہ بندہ عورت بیٹھی ہوئی تھی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ اکبر علی جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے عورت کے ہاتھ ادوائن سے باندھ دیئے۔ وہ اکبر علی کو لالچ دے رہی تھی۔ اکبر علی نے ایک کپڑا لاکر عورت کے منہ میں ٹھونس دیا پھر اس کے پاؤں اسی ادوائن سے باندھ دیئے اور اسے اس چارپائی پر پھینک دیا جس سے اس نے ادوائن نکالی تھی۔

”واپس آکر بات کروں گا۔“ اکبر علی نے کہا اور موم بتی کو پھونک مار کر باہر کو دوڑ پڑا۔  
”میرے خدا! اپنے نام کی لاج رکھنا۔ مجھے گاڑی سے پہلے ڈائنامیٹ تک پہنچا دینا۔“ وہ دوڑتا اور خدا کو پکارتا جا رہا تھا۔

کینٹن طارق کو اطلاع دینے کا وقت نہیں تھا۔ ریل گاڑی چناب کے پل پر آگئی تھی۔ رات کی خاموشی میں اکبر علی کو گاڑی کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ ٹیشن کے دونوں سگنل، آؤٹ اور سٹارٹ ڈاؤن ہو گئے تھے۔ ٹیشن کے عملے کا ایک آدمی ہری بتی ہاتھ میں لے کر لائن سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا کہ ڈرائیور کو یقین ہو جائے کہ لائن کلیئر ہے۔

ماجرہ نے جب برقہ پوش کو برقہ اتار کر پرے پھینکتے دیکھا کہ وہ عورت نہیں آدمی ہے تو وہ آنسو پونچھ کر بیدار ہو گئی۔ افضال اور وہ آدمی ریلوے لائن تک گئے۔ لائن کی دوسری طرف سے ایک اور آدمی آگیا۔ تینوں لائن پر جھک گئے۔ ماجرہ اپنے آپ میں آچکی تھی لیکن اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ



وہ سب ریلوے لائن پر کیا کر رہے ہیں۔

وہ انہیں دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک رات کے سکوت میں ہیبت ناک گڑگڑاہٹ ابھری رات لرز نے لگی۔ ایمونیشن اور جنگی سامان سے لدی ہوئی مال گاڑی وزیر آباد سے ذرا ہی پرے چنا بکے پل سے گزر رہی تھی۔ پھر انجن کی تیز چھک چھک سنائی دینے لگی۔

ہجرہ کا روال روال بیدار ہو گیا۔ اُس کے منہ سے گھبراتی ہوئی سی سرگوشی نکلی۔ ”کوئی گاڑی آرہی ہے۔“ اُس کے شل جسم اور مادوت دماغ میں از خود تازگی آگئی اور اُس کی ہاری ہوئی قوتیں آپ ہی آپ جاگ اٹھیں۔

اُسے اقبال کی آواز سنائی دی۔ ”دشمن کے جاسوس ریلوے لائن پر ہم رکھ دیتے ہیں۔“

پھر اکبر علی کی آواز۔ ”افضال ہندوستان کا جاسوس ہے۔“

ہاجرہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دیکھا، افضال ریلوے لائن پر بیٹھا کچھ کر رہا تھا۔ اُس کے ساتھی اُس کے قریب پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ ہاجرہ کی نبضیں تیز ہو گئیں لیکن اُسے معلوم نہ تھا وہ کیا کرے۔ اُس نے سوچا کہ وہ بھاگ کر افضال سے کہے، دیکھو افضال جی! مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ مگر اُس کی گاڑی کو تباہ نہ کرو۔ لیکن اُس نے راہ فرار ڈھونڈ لی اور اپنے آپ سے کہا۔ ”نہیں، افضال بہت پیارا آدمی ہے، وہ جاسوس نہیں ہو سکتا۔“ مگر اس خیال نے اُسے ذرہ بھر سکون نہ دیا۔ کوئی اجنبی سی قوت اُسے اپنے تابع کر چکی تھی۔

اُس نے اپنے آپ کو فریب دینے کی بہت کوشش کی لیکن اُس کے سامنے اقبال کی اندھی آنکھیں آگئیں۔ یہ دو آنکھیں دو لاکھ آنکھیں بن گئیں۔ پاک فوج کے جیلے جانبازوں کی اندھی آنکھیں۔ وہ سپاہی جوڑکوں میں وزیر آباد شہر سے ”یاعلیٰ“ اور ”پاکستان زندہ باد“ کے نعرے لگاتے یا کوٹ اور لاہور کی طرف گزرتے رہتے تھے اُسے اندھوں اور اپاہجوں کے جلوس کی صورت واپس آتے نظر آتے۔ دو لاکھ ماتوں کے شہزادے، اقبال کی طرح بھرپور جوان اور گھرو۔ ہاجرہ کے سینے میں ہم پھٹا اور وہ ریلوے لائن کی طرف چل پڑی۔ اُسے بائیں طرف سے، درختوں کے جھنڈ میں ایک اور آدمی تیز قدم آتا نظر آیا۔ ہاجرہ رُک گئی۔

طیارے آگے جا کر پھر پیچھے آتے۔ ریل گاڑی وزیر آباد ریلوے سٹیشن میں داخل ہوتی تو اُسے ذرا آہستہ ہو جانا چاہیے تھا۔ گاڑی کو پٹریاں بدلنی تھیں۔ تیز رفتاری سے گاڑی پٹری سے اتر سکتی تھی لیکن ڈرائیور نے ذرہ بھر پرواہ نہ کی۔ اُس نے سبزقبایاں دیکھیں اور اُسی رفتار پر رن تھرو ہو گیا۔ گاڑی کے پیچوں نے ایک سے دوسری پٹری پر ہوتے ہوئے دھماکوں جیسا شو بلند کیا اور گاڑی سٹیشن سے نکل گئی۔

ریلوے لائن سے ڈیڑھ پونے دو میل دور دو ملنگوں نے ڈینمو ایکلوڈر سے ملاتے ہوئے تار کو آخری بار چیک کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ گاڑی وزیر آباد ریلوے سٹیشن سے رن تھرو ہو گئی ہے۔ تباہی کے مقام تک پہنچنے میں چند منٹوں کا عرصہ رہ گیا تھا۔ ڈائنامیٹ لائن کے سیلپر کے نیچے رکھا تھا۔ افضال نے دونوں تار ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈیوٹیٹر سے بلا دیتے اور ڈیوٹیٹر کو ڈائنامیٹ میں صحیح جگہ پر رکھ دیا۔ اب ملنگوں کے بٹن دمانے کا، درخت، افضال اور اس

کے ساتھی ریلوے لائن سے پرے اتر گئے۔ انہیں اب ڈائنامیٹ کی زد سے دور ہو جانا تھا۔

گاڑی وزیر آباد ریلوے سٹیشن سے نکل کر آؤٹر گنگل سے بھی آگے آگئی تھی جو آدمی فختوں کے جھنڈ میں ہاجرہ کو نظر آیا تھا، اسے ہاجرہ نظر نہ آئی۔ وہ آدمی تیزی سے ہاجرہ کے قریب سے گزر گیا۔ ہاجرہ نے اُسے پہچان لیا۔ وہ صوبیدار اکبر علی تھا جو دوڑتا ہوا ریلوے لائن پر جا چڑھا اور جھک کر لائن کو دیکھنے لگا۔ ہاجرہ بھی اُس کی طرف دوڑ پڑی۔

رات کا سکوت جو تیزی سے آتی گاڑی کے شور سے لرز رہا تھا ریلوے لائن کے دھماکے سے دہل گیا۔ اکبر علی یک سخت سیدھا ہوا۔ اُس نے ناف کے قریب ہاتھ رکھا، دُہرا ہوا، اُس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا کر گر پڑا۔ جاسوسوں کے ریلوے کی گولی اُس کے کولھے سے ٹانگ کے جوڑ کو کاٹتی پار ہو گئی تھی۔ ہاجرہ دوڑتی اُس تک پہنچی۔ اس سیدھی سادی بلکہ بھول کی کوئی کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اُسے کیا کرنا چاہیے۔ اُسے یہ احساس ضرور تھا کہ کچھ ہو رہا ہے اور اُسے کچھ کرنا چاہیے۔

گاڑی ایک میل سے بھی کم دور رہ گئی تھی۔ ایک منٹ کا عرصہ جو بڑی تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ دُور پر سے درخت تلے ایک ملنگ نے ڈینمو ایکلوڈر کے بٹن پر انگلی رکھ دی اور چھوٹا سا ایک وانرلیس سیٹ کان سے لگایا۔ وہ اشارے کا منتظر تھا۔ پاک فوج کی فتح و شکست کا دارومدار ایک ہروپتے کی انگلی کی جنبش پر تھا۔

گاڑی دو فرلانگ تک آگئی۔ انجن کی تباہی ہوئی تھی اور ڈرائیور رفتار کے میٹر کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے گمان تک نہ تھا کہ وہ موت سے ایک لمحے کے فاصلے پر پہنچ گیا ہے اور یہ فاصلہ اُس کی سالنوں سے بھی زیادہ تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ چند سانس، چند ثانیے! جالندھر میں کرنل گیتا بے تابی سے گاڑی کی تباہی کی رپورٹ کا انتظار کر رہا تھا۔

لائن سیدھی تھی۔ ڈرائیور نے انجن کی رفتار اور تیز کردی اور اپنی گھڑی کی سوئیوں پہ نظریں جما کر حساب کرنے لگا کہ وہ گاڑی کو کتنی جلدی لاہور پہنچا سکتا ہے۔ تمام محاذوں پر قیامت مچا رہی۔ ریئر ایٹلان ایمونیشن اور پٹرول کا انتظار کر رہا تھا۔ انڈین آرمی کی ٹینک رجمنٹ نے ڈویژنل آرٹلری کے کور میں کھیم کرن کے مورچوں پر فیصلہ کن حملہ کر دیا تھا۔ فاتر بندی میں تین روز باقی تھے اور جنرل چوہدری پاک فوج سے کم از کم کھیم کرن واپس لینے کے لیے پگل ہوا جا رہا تھا۔

ہاجرہ اکبر علی تک پہنچی تو اکبر علی نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُسے نہ سکا۔ ہاجرہ چلا کر بولی۔ ”اکبر علی!“

گاڑی اور قریب آگئی۔ اکبر علی کا معدود جسم زمین کا لرزہ محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے ہاجرہ کی آواز پر گھوم کے دیکھا۔



گاڑی کا انجن اکبر علی سے ایک قدم دُور تھا اور وہ ڈائنامیٹ سے تار الگ کروانے میں اس قدر محو تھا کہ اسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں تھی۔ اُدھر انجن اُس کے اوپر آن پہنچا اُدھر وہ ریلوے لائن کے اندر کی طرف ہو گیا اور پیٹ کے بل ہو کر سرزمین سے لگا دیا۔ گاڑی آدھے منٹ سے بھی کم عرصے میں اُس کے اوپر سے گزر گئی۔ ہاجرہ کو جس آدمی نے پکڑا اور مگرایا تھا، وہ بھاگ گیا۔

جالندھر میں کمرل گپتا گاڑی کی تباہی کی اطلاع کے انتظار میں بے چین تھا۔ وہ وائس پریس سے بار بار پوچھتا تھا کہ اطلاع آتی ہے یا نہیں۔ آخر اُسے اطلاع مل گئی لیکن اُس وقت ملی جب گاڑی خیریت سے لاہور پہنچ گئی تھی۔ پاک فوج کے سرفروش ٹرک ڈرائیور لاہور ریلوے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ بہت سے پرائیویٹ ٹرک ڈرائیور بھی اپنے ٹرکوں سمیت موجود تھے۔ ایمونیشن گاڑی سے اتار کر ٹرکوں میں لادنے کے لیے فوجیوں کے علاوہ ریلوے اسٹیشن کے تمام قلی آن پہنچے۔ رات ہی رات لاہور کھیم کرن سیکڑوں میں ایمونیشن اور پٹرول پہنچا دیا گیا۔ توپیں اور ٹینک کھیم کرن کی طرف روانہ ہو گئے۔

پولیس کانسٹیبل اُس وقت دھونکل کی طرف سے واپس آ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ مال گاڑی گزر گئی ہے تو وہ ریلوے لائن سے ہٹ کر تھانے پہنچ گئے۔ ہاجرہ لائن کے قریب بے ہوش پڑی تھی۔ ایک تو اُس کا خون زیادہ نکل گیا تھا، دوسرے یہ کہ جب اُس آدمی کے دھکے سے وہ گری تھی اُسے ماتھے پر شدید چوٹ آئی تھی۔ ماتھا پتھروں پر لگا تھا۔ پہلے تو وہ ہوش میں رہی پھر ہوش کھو بیٹھی۔

اکبر علی نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن نہ اُٹھ سکا۔ اُس نے ہاجرہ کو آوازیں دیں، مگر جواب نہ ملا۔ وہ رینگنے لگا۔ اُس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ ہاجرہ تک پہنچنے کے لیے اُسے بیس کچیس گز رینگنا پڑا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ٹانگ جسم سے الگ ہو گئی ہو لیکن اُس نے اپنے زخم کو دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ ہاجرہ کے پاس بیٹھ گیا۔

”ہاجو!“ اُس نے ہاجرہ کو بلایا پھر بلا کر بلایا۔ ”ہاجو بیٹی!“

ہاجرہ بے ہوش تھی۔

اکبر علی نے دیکھا کہ ہاجرہ کی پیشانی، سے خون بہہ رہا تھا۔ سیبیت ناک زخم بازو کا تھا جہاں سے ریلوور کی گولی پار ہو گئی تھی۔ اس زخم کی راہ اس کے جسم کا سارا خون بہہ گیا تھا۔ ڈائنامیٹ کا تار ابھی تک ہاجرہ کے دانتوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اکبر علی نے تار اُس کے دانتوں سے نکالا۔ ذرا پر سے افصال کی لاش پڑی تھی۔

اکبر علی نے سوچا کہ زور زور سے پکارے، شاید کوئی مدد کے لیے آن پہنچے، لیکن وہ

”کون؟ ہاجرہ؟“ اُس نے کہا ”تم بھی کافروں کے ساتھ آتی ہو بے غیرت!“ اُس نے پہلو سے ریلوور نکالنے کی کوشش کی تو رینگ کر پیٹری کے اوپر آ گیا۔ گاڑی اڑ رہی تھی۔ غراتی پھنکارتی سر پر آ پہنچی۔

”میں کسی کافر کے ساتھ نہیں آتی“ ہاجرہ نے اکبر علی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا اور اُسے بازو سے گھسنے لگی۔ سخت گہراتے ہوئے لمبے میں بولی۔ ”اُدھر ہو جاؤ اکبر! گاڑی آرہی ہے۔ کچلے جاؤ گے۔“

”ہاجرہ!“ اکبر علی چلایا۔ گاڑی کے شور سے آواز سنانی نہ دیتی تھی۔ چلا کر بولنا پڑتا تھا۔ اکبر علی نے کہا ”ہاجرہ! اُدھر دیکھو۔ اُدھر آگے کوئی تار ہوگی۔ کوئی رسی ہوگی، اسے کھینچ لو.... جلدی، ہاجرہ، جلدی،.... کوئی تار یا رسی.... میں اُٹھ نہیں سکتا۔ گاڑی آرہی ہے“ اُس نے ریلوور نکال لیا۔

ملنگ کی انگلی بن دبانے کو تیار تھی۔ اُدھر ہاجرہ اکبر علی کے اشارے پر اُٹھ دوڑی گاڑی آن پہنچی.... دس یکنڈ.... آٹھ یکنڈ.... چھ یکنڈ! ایک اور گولی چلی جو ہاجرہ کے دائیں بازو میں لگی۔ ہاجرہ کی چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھرائی اور گر پڑی۔

”ہاجرہ!“ اُسے اکبر علی کی لاکار سنانی دی۔ ”مرنے سے پہلے تار کھینچ لینا!“ ہاجرہ گر کر اُٹھی۔ جاسوس کی گولی اُسے جان سے نہ مار سکی۔ ایک اور گولی چلی جو خطا گئی۔ ہاجرہ لائن کو دیکھتی آگے چلی گئی۔ چاندنی میں زمین نظر آرہی تھی۔

ایک آدمی پیچھے سے دوڑتا آیا اور ہاجرہ کو دبوچ لیا لیکن وہ اس قدر تیزی سے آیا تھا کہ سنبھل نہ سکا اور ہاجرہ سمیت آگے کو گر پڑا۔ ہاجرہ اس کے پیچھے تھی۔ اُس کا ایک بازو ریلوور کی گولی نے معذور کر دیا تھا۔ اس آدمی نے اُسے دبوچ بھی رکھا تھا۔ اُدھر سے افصال دوڑتا ریلوے لائن پر چڑھا۔ اُدھر سے اکبر علی کا ریلوور چلا۔ گولی افصال کی پیشانی میں لگی اور کھوپڑی سے پار ہو گئی۔ افصال پیچھے کی طرف گرا، پھر اُٹھ نہ سکا۔ اکبر علی نے پیٹ کے بل رینگنے کی کوشش کی لیکن اُسے گولی ایسی جگہ لگی تھی کہ وہ رینگ بھی نہیں سکتا تھا۔

ہاجرہ اس آدمی کے پیچھے منہ کے بل گری تھی۔ اُس کی نظر پڑ گئی۔ ایک تار اُس کے منہ کے پیچھے تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اسی تار کے متعلق اکبر علی نے کہا تھا یا وہ کوئی اور تار تھا۔ اُس نے اسی تار کو دانتوں میں جکڑ کر جھٹکا دیا۔ اُس آدمی نے جو ہاجرہ کے اوپر تھا، ہاجرہ کو اٹھا کر پٹخنی دی۔ اُدھر ملنگ نے وینو یا پیلو ڈر کا بٹن دبا دیا لیکن ہاجرہ نے تار کو دانتوں سے کھینچ کر ڈائنامیٹ سے الگ کر دیا تھا۔ تار ابھی تک ہاجرہ کے منہ میں تھا۔ ڈائنامیٹ کی جگہ صرف ڈیوٹیٹر بیٹھا۔ یہ ایک شرارہ تھا جو چمک کر بجھ گیا۔ ہاجرہ خوش قسمت تھی کہ ڈیوٹیٹر دُور تھا ورنہ اس کا سر اور منہ اڑ جاتے۔ اُسے جیسے محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اُس کے بازو میں گولی لگی ہے۔ ہڈی نیچ گئی تھی۔ گولی پھٹے سے گزری تھی اور خون تیزی سے نکل رہا تھا۔



رکھا ہوا ہے۔ اُس نے دیکھا اکبر علی اور ہاجرہ کی بنھیں مری مری چال چل رہی تھیں اور افضال سرچکا تھا۔ پولیس دونوں کو اور افضال کی لاش کو ہسپتال اٹھالے گئی۔

کمیشن طارق کو اطلاع دی گئی۔ وہ دوڑتا ہسپتال پہنچا۔ وہاں سے تھانے جا کر اُس نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو فون کیا۔ دو گھنٹے تک ملٹری پولیس کے دو افسر پہنچ گئے۔ اکبر علی اور ہاجرہ کو خون دیا جا رہا تھا، لیکن وہ ابھی تک بے ہوش تھے۔ تھانیدار کی نشاندہی پر ملٹری پولیس کے افسر ریلوے لائن کے قریب اُس مقام پر پہنچے جہاں سے اکبر علی اور ہاجرہ کو اٹھایا گیا تھا۔ انہوں نے ریلوے لائن کے قریب ڈائنامیٹ کا تار دیکھا۔ وہ ساری بات سمجھ گئے اور لائن کو دیکھنے لگے۔ ایک جگہ انہیں سیلپر کے تینچے ڈائنامیٹ کا سلیب پڑا مل گیا۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

دونوں افسر تار کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن سے دُور تک چلے گئے۔ وہاں درختوں کا جھنڈ تھا اور چھوٹا سا ایک گڑھا اور پاؤں کے نشانات تھے۔ تھانے دار نے کھیا نا سا ہو کے کہا ”میں شرمندہ ہوں کہ یہ جاسوس میرے علاقے میں موجود تھے۔“

”تھے نہیں، موجود ہیں“ — ایک افسر نے کہا — ”ذرا بیدار رہیں۔“ دوسرے روز اکبر علی اور ہاجرہ ہوش میں آ گئے۔ ڈاکٹروں نے اُن کے جسموں کا خون پورا کر دیا تھا۔

”میرے گھر میں جا کے دیکھو“ — اکبر علی نے ہوش میں آتے ہی کہا — ”وہاں چار پانی کے ساتھ ایک عورت ریلوں سے بندھی ہوئی ہوگی۔ اُسے فوراً ملٹری پولیس کے حوالے کر دو۔ میں اسی کی نشاندہی پر ریلوے لائن پر پہنچا تھا جہاں ڈائنامیٹ رکھا تھا۔ وہ عورت انڈیا کی جاسوس ہے۔“ پھر اُس نے ہاجرہ کے کارنامے کی تفصیل سنائی۔

ہاجرہ نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ کس طرح افضال کے پیچھے ریلوے لائن تک پہنچی تھی۔ افضال کی لاش بھی ہسپتال لائی گئی تھی۔ سب نے دیکھا کہ وہ مسلمان نہیں تھا۔ ہاجرہ کے متعلق اُس کے گھر والوں کو صبح کے وقت پتہ چل گیا تھا کہ وہ ہسپتال میں پڑی ہے۔ اقبال کے ماں باپ ہسپتال پہنچے۔

جب ہاجرہ ہسپتال سے اچھی بھلی ہو کے نکلی تو جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اقبال صحت یاب ہو کے گھر آ گیا تھا اور وہ بدستور بینائی سے محروم تھا۔ وہ رہ رہ کر ہاجرہ کو اپنے پاس بلاتا تھا اور وہ اس کے پاس بیٹھی رہتی تھی لیکن گرم صم۔ اُس کی ذہنی حالت بے ٹھکانہ تھی۔ وہ تو اس فائنل حقیقت سے ہی بے نیاز تھی کہ جس گاڑی کو اُس نے تباہی سے بچایا ہے اُس نے بھارتیوں کے فیصلہ کن حملوں کو کس بڑی طرح ناکام بنایا ہے۔ وہ کھوتی کھوتی سی رہنے لگی۔ عمر میں صرف ایک انسان ملا تھا جس نے اُسے کھویا ہوا پیار دیا تھا مگر وہ بھی دشمن کا جاسوس نکلا۔

اس خیال سے چُپ رہا کہ بھارتی جاسوس کہیں قریب ہی نہ ہوں۔ اُس نے ریلوے کال لیا۔ وہ ہاجرہ کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے ہاجرہ کو اس ارادے سے بازوؤں پر اٹھا لیا کہ اسے سڑک تک لے جاسکے لیکن وہ اٹھ تو سکتا نہیں تھا، اُس نے بیٹھے بیٹھے سر کھنے کی کوشش کی مگر کولے کے گھرے زخم اور خون کی منہل کمی نے اسے ایک آنچ بھی سر کھنے نہ دیا۔ وہ بے بس ہو گیا۔

اسے معیاد آیا کہ برافرٹ پر وہ ایک بار گپتا کو شدید زخمی حالت میں کندھوں پر اٹھا لیا تھا مگر آج اُس کی ٹانگ کا رشتہ ہی جسم سے ٹوٹ گیا تھا۔ گپتا کا خیال آتے ہی اُس کے جسم کا بچا کچھا خون اُبلنے لگا۔ اُس نے سوچا کہ وہ ایک کافر کو جان پر کھیل کر بچا لیا تھا مگر اپنی قوم کی بیٹی اس کے ہاتھوں میں مر رہی ہے۔ اُس نے ہاجرہ کے بے حس جسم کو بازوؤں پر اٹھا رکھا تھا۔ اُس نے بے بسی کے عالم میں ہاجرہ کے چہرے کو دیکھا۔ اُس کے دل سے ہوک اٹھی۔ اُس نے دیوانہ وار ہاجرہ کو سینے سے لگا لیا۔

”ہجو!“ — اُس نے جذبات سے لرزتی آواز میں کہا — ”مرنے کے لیے ہم فوجی ابھی زندہ تھے، تو یہاں کیوں چلی آتی تھی؟“ اُس کے سینے میں بجلی کوندی۔ اُس نے ہاجرہ کو بانٹوں میں مضبوطی سے سنبھالا اور جسم کی تمام تر قوت صرف کر کے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے گرج کر نعرہ لگایا۔ ”یا علی مشکل کشا“ — اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بے ہوش ہاجرہ اس کے بازوؤں پر تھی۔

اس نے قدم اٹھانے کی کوشش کی اور بولا — ”ہجو! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔“ لیکن اُس کے زخمی کولے والی ٹانگ ہتھ پھڑکانے لگی۔

جسم سے جیسے سارا خون نکل گیا تھا۔ اکبر علی کے سامنے ریلوے لائن کی چمکتی ہوئی دو لکیریں چکر میں گھومتی نظر آئیں پھر گرد و پیش کے درخت بھی اس چکر میں گھومنے لگے۔ اکبر علی کو آسمان کے تہے زمین پر گر تے نظر آتے۔ اُس نے محسوس کیا جیسے اُس کے گھٹنے ریلوے لائن کے پتھروں کو چھو رہے ہوں۔ اُس نے گھٹنوں کو ایک بار پھر اٹھانے کے لیے زور لگایا۔ ساتھی ہاجرہ کو بانٹوں میں اور مضبوطی سے سنبھال لیا مگر اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ دھڑام سے گر ا اور بے ہوش ہو گیا۔

اُس کا حوالدار گاڑی گزر جانے کے بعد اُس کے گھر گیا لیکن اُس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ بہت دیر دفر میں اس کا انتظار کرتا رہا لیکن رات گزرتی چلی گئی اور وہ نہ آیا۔ سحر کی تیرگی چھٹ رہی تھی جب دو دیہاتیوں نے تھانے میں اطلاع دی کہ ریلوے لائن کے قریب تین لاشیں پڑی ہیں۔

تھانے دار چند کانسٹیبلوں کو لیے وہاں گیا۔ وہ صرف اکبر علی کو پہچانتا تھا اور اُسے معلوم تھا کہ اکبر علی یہاں کیا کرنے آیا ہوگا لیکن اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ ریلوے لائن کے تینچے کہیں ڈائنامیٹ



ہاجرہ کو کوئی بلا تے تو بولتی تھی در نہ بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی تھی۔ گھر والوں نے اُسے بہت بڑا انعام دیا۔ وہ یہ کہ اُنہوں نے گھر میں ایک ادھیڑ عمر ملازمہ رکھ لی اور ہاجرہ کو کہا کہ وہ گھر کے کام کاج کی صرف دیکھ بھال کیا کرے۔ اُنہوں نے اُس کی حیثیت بھی اور تنخواہ بھی زیادہ کر دی۔

لیکن سب سے بڑا انعام اسے اقبال نے دیا۔ ایک روز اقبال نے اسے کمرے میں بلایا تو وہ اُس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے ہاجرہ کو اپنے پاس بٹھالیا۔

”ہاجرہ! اقبال نے کہا۔ تم نے مجھے کہا تھا کہ میری آنکھیں لے لو۔“  
”لے لو اقبال جی!“ اُس نے کہا۔ میں تو اب بھی کہتی ہوں معلوم نہیں تم کیوں میری آنکھیں نہیں لیتے؟“

”کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے ہاجرہ!“ اقبال کے آنسو نکل آتے اور وہ چپ ہو گیا۔ ہاجرہ سُن سی ہو گئی۔ اقبال نے بے تابانہ کہا۔ ”مجھے آنکھیں نہیں چاہئیں ہاجرہ! مجھے تمہارا سہارا چاہیے۔ عمر بھر کے لیے۔۔۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اندھے کا پیار قبول کرو گی ہاجرہ؟ مجبور نہیں کروں گا۔ تم میری روح کی آنکھیں ہو ہاجرہ!“

آہ، کس قدر بے بسی تھی اقبال کی التجائیں۔ ایک وہ وقت کہ اُس نے ہاجرہ کی آبرو کو دو روپے میں خریدنا چاہا تھا اور آج یہ گھڑی کہ اُس سے محبت اور سہارے کی بھیک مانگ رہا تھا۔ ہاجرہ نے بھی دنیا والوں سے پیار کی بھیک مانگی تھی۔ وہ جانتی تھی پیار کے پیاسوں کا کیا حال ہوتا ہے۔ اُس نے سوچا، کیا کوئی اچھی بھلی لڑکی اقبال کو قبول کرے گی؟ کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کو کسی اندھے سے بیاہ دے گی؟ اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے دوپٹے کا آٹھنچل اٹھا اور اقبال کے آنسو پونچھ ڈالے۔

اور پندرہ روز بعد وزیر آباد میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ چوہدری کرامت علی کے بیٹے نے اپنی نوکرانی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔

اگر یہ شادی عام حالات میں ہوتی تو لوگ سو سو باتیں بناتے لیکن سب جانتے تھے کہ اقبال کے ماں باپ نے اپنی نوکرانی کو کیوں کر ہو بنا لیا ہے۔

لیکن بارات کہاں سے جاتی؟ ڈولی کہاں سے اٹھتی؟ اس کمی کو اکبر علی نے محسوس کیا تھا۔ وہ ہسپتال سے فارغ ہو کر اکثر اقبال کے پاس جایا کرتا تھا۔ اُس کی ایک ٹانگ ریلوے کی گولی لگنے سے خاصی کمزور ہو گئی تھی۔ بالائی جوڑ پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ بگڑا کر چلتا تھا۔ اُسے جب پتہ چلا کہ اقبال ہاجرہ سے ساتھ شادی کر رہا ہے تو وہ بہت ہی خوش ہوا تھا۔

”لیکن ہاجرہ کی ڈولی تو کسی آنگن سے اٹھنی چاہیے۔“ اُس نے بیباختہ کہا تھا۔ ”اقبال میاں! تمہاری بارات تو کہیں جانی چاہیے۔“

اور وہ شادی سے دو روز پہلے ہاجرہ کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ اُس نے اپنی دونوں بیٹیوں کو

بلایا تھا جنہوں نے ہاجرہ کو بڑے پیار سے دُلسن بنایا تھا۔ اکبر علی نے اُسے جہیز بھی دیا تھا اور اقبال کی بارات آ کے ڈولی لے گئی تھی۔

اعلانِ تاشقند کے بعد اقبال کا ایک ساکھی لینٹینٹ اُسے دیکھنے وزیر آباد گیا۔ اقبال نے بے تاب ہو کر کہا کہ مجھے بی آر بی تک لے چلو لینٹینٹ کے پاس جیپ تھی۔ اقبال نے ہاجرہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ ہاجرہ بڑے پیار سے اقبال کا ہاتھ تھامے اُسے جیپ تک لے گئی۔

جیپ بیدیاں سیکڑ میں بی آر بی کے کنارے جا رکی۔ وہاں اب خاموشی تھی۔ بنگالیوں کے نعرے اور اُن کی لٹکار، اُن کے جذبے اور پاکستان کی آں پر سرٹنے کے عزم تاشقند کی مٹی میں دفن ہو چکے تھے۔ میدان میں جیتی ہوئی بازی میز پر ہار دی گئی تھی اور جنگ ستمبر ایک بے مقصد جنگ بنا دی گئی تھی۔ اقبال ہاجرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا تھا جیسے اُسے ابھی کسی بنگالی کی آواز سنانی دے گی۔ ”فکر نہیں شاب! دشمن آگے آنے نہیں سکے گا۔“ مگر وہاں خاموشی تھی۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔

”مجھے ذرا سہارے کے اوپر لے چلو ہاجرہ!“ اقبال نے کہا۔  
اقبال کا دوست لینٹینٹ جیپ میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ اُس نے میاں بیوی کو اکیلے چھوڑنا مناسب سمجھا تھا۔

ہاجرہ اقبال کا ہاتھ تھامے نہر کے کنارے کے اوپر چڑھ گئی۔ اقبال کو نہر کی روانی کا جلتہ رنگ سناتی دینے لگا۔

بی آر بی کمال تمکنت سے سہی جا رہی تھی۔ پرے ایک پل ٹوٹا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی پاک فوج کے فیلڈ انجینئرز کا بنایا ہوا لوہے کا عارضی پل تھا۔

”یہاں ہاجرہ!“ اقبال نے شگفتہ اور فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ”یہاں ہم نے دشمن کو روکا تھا۔۔۔ میں اس مٹی کی بوسونگھ رہا ہوں۔ یہی جگہ تھی۔ میں بنگال کے شیروں کے خون کی بوسونگھ رہا ہوں جو اُنہوں نے پنجاب کی مٹی پر بہایا تھا۔۔۔ بی آر بی بہہ رہی ہے نا؟“ اُس نے ہاجرہ کو کندھوں سے جھنجھوڑ کر پوچھا۔ ”بتاؤ نا ہاجرہ بی آر بی بہہ رہی ہے نا؟“

”ہاں اقبال جی!“ ہاجرہ بولی۔ ”نہر بہہ رہی ہے۔ تم دیکھ نہیں رہے؟“ لیکن ہاجرہ کے دل سے درد کی ٹیس اٹھتی جیسے کسی نے خنجر مار دیا ہو۔ اس نے بھولے سے کہہ دیا تھا ”تم دیکھ نہیں رہے؟“ وہ بھول گئی تھی کہ اقبال دیکھ نہیں سکتا۔ ہاجرہ کے آنسو نکل آتے۔ ”اقبال جی!“ اُس نے رندھی ہوئی التجا کی ”میری آنکھیں لے لو۔ ایک ہی آنکھ لے لو۔ ڈاکٹر کہتا ہے آنکھ نکالتے اور ڈالنے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ تم وہ محاذ تو دیکھ لو نا جو تم نے فتح کیا تھا۔“

”نہیں ہاجرہ!“ اقبال نے پیار سے کہا۔ ”تم ہاتھ تھام لیتی ہو تو سب کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ اس نہر کی روانی کو میں اچھی طرح سُن رہا ہوں۔ لگتا ہے جیسے اسے بہتا دیکھ بھی رہا ہوں۔“



ہوں.... ہجو! میری آنکھوں کی روشنی بجھ گئی ہے لیکن روح روشن ہوگئی ہے۔ روح کو روشنی اسی نہر کے کنارے ملی تھی۔ اس نہر میں پاکستانیوں کا خون ملا ہوا ہے ہجو! یہ نہر بہتی رہے گی۔ اس پر فاتحانہ رقت طاری ہوگئی۔ وجدانی کی کیفیت میں بولا۔ ”زمانے گزرتے رہیں گے ہجو! بی آبی بہتی رہے گی۔“  
اور اُس نے ہاجرہ کو کندھوں سے تھام کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

•••

یہ کتاب ماہنامہ ”حکایت“ کی پیشکش ہے

## آپ بھی ماہنامہ ”حکایت“ پڑھیں

حکایت کا ہر شمارہ مستقل اہمیت کی ایک کتاب ہوتا ہے۔

تازہ ترین ملکی و بین الاقوامی حالات و واقعات  
کا غیر جانبدارانہ تجزیہ اور بے لاگ تبصرہ

**مستقل سلسلہ**

تاریخی ناول • سنسنی خیز سلسلہ وار ناول • طب و صحت • نفسیات • علمی و ادبی اور  
تحقیقی مضامین • طنز و مزاح • دینی و روحانی مضامین • طالب علموں کی سرگرمیاں •  
اسلامیات • خواتین کے لیے • معاشرے کی نئی کہانیاں • دلوں کو گرمادینے والی  
داستانیں • آپ کے سر جھکا دینے والی شرمناک وارداتیں • چار دیواری کے ڈھکے چھپے  
گوشتوں سے ہمارے آپ کے، سب کے گناہوں قتلے • پاک بھارت جنگوں اور کشمیر میں  
مسلم جدوجہد کی داولہ انگیز کہانیاں

..... اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہیں!

قیمت فی شمارہ	سالانہ	اندون ملک	500/=
45/ روپے	چندہ	بیرونی ممالک	5000/=

ماہنامہ حکایت خود بھی پڑھیں دوستوں کو بھی پڑھائیں۔

موبائل نمبر: 0321-4616416

e.mail: waqas shahid17@yahoo.com

ماہنامہ ”حکایت“، 26۔ پیپال گراؤنڈ لنک میٹروڈ روڈ لاہور۔

فون: 7321898-7356541

اسکین بدست محمد طارق اقبال  
ون اردو ڈاٹ کام میبرز

